آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ

دُنیائے جوَان

(عصری مسائل پر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تفصیلی گفتگو)

دارالثقلین

دُنیائے جوان

(عصری مسائل پر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تفصیلی گفتگو)

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ

ترجمہ

سید سعید حیدر زیدی

یکے از مطبوعاتِ

دارالثقلین

پوسٹ بکس نمبر ۲۱۳۳-کراچی ۷۴۶۰۰-پاکستان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دار الثقلین
DARUSSAQLAIN
P.O. Box No. 2133,
Karachi-74600 Pakistan

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب: دنیائے جوان

تالیف: آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ

ترجمہ: سید سعید حیدر زیدی

ناشر دارالثقلین

طبع اوّل: ربیع الثانی ۱۴۲۱ھ، جولائی ۲۰۰۰ء

طبع دوّم: ربیع الثانی ۱۴۳۰ھ، جون ۲۰۰۹ء

قیمت: ۱۲۰ روپے

فہرست

عرضِ ناشر ۱۷
مقدمہ ۱۹

۱۔قرآن کی روشنی میں
۳۱۔۹۸

گفتگو تربیت کا ایک ذریعہ ۳۲
گفتگو کے ذریعے نصیحت ۳۳
عقل اور جذبات کا امتزاج ۳۳
نصیحت کا قرآنی اسلوب ۳۴
نصیحت بذریعہ نمونۂ عمل ۳۵
نصیحت لینے والا ۳۶
ابراہیمی تربیت ۳۷

الٰہی انسان ——— ۳۹
اسلام ایک تربیتی اسلوب ——— ۴۲
جذباتی احساسات اور نفس کے خلاف جنگ ——— ۴۳
باپ اور بیٹا ——— ۴۴
شخصیت میں رسالی اور انسانی پہلو کی آمیزش ——— ۴۵
انبیا کی اولادیں بھی دوسروں کی مانند ہوتی ہیں ——— ۴۶
گمراہ معاشرے کا اثر ——— ۴۷
رسالت سے خیانت ——— ۴۹
ماں کا اثر ——— ۵۰
صداقت، شبہوں کا ازالہ کرتی ہے ——— ۵۲
گمراہ کن ماحول اور اخلاقی مانع ——— ۵۴
پردۂ ایمانی ——— ۵۵
اخلاقی مانع ——— ۵۷
پیغمبرانہ روح ——— ۵۸
کیا عورت بھی ایسے کردار کی مالک ہو سکتی ہے؟ ——— ۵۹
عقدۂ حسد ——— ۶۱
عصرِ ائمہؑ میں ——— ۶۲
دعوت کے دوران ——— ۶۳
حسد کا کوئی فائدہ نہیں ——— ۶۳
حاسد کو ذرا سوچنا چاہیے ——— ۶۵
روحانی ضعف ——— ۶۷

دوستی کا مناسب ماحول ــــــــــ ۶۸
روابط میں جذبات وعواطف کا کردار ــــــــــ ۷۰
برے دوستوں سے پرہیز ــــــــــ ۷۱
ایک قرآنی مثال ــــــــــ ۷۲
دوست میدانِ حشر میں ــــــــــ ۷۴
دوستوں کے حقوق ــــــــــ ۷۵
نماز کی تاکید ــــــــــ ۷۶
داعیانِ دین کی ذمے داری ــــــــــ ۷۷
والدین سے حسنِ سلوک ــــــــــ ۷۸
والدین کی عظیم خدمات ــــــــــ ۸۰
والدین کے بالمقابل اولاد کی ذمے داریاں ــــــــــ ۸۲
محبت کا ہدایت میں بدلنا ــــــــــ ۸۳
والدین کی خوشنودی کی حدود ــــــــــ ۸۴
قول وفعل کی ہم آہنگی ــــــــــ ۸۵
گوشہ نشینی ــــــــــ ۸۶
عبادت کا وسیع مفہوم ــــــــــ ۸۷
ارادۂ الٰہی کی انجام دہی ــــــــــ ۸۸
عدالت کا قیام ــــــــــ ۸۹
قرآنی جوان ــــــــــ ۸۹
ضمیمۂ احادیث (۱) ــــــــــ ۹۱
خواہشاتِ نفس کے بارے میں ــــــــــ ۹۱

دوستی اور ہم نشینی کے بارے میں ۔۔۔۔۔۔ ۹۳

شرم وحیا کے بارے میں ۔۔۔۔۔۔ ۹۵

دوستی اور معاشرت کے بارے میں ۔۔۔۔۔۔ ۹۶

۲۔نقطۂ انقلاب (Turning Point)

۹۹۔۱۶۶

سعادت وشقاوت ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۰

یہ جبر نہیں ہے ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۱

وراثت اور انسانی ارادہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۲

ماحول تبدیل کرنے کے سلسلے میں انسان کی قدرت ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۳

ماحول کی طرف سے استضعاف ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۴

عذر رکھنے والے اور عذر نہ رکھنے والے ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۵

پوری جدوجہد کرنا ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۷

عقیدے میں تقلید ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۸

بلوغ اسلامی نقطۂ نگاہ سے ۔۔۔۔۔۔ ۱۰۹

بلوغ ایک طبیعی حالت ہے ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۱

اسلام اور بچوں کی نگہداشت ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۲

نوجوان اور انحرافی طرزِ عمل ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۳

نوجوانی اور ذمے داری ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۴

نصیحت اور رہنمائی ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۴

استمنا یا خودلذتی، مجرم کون ہے؟ ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۵

جلد شادی ۔۔۔۔۔۔ ۱۱۵

ازدواجِ موقت (متعہ)، اور جنسی مسئلے کو قبیح سمجھنا ——— ۱۱۷
جنسی تعلیم اور معاشرتی رجحانات ——— ۱۱۸
عشق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر ——— ۱۱۹
پاکیزہ محبت اور نفسانی محبت ——— ۱۲۲
نوجوانوں کو جنسی تعلیم کس طرح دی جائے؟ ——— ۱۲۳
اسلام اور جنسی تعلیم کی بنیاد رکھنا ——— ۱۲۴
جنسی تعلیم کی تنظیم کی ضرورت ——— ۱۲۶
گھر اور اسکول کی ذمے داری ——— ۱۲۸
جنسی ماحول ——— ۱۲۹
عیب کا مفہوم ——— ۱۲۹
جنسی مسائل بھی دوسرے علمی مسائل کی مانند ہیں ——— ۱۳۰
جنسی فلمیں ——— ۱۳۱
دو مختلف نسلیں ——— ۱۳۲
ہر زمانے کا ایک خاص اخلاق ہوتا ہے ——— ۱۳۴
جوان کی زندگی میں مطلوب توازن ——— ۱۳۵
حیات، مادّے اور روح کا مرکب ——— ۱۳۶
توازن کی سمت رہنمائی ——— ۱۳۷
لڑکیوں کی تربیت کی خصوصیات ——— ۱۳۸
احساسِ مظلومیت ——— ۱۳۹
کامیاب بیوی اور اچھی ماں ——— ۱۴۰
دُرشتی، مردانگی نہیں ہے ——— ۱۴۰

مغربی ممالک میں پناہ گزیں ہونا ۱۴۲
حرام ہجرت ۱۴۵
پناہ گزینی کے مسئلے کا جائزہ ۱۴۵
پولیس کی سرپرستی ۱۵۰
مشکل، بچوں اور بڑوں دونوں ہی کے لیے ہے ۱۵۱
جوان پناہ گزینوں کی دورُخی شخصیت ۱۵۲
بچے اور ماحول کا اثر ۱۵۳
ضمیمۂ احادیث (۲) ۱۵۵
والدین اور اولاد کے بارے میں ۱۵۵
تربیتِ نفس کے بارے میں ۱۶۳

۳۔ تربیت کی ذمے داری

۱۶۷۔۲۰۴

معلم و مربی کی خصوصیات ۱۶۸
مختلف طریقے اپنانا ۱۷۰
طلبا کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا ۱۷۱
حوزۂ علمیہ (دینی مدرسے) اور یونیورسٹی کی تعلیم کا موازنہ ۱۷۳
گھر اور اسکول کے درمیان تعاون ۱۷۴
نوجوان کی تربیت میں گھر اور اسکول کا کردار ۱۷۵
سزا اور جزا ۱۷۶
شریعت کا مؤقف ۱۷۸
تربیت، رغبت اور خوف کا آمیزہ ۱۷۹

قرآن نے دونوں طریقوں سے کام لیا ہے ـــــــ ۱۸۰
زدوکوب کرنا چاہیے یا نہیں؟ ـــــــ ۱۸۱
مخلوط تعلیم کے خطرات ـــــــ ۱۸۲
خواتین کا مختلف میدانوں میں کام کرنا ـــــــ ۱۸۴
والدین کی جانب سے بچوں کے طرزِ عمل کی نگرانی ـــــــ ۱۸۴
بچوں سے عادلانہ سلوک ـــــــ ۱۸۵
معصومؑ کا عمل اس عمل کے جواز کی علامت ہے، وجوب کی نہیں ـــــــ ۱۸۶
تأسی کے معنی پیروی ہے، ہو بہو نقل نہیں ـــــــ ۱۸۷
مغربی تمدن سے مرعوب ہو جانا ـــــــ ۱۸۸
تقلید اور نقالی ـــــــ ۱۹۰
فنکاروں کی تقلید ـــــــ ۱۹۱
اسوۂ حسنہ ـــــــ ۱۹۱
تاثیر قبول کرنے اور فریفتہ ہو جانے کی بنیادیں ـــــــ ۱۹۳
تقلید کے خلاف فکری یلغار ـــــــ ۱۹۵
ضمیمۂ احادیث (۳) ـــــــ ۱۹۸
تعلیم و تربیت کے بارے میں ـــــــ ۱۹۸
سعادت و نیک بختی کے بارے میں ـــــــ ۲۰۱
سماعت کے بارے میں ـــــــ ۲۰۲

۴۔ جوان اور سیاسی و تنظیمی سرگرمیاں

۲۰۵۔۲۳۰

سیاست کے بارے میں منفی مؤقف ـــــــ ۲۰۶

دین کا راستہ عدل کا راستہ ہے ——— ۲۰۸
سیاست اور عدالت کا تعلق دین ہے ——— ۲۱۱
سیاست اور اخلاق ——— ۲۱۲
سیاست اور شریعت ——— ۲۱۳
جوان اور سیاسی وابستگی ——— ۲۱۴
خوف کی وجہ سے شمولیت ——— ۲۱۶
دین و سیاست کی جدائی ——— ۲۱۶
خواتین اور سیاسی سرگرمیاں ——— ۲۱۷
عورت کا سربراہِ حکومت ہونا ——— ۲۱۸
ٹریڈ یونین سرگرمیاں اور معاشرے کے طبقاتی ہونے کا مسئلہ ——— ۲۱۹
تفاوت ہے انتشار نہیں ——— ۲۲۰
مسلمان طلبا کی عالمی تحریک کی طرف ——— ۲۲۲
خود تحریک میں ڈوب کے رہ جانا ——— ۲۲۳
ایک تجویز: تدریجاً قیادت کی منتقلی ——— ۲۲۵
ضمیمۂ احادیث (۴) ——— ۲۲۷
تجربے کے بارے میں ——— ۲۲۷
جماعت کے بارے میں ——— ۲۲۸
سیاست کے بارے میں ——— ۲۲۸

۵۔ شرعی نقطۂ نظر

۲۳۱۔۳۰۴

کھیل کود اور تفریح کی حقیقی مقدار ——— ۲۳۲

کھیل کود، جوانوں کی پسندیدہ سرگرمی ——— ۲۳۴
کھیل کود کی سرگرمیاں ——— ۲۳۵
گھڑ دوڑ دیکھنا ——— ۲۳۷
جدید فیشن ——— ۲۳۸
خواتین کا پردہ ——— ۲۴۰
فیشن کے مطابق پردہ ——— ۲۴۰
لباسِ شہرت ——— ۲۴۱
اسلامی پردے کی خصوصیات ——— ۲۴۲
معاشرتی حجاب ——— ۲۴۴
زنا کار کی ذہنیت ——— ۲۴۵
حجابِ ذہنی ——— ۲۴۶
حجاب کا اپنے معنی کھو دینا ——— ۲۴۶
حجاب مغرب کی نگاہ میں ——— ۲۴۷
حجاب، قاعدۂ عفت (پاک دامنی) کی اساس پر ——— ۲۴۹
حجاب اور فطری خواہش کو کچل دینا ——— ۲۵۰
ظاہر ہونے والی زینت ——— ۲۵۱
عورت پر حرام نگاہ ——— ۲۵۲
خائن نگاہیں ——— ۲۵۳
مشکوک اور قصدِ لذت سے نگاہ ڈالنا ممنوع ہے ——— ۲۵۴
نظروں کا جھکا لینا، گمراہی کے خلاف ڈھال ——— ۲۵۶
نگاہ کے جواز کی شرعی حد ——— ۲۵۷

پردے کا احترام نظر کے احترام کا تقاضا ہے ——— ۲۵۸
عورت کی تصویر دیکھنا ——— ۲۵۸
طبی وجوہات کی بنا پر نگاہ ڈالنا ——— ۲۵۹
لڑکی کی ولایت کا مسئلہ ——— ۲۶۰
کنواری لڑکی کے بارے میں احتیاط کی وجہ ——— ۲۶۱
کیا لڑکی اپنے معاملات میں خود مختار ہے؟ ——— ۲۶۲
لڑکی کا سنِ شعور (رشد) ——— ۲۶۳
امر بالمعروف ولایت نہیں ہے ——— ۲۶۳
عرف اور شرع کا اختلاف ——— ۲۶۴
ازدواجِ موقت (متعہ) کے بارے میں عرف کا موقف ——— ۲۶۵
متعہ گمراہی کے خلاف ایک ڈھال ——— ۲۶۶
تعددِ ازدواج ——— ۲۶۷
جلدی شادی مستحب ہے ——— ۲۶۸
تمباکو نوشی کا حرام ہونا ——— ۲۶۹
فلم اور ٹیلی ویژن ——— ۲۷۱
داڑھی صاف کرنا ——— ۲۷۱
جنسِ مخالف سے مصافحہ ——— ۲۷۳
اہلِ کتاب کی طہارت ——— ۲۷۴
موسیقی اور اس کا حلال یا حرام ہونا ——— ۲۷۵
مضمون یا لحن ——— ۲۷۷
حلال کاموں میں آلاتِ لہو کا استعمال ——— ۲۷۷

آلیہ موسیقی کے آلات ———— ۲۷۸

عرفانی اشعار گانا ———— ۲۷۸

کلاسیکی موسیقی ———— ۲۷۸

اپنے شوہر کے لیے گیت گانا ———— ۲۷۹

شادی کی تقریبات میں گیت گانا ———— ۲۷۹

مردوں کی محفل میں عورت کا شعر پڑھنا ———— ۲۸۰

جذبات بھڑکنے کا مسئلہ ———— ۲۸۰

شطرنج اور اُس کا شرعی حکم ———— ۲۸۱

شطرنج کے حلال ہونے کا قول ———— ۲۸۳

دست شناسی اور قسمت کا حال ———— ۲۸۴

اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے والی پیش گوئیاں ———— ۲۸۵

جادو ایک وہمی اور خیالی حالت ہے ———— ۲۸۷

تفریح کے وسائل اور ان کے نعم البدل ———— ۲۸۷

تفریح کے مثبت ذرائع کی تلاش ———— ۲۸۸

ارتکابِ حرام کی حوصلہ افزائی کا امکان ———— ۲۹۰

عرف سازی ———— ۲۹۲

حسد اور نظرِ بد ———— ۲۹۴

ضمیمۂ احادیث (۵) ———— ۲۹۶

حجاب و پوشش کے بارے میں ———— ۲۹۶

نگاہ کے بارے میں ———— ۲۹۷

زیب و زینت کے بارے میں ———— ۲۹۹

گانے بجانے کے بارے میں ——— ۳۰۰
جادو کے بارے میں ——— ۳۰۲
مستی اور نشے کے بارے میں ——— ۳۰۲

۶۔ علامہ فضل اللہ کے تجربات

۳۰۵۔۳۱۶

ایامِ شباب ——— ۳۰۶
اسلامی انسان ——— ۳۰۷
سب انسانوں سے محبت ——— ۳۰۹
آپ نے اپنے بچوں کی تربیت کس انداز سے کی ہے؟ ——— ۳۱۰
آپ کے بچپنے کی طرف پلٹتے ہیں ——— ۳۱۱
ہمارے تجربات سے استفادے کی کوشش کیجیے ——— ۳۱۳
اسلام آپ کے پاس ایک امانت ہے ——— ۳۱۴
آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ دام ظلہ سے جوانوں کے چند منتخب استفتاءات ——— ۳۱۷
حضرت آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ دام ظلہٗ حیات اور خدمات کی ایک جھلک ۳۲۷

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عرضِ ناشر

نوجوانی کو اگر انسان کے دوسرے جنم سے تشبیہ دی جائے تو شاید غلط نہ ہو۔ انسان جس طرح اپنی پیدائش کے وقت ایک نئی دنیا میں آنکھ کھولتا ہے، ایک قسم کی نئی جسمانی اور ذہنی نشوونما پاتا ہے، ایک نئے ماحول میں قدم رکھتا ہے اور اپنے گردوپیش کے ماحول اور افراد سے روشناس ہوتا ہے۔ اسی طرح جوانی کے مرحلے میں قدم رکھنے والا انسان بھی ایک بالکل نئی دنیا کے روبرو ہوتا ہے۔ اس میں نئی جسمانی اور ذہنی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں، اس کے دوست احباب کا حلقہ بڑھتا ہے اور یوں ایک نئے ماحول میں داخل ہو کر لوگوں سے ربط و تعلق استوار کرتا ہے۔ اپنے اندر نئی خواہشات اور تقاضوں کو محسوس کرتا ہے اور ان کی تسکین کا طالب ہوتا ہے۔ اس موقع پر اسے ایک پرخلوص دوست اور رہنما کی ضرورت ہوتی ہے، ایک ایسے مربی کی ضرورت ہوتی ہے جو اسکی خواہشات اور تقاضوں کو مثبت اور صحت مند سمت دے اور جائز راستوں سے ان کی تسکین کا دروازہ کھولے، اس کی فکری اور عقیدتی بنیادوں کو مضبوط کرے، اور ان بنیادوں پر اس کی شخصیت کی تعمیر کرے۔

کتاب ہذا ''دنیائے جوان'' اسی مذکورہ مقصد کے پیشِ نظر تحریر کی گئی ہے اور اس کے ترجمے کا مقصد بھی یہی ہے۔ بظاہر تو اس کتاب کے مخاطب نوجوان ہیں لیکن تربیت کے اسلوب اور طریقوں پر گفتگو کے دوران والدین' سرپرستوں اور اساتذہ کو بھی مفید ہدایات دی گئیں ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ بعض ایسے جدید مسائل پر بھی گفتگو کی گئی ہے جو صرف نوجوانوں ہی سے مخصوص نہیں بلکہ ہر عمر کے افراد کو پیش آسکتے ہیں۔

''دنیائے جوان'' کو عربی سے فارسی کے قالب میں جناب مجید مرادی رودپشتی نے ڈھالا' اور یہ قم میں قائم اسلام کی انقلابی تعلیمات کے ترجمان ممتاز ادارے ''دفترِ تبلیغاتِ اسلامی'' سے شائع ہونے والے خواتین کے ایک وقیع ماہنامے ''پیامِ زن'' میں قسط وار شائع ہوتی رہی ہے' ہم نے اردو ترجمے کے لیے اسی فارسی ترجمے سے استفادہ کیا ہے۔ فارسی کے علاوہ اس کتاب کے ترکی اور انگریزی تراجم کے بھی کئی کئی ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔ امید ہے اردو ترجمے کو بھی ایسی ہی پذیرائی ملے گی۔

ہم ان تمام مومنین کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہوں نے کتاب کی طباعت کے مختلف مراحل میں ہماری مدد واعانت فرمائی۔ خدا ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ صرف رسماً ہی نہیں بلکہ قلباً ہم قارئین سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ کتاب سے متعلق اپنی آراء' تجاویز اور قیمتی مشوروں سے ضرور آگاہ فرمائیں' تاکہ اس کتاب کے آئندہ ایڈیشن اور ادارے کے زیرِ اہتمام شائع ہونے والی دوسری کتابوں میں بھی ہم ان سے استفادہ کرسکیں۔

☆☆☆☆☆

مقدمہ

رسولِ کریم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی خوبصورت اور دل نشین ہدایت ہے: ''میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ جوانوں کے ساتھ نیکی سے پیش آنا' کیونکہ ان کے دل نرم ہوتے ہیں۔''

سچ بتایئے' کتنے والدین اور اساتذہ آنحضرتؐ کے اس کلام کی جانب متوجہ ہیں۔ اور اگر کچھ لوگ عملاً اس کی جانب متوجہ ہوتے بھی ہیں تو نوجوانوں کے ساتھ اپنے طرزِ عمل میں اس کا کتنا کامیاب مظاہرہ کر سکے ہیں۔

نفسیات دانوں اور تربیت اور معاشرتی علوم کے ماہرین نے جوانوں کے بارے میں مختلف نظریات کا اظہار کیا ہے۔

نفسیات دان' جوانی کو طویل نفسانی بحران اور مختلف تقاضوں اور ان کے جوابات کے درمیان شدید کشمکش کا مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ اور اس تصور کے ساتھ جوان کا سامنا کرتے ہیں کہ وہ اضطراب' بے چینی' پریشانی' غصے (اور اسی طرح کی دوسری کیفیات جواُن کی لغت

میں عدم توازن کے عنوان کے تحت آتی ہیں) کی حالت میں زندگی بسر کرتا ہے۔

تربیتی علوم کے ماہرین کا خیال ہے کہ اس دور کا یہ بحران (بالفرض اگر اس دور میں کسی بحران کے وجود کو قبول کیا جائے) شخصیت کی بنیاد پڑنے اور اسکی نشو ونما کے سلسلے کا بحران ہے اور بنیادی طور پر تربیت کے مراکز اس سے نمٹنے کے ذمے دار ہیں' اور انہیں چاہیے کہ جوان کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل کے اس مرحلے میں اپنا کردار خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کریں۔

معاشرتی علوم کے ماہرین بھی جوان کو اسی پہلو سے دیکھتے ہیں کہ گویا وہ توافق' تغیر اور طرزِ عمل کے بحران کا شکار ہے۔

کیا سچ مچ ''جوانی'' بحران ہے؟

ہم اس خیال سے متفق نہیں۔

اگر ہم بحران اور مشکل کے وجود کو مانتے بھی ہیں تو اسے کہیں اور تلاش کرنا چاہیے' جوانوں میں نہیں۔ کیونکہ جوان تو نرم دل' نیک ضمیر' خوش قلب اور اپنے گرد و پیش کی دنیا سے مفاہمت اور تبادلۂ خیال کے لیے تیار رہتا ہے۔ یوں' مشکل جوانوں کی طرف سے نہیں ہے' بلکہ جوانوں کے حوالے سے ہمارے خیالات اور ان سے ہمارا طرزِ عمل مشکل پیدا کرتا ہے۔

جی ہاں! جوان (خواہ وہ لڑکے ہوں یا لڑکیاں) بنیادی طور پر باغی اور سرکش نہیں ہوتے اور بے چینی اور بے قراری ان کی سرشت کا حصہ نہیں ہوتی۔ بلکہ یہ معاشرہ اور ان کے گرد و پیش کا ماحول (گھر' اسکول یا تربیت کے مراکز) ہے جو بسا اوقات جوان کی لطیف اور نرم و نازک طبع کی رہنمائی کے عمل سے ناواقفیت کی وجہ سے ان کی لطافت اور نرمی کو ''درشتی'' اور تشدد پسندی میں بدل دیتا ہے۔ یہ گروہ جوان کو (جو اپنے بچپنے کی سرحد عبور کر کے شعور اور ترقی کے مرحلے میں قدم رکھ چکا ہوتا ہے) غلط طور پر اس کم سن بچے کی مانند سمجھتا ہے جس

نے ابھی طفولیت کے دائرے سے قدم باہر رکھا ہو۔شاید اس گروہ کے اسی غیر حقیقی طرزِ فکر کی عکاسی اس شعر میں کی گئی ہے۔

لم تزل (لیلیٰ) بعینی طفلة

لم تزد عن امسی الا اصبعا

''میری نظر میں لیلیٰ ابھی تک ایک چھوٹی بچی ہے' جو (کل سے) ایک انگشت برابر بھی نہیں بڑھی ہے۔''

جو لوگ جوانوں کو اس نظر سے دیکھتے ہیں' اُن سے یہی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ جوانوں پر دباؤ ڈالیں گے' اُن کے سامنے رکاوٹوں میں اضافہ کریں گے اور شریعت کی طرف سے نہیں بلکہ معاشرے کی طرف سے حرام قرار دی ہوئی چیزوں کی تلوار اُن کے سروں پر لٹکائے رکھیں گے۔ مثال کے طور پر ہم والدین' مدرسین' معلمین اور مصلحین سے کہتے ہیں کہ وہ اخبارات اور جرائد کے ان صفحات کا مطالعہ کریں جو آپ کے مسائل اور ان کے حل' نفسیاتی و ازدواجی الجھنیں' مشورہ حاضر ہے وغیرہ وغیرہ کے عنوان سے شائع ہوتے ہیں۔ اس مطالعے کے ذریعے انہیں پتا چلے گا کہ نوجوانوں کے مسائل کا غلط ادراک اور مسئلے سے غلط انداز سے نمٹنا ایک بڑی مشکل ہے۔

نوجوانوں کے مسائل کے غلط ادراک اور ان کے معاملات سے غلط انداز سے نمٹنے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نوجوان (لڑکے اور لڑکیاں) اپنی مشکلات اور مسائل کے حل کے سلسلے میں اپنے اردگرد موجود افراد سے رجوع کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں' یہ لوگ عام طور پر ان کے دوست یا سہیلیاں ہوتی ہیں۔ اور یوں وہ ناقص تجربات اور فلموں اور افسانوں کے ذریعے پیش کیے جانے والے اور اخبارات و جرائد میں شائع ہونے والے غیر اسلامی اصولوں پر استوار خیالی حلوں کے ذریعے اپنی مشکلات اور مسائل کے علاج کی کوشش کرتے ہیں۔

ممکن ہے اِس صورتحال کے نتیجے میں جوان (لڑکا یا لڑکی) اپنے گرد وپیش کے اس گھٹن زدہ ماحول سے متنفر ہو جائے جو اسے صحیح طور پر نہیں پہچانتا اور اس کے مسائل سے درست طریقے سے نہیں نمٹتا' اور احتجاجاً اس سے اپنا رابطہ منقطع کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لے اور معاشرے سے اپنا رشتہ توڑ کر اسکی طرف کھلنے والا دروازہ بند کر لے اور اس دروازے کی دوسری طرف اپنے نفسانی' جنسی اور ذہنی خیالات میں غرق ہو کر ایک نئی دنیا بسا لے۔ ایسی صورت میں وہ کبھی کبھی ایسی سمت نکل جاتا ہے جہاں اس کے خیال میں اسے بہتر طور پر پہچانا جاتا ہے اور جس کی فضا اس سے موافق اور ہم آہنگ ہے۔ اور کبھی کبھی سادہ ترین ردِعمل کے طور پر تمام لوگوں سے عداوت' بے زاری اور ان کے بائیکاٹ کے ذریعے اپنے غم و غصے کا اظہار کرتا ہے۔

ہم نوجوانوں کو یہ منفی مؤقف اپنانے پر آخر کیوں مجبور کر دیتے ہیں؟

کیا یہ مناسب نہیں کہ ہم کھلے دل اور خنداں پیشانی کے ساتھ اُن سے ملیں اور دلنشیں لہجے اور دانائی کے ساتھ ان سے گفتگو کریں اور ان کے لیے قابلِ فہم زبان میں اُن سے کہیں کہ ہم آپ کے دوست ہیں' آپ کی بھلائی کے متمنی ہیں، ہمیں آپ کا غلطیوں اور خطاؤں میں مبتلا رہنا پسند نہیں ہے' آپ کو چاہیے کہ اپنے زمانے کے بارے میں صحیح معلومات حاصل کرنے کے بعد اس میں قدم رکھیں۔

ایسا شخص جو کسی نئے راستے پر قدم رکھنا چاہتا ہو' اس کے لیے بہتر ہوتا ہے کہ وہ اسکے بارے میں تجربہ کار اور علم رکھنے والے لوگوں سے معلومات حاصل کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرے گا تو گمراہ' پریشان اور اپنی منزل اور راستے سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ ہم آپ پر کوئی چیز ٹھونسنا اور مسلط کرنا نہیں چاہتے۔ ہماری خیر خواہانہ نصیحتوں اور ہدایات پر اچھی طرح غور و فکر کیجیے۔ ہم آپ کے اردگرد موجود تمام دوسرے لوگوں سے زیادہ آپ کے ہمدرد ہیں' آپ کی کامیابی ہماری کامرانی اور آپ کی ناکامی ہماری نامرادی ہے' آیئے ایک دوسرے

کے ساتھ دوستانہ طرزِ عمل اختیار کریں۔

یہاں تفاہم کا سبب بننے والا مطلوب اور مناسب نکتہ یہی ہے کہ آیئے ایک دوسرے کے قریب آئیں، ایک دوسرے کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

نسلِ جوان کی تربیت کی غزل کا شاہ بیت یہی نکتہ ہے، جو ہمیں حکمت اور موعظۂ حسنہ کے ذریعے مشکلات کے صاف اور شفاف حل کا راستہ دکھاتا ہے اور اس مشکل کو درشتی، سختی اور تحکّمانہ انداز سے حل کرنے سے منع کرتا ہے۔

ایک دوسرے کو سمجھنا اور سمجھانا، وہ دو موضوعات ہیں جن پر نسلِ جوان کی ہدایت اور رہنمائی کے سلسلے میں بحث و گفتگو ہونی چاہیے۔

کیا ہمارے گھرانوں میں اس دوستانہ اور مخلصانہ طریقے پر عمل کیا جاتا ہے؟

اگر ایسا ہے تو پھر ہم اور ہمارے بچے ایک کامیاب اور کامران زندگی بسر کریں گے۔

ہمارے مدارس اور تعلیم و تربیت کے اداروں میں جوانوں کی امیدوں، آرزوؤں، اعتماد، زندگی اور ان کے اعتقادات کا سامنا کس انداز سے کیا جاتا ہے؟

اگر ان میدانوں میں ان اداروں نے درست طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا ہے، تو پس، ہم نے اپنی گرانقدر امانتوں کو قابلِ اعتماد اور پاکیزہ ہاتھوں کے سپرد کیا ہے۔

ہم نہیں چاہتے کہ ہمارے جوان بے پروا، لا ابالی، کم ہمت، گمراہ اور تباہ شدہ ہوں۔

ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے معاشرے سے تعلق رکھنے والے جوان ذمے دار اور اپنے زمانے سے آگاہ و آشنا ہوں، تعمیر و ترقی کی جد و جہد میں مصروف ہوں، بلند مقاصد اور تمناؤں کے حامل ہوں اور دوسروں کی اندھی تقلید سے گریزاں اور معاشرے سے بگاڑ کی جڑیں کاٹنے کے لیے کوشاں ہوں۔ تاکہ عظیم مرتبے اور سربلندی کے مقام پر فائز ہوں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ عزت و توقیر انہیں اسلام کی زیادہ سے زیادہ معرفت کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتی، اسلام جو دونوں جہانوں کی کامیابی کا ذریعہ ہونے کے ساتھ ساتھ معاشرتی گتھیوں کو

سلجھانے اور انسانوں کے سامنے روشن افق کھولنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہے۔

اسلام کے نقطۂ نظر سے، جوانی' زندگی کے مختلف مراحل کا درمیانی مرحلہ ہے۔ جوانی درحقیقت آگہی' ادراک اور شعور کا دور ہے۔ اگر جوان (لڑکے اور لڑکیاں) ذمے داری کا بوجھ اٹھانے کے قابل نہ ہوتے' تو یہ ممکن نہ تھا کہ خداوندِ عالم شرعی فرائض کی ذمے داری ان پر ڈالتا جس کا لازمہ تعقل' فرمانبرداری اور جزاو پاداش ہے۔

اس سے بڑی ذمے داری اور کیا ہوتی کہ جوان زمین پر خدا کا خلیفہ ہو اور دوسرے مکلفین کی مانند اپنے شرعی فرائض کی ادائیگی کا پابند ہو' اور خود کو انہی کی طرح خدا کے سامنے جوابدہ سمجھے۔ کیونکہ روزِ قیامت تمام لوگ مساوی طور پر خدا کے سامنے جوابدہ ہوں گے' اور لوگوں کی جوانی اور پیری کو دیکھ کر فیصلہ نہیں کیا جائے گا' بلکہ اِن سے سلوک کی بنیاد یہ ہوگی کہ سب یکساں طور پر مکلّف تھے۔

افسوس کہ ہم اپنے یہاں تربیت کے میدان میں ایک تلخ حقیقت کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ وہ افسوسناک حقیقت یہ ہے کہ ہم میں سے بعض لوگ بچے کو اس کی زندگی کے پہلے سات برس اس کے حال پر چھوڑ دیتے ہیں' دوسرے سات برس میں بھی اسی حال میں رہنے دیتے ہیں اور تیسرے سات برس میں بھی اسے کھلا چھوڑے رکھتے ہیں۔ جبکہ ہمیں چاہیے کہ اس کی زندگی کو مختلف مراحل میں تقسیم کریں اور ہر مرحلے کے تقاضوں کے مطابق عمل کریں۔ یعنی دوسرے سات برس میں اسے ادب تمیز سکھائیں اور تیسرے سات برس میں اسکے ساتھ دوست اور ہم نشیں کا سا طرزِ عمل اختیار کریں۔

اسی طرح ہم یہ بھی بھلا بیٹھتے ہیں' یا اس بات کی طرف سے بھی غافل ہوتے ہیں کہ جوانی اور شباب سے قبل کا مرحلہ دراصل جوانی کے مرحلے کی تمہید اور اس میں قدم رکھنے کو آسان بنانے کا مرحلہ ہے' تاکہ انسان نہایت سکون اور بغیر کسی پیچیدگی کے اس مرحلے میں قدم رکھ سکے۔ کیونکہ کسی کے اس دنیا میں آنکھوں پر پٹی باندھے ہوئے داخل ہو

کر یہاں کی ہر چیز کو حیرت و استعجاب کی نظروں سے دیکھنے اور خود کو ایک مشکل اور دشوار وادی میں پانے اور کسی کے رفتہ رفتہ اس نئی دنیا کی اشیا سے واقف ہونے کے بعد اور یہاں کی مشکلات سے نبرد آزما ہونے کی تیاری کے ساتھ اس میں داخل ہونے کے درمیان بہت فرق ہے۔

اسی طرح خود کو کسی آب و ہوا کا عادی بنانے کے بعد وہاں جانے اور بغیر کسی تیاری کے یک بیک ایک مختلف آب و ہوا کی حامل سرزمین پر قدم رکھنے کے درمیان بھی بہت فرق ہے۔

بچپنے کا مرحلہ اسکولوں میں قائم مونٹیسوری اور نرسری کے مراحل کی مانند ہے۔ اسلامی شریعت میں بھی تمیز (اچھے برے کی تمیز رکھنے والے) بچے کی عبادت کو فرض اور واجب کے عنوان سے قبول نہیں کیا جاتا (کیونکہ وہ ابھی مکلّف نہیں ہوا ہے) بلکہ اسکی عبادت مستحب اور عبادت کا عادی بنانے کے عنوان سے مقبول ہے۔

ایک اور پہلو جسے ہمیں ملحوظ رکھنا چاہیئے وہ یہ ہے کہ جوان لڑکے کی تربیت کی مشکلات اور مسائل علیحدہ ہوتے ہیں اور جوان لڑکی کی تربیت کی مشکلات اور مسائل کچھ اور۔ افسوس کہ بہت سے مذہبی اور متدین گھرانوں میں بھی اس نازک اور لطیف موجود (لڑکی) کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور اسی بنیاد پر اس سے سلوک کیا جاتا ہے۔ اسی طرح لڑکیوں پر لڑکوں کو ترجیح دینا، حتیٰ لغزشیں اور خطائیں سرزد ہونے کی صورت میں بھی ردِعمل کے اظہار میں لڑکیوں سے امتیازی سلوک برتنا، گزشتہ زمانے کی مانند اب بھی ان گھرانوں تک میں معمول ہے جو جدید مادّی آسائشوں اور سہولتوں سے تو بہرہ مند ہیں لیکن لڑکوں اور لڑکیوں کے مابین عادلانہ سلوک سے بے بہرہ۔

مذکورہ مسائل اور ان کے علاوہ دوسری مشکلات کو سامنے رکھتے ہوئے ہم نے حضرت آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ کی خدمت میں ایک ایسی نشست کے انعقاد کی

تجویز پیش کی جس میں نوجوانوں کی مشکلات اور مسائل کا جامع انداز میں گہرائی کے ساتھ جائزہ لیا جائے۔

ہمارے اس اقدام کی وجہ یہ نہیں تھی کہ اس حساس اور اہم موضوع پر کسی مسلم مصنف نے تحریر نہیں کیا ہے' لیکن ہمارا خیال (جہاں تک ہماری اطلاع ہے) یہ ہے کہ اس وقت تک اس بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں اس قدر صراحت اور جرأت نہیں پائی جاتی جو موصوف کے کلام میں موجزن ہے۔ البتہ ہم اس بات کو بھی اچھی طرح جانتے ہیں کہ صاف گوئی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے اور جرأت کی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔

لیکن کیا حقیقت کو یوں ہی پوشیدہ رہنے دیا جائے' گوہر یوں ہی صدف میں بند رہے' آخر کب تک؟

ہمارا خیال ہے کہ حقیقت کو چھپانا' اسے مسخ کرنا یا اسے کھیل بنا لینا (خواہ ایسا کم ہو' خواہ زیادہ) ایک جرم ہے۔ ایسے لوگ جو حقیقت کے آزادانہ اظہار سے خوف کھاتے ہیں وہ نسلِ جوان کو مضبوط بنیادوں پر محکم قدموں کے ساتھ کھڑے ہونے کی نعمت سے محروم رکھتے ہیں' جوان کے لیے ایک وسیع افق میں داخلہ ممکن بناتی ہے۔ اسلام کبھی بھی ان وسیع آفاق پر کھلنے والی راہیں بند نہیں کرتا' بلکہ اس کا گناہ ان لوگوں کی گردنوں پر ہے جنہوں نے مختلف بہانوں سے ان آفاق پر کھلنے والی راہوں کو بند کر دیا ہے۔

بہرصورت آج ہمیں کچھ ایسے علما میں یہ شجاعت نظر آ رہی ہے جنہوں نے اس مرحلے کی اہمیت کو سمجھ لیا ہے اور وہ لوگوں کو اپنے علم و دانش سے فیضیاب کرنے پر کمر بستہ ہیں۔

ہم آیت اللہ فضل اللہ کے ہمراہ ایک ایسی حقیقت کے روبرو کھڑے ہیں جو ایک طویل عرصے سے ہماری نظروں سے اوجھل ہونے کے باوجود اب بھی اپنی تمام تر اصالت' حرارت' صداقت اور عظمت کے ہمراہ معاشرتی حقائق کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہے۔

ہم نے (زیرِ نظر کتاب میں) جوان اور جوانی کے موضوع سے اپنی گفتگو کا آغاز

ہے، جوانوں کے بارے میں رسولِ کریمؐ کی ہدایت، نصیحت اور ان قرآنی آیات سے سبق لیا ہے جن میں جوانوں سے باپ کے مقام و مرتبے، بیٹے کی حیثیت، رسالت کی ذمے داری اور دوستی و ہم نشینی وغیرہ جیسے موضوعات پر گفتگو کی ہے۔

اس کے بعد جوانی اور بلوغ کے مرحلے کی خصوصیات و امتیازات اور اس سے متعلق دوسرے مسائل پر گہرائی اور تفصیل کے ساتھ گفتگو کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ اس مقام پر ایسے مسائل بھی زیرِ بحث لائے گئے ہیں جن پر شرم و حیا کے پردے میں اور انتہائی نجی محفلوں میں بھی سرگوشیوں میں گفتگو کی جاتی ہے۔

ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ نوجوانوں کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں کی تعمیر اور نشو و نما تمام افرادِ معاشرہ کی مشترکہ ذمے داری ہے، اور اس ذمے داری کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی سرگرمیوں اور کوششوں کو اس مقصد کے لیے ہم آہنگ کریں۔

ہم نے اس گفتگو میں نوجوانوں کی تربیت سے تعلق رکھنے والے بنیادی اور اہم مسائل کا جائزہ لیا ہے۔ ایک مسلمان معلم و مربی کے کردار سے گفتگو شروع کرتے ہوئے تقلید، خود باختگی، جزا و سزا، مغربی زندگی اور جنسی تعلیم و تربیت کے موضوعات تک گفتگو کا دامن وسیع کیا ہے۔

اس کے ساتھ ہی ہم نوجوانوں کی سیاسی اور سماجی سرگرمیوں کے موضوع سے بھی غافل نہیں رہے اور ایک نشست میں ہم نے آیت اللہ فضل اللہ سے سیاسی، سماجی اور طلبا کے مسائل کے بارے میں بھی دریافت کیا۔

ہم سمجھتے تھے کہ مختلف پہلوؤں پر مشتمل ہماری وسیع گفتگو اس وقت تک ناقص رہے گی جب تک فقہی مسائل، بالخصوص نوجوانوں سے تعلق رکھنے والے شرعی مسائل کے ذریعے اسے مکمل نہ کرلیں، تاکہ ان بہت سے مسائل اور مشکلات کے شافی جواب سامنے لائے جاسکیں جن پر بہت زیادہ نزاع پایا جاتا ہے۔

ہم نے آیت اللہ فضل اللہ سے غنا اور موسیقی، جدید فیشن، کھیل کود اور تفریح کے وسائل، فال نکالنے، دست شناسی، ستاروں کے حال اور ذہن میں اٹھنے والے ایسے ہی دیگر مسائل کے بارے میں سوال کیے جن سے آج کے جوانوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ گفتگو کا یہ سلسلہ دو سال کے عرصے تک جاری رہا۔ ہم اعتراف کرتے ہیں کہ یہ سست روی ہماری ہی وجہ سے تھی۔

ہم نے آیت اللہ فضل اللہ سے سوال کیا کہ خود انہوں نے اپنی جوانی کے ایام کس طرح بسر کیے، جوانی میں اپنی تربیت کے لیے کیا راستہ اپنایا، نیز اپنے بچوں کی تربیت کے سلسلے میں کس اسلوب کو اختیار کیا۔ یہی اس مجموعے کا آخری حصہ ہے جس کے متعلق ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ اسکی تکمیل بے عیب اور بے نقص ہوئی ہے۔

بہرحال، اس گفتگو کے ذریعے ہم جن امور کو زیر بحث لا سکے ہیں وہ اس وسیع وعریض میدان میں اٹھایا جانے والا ایک بڑا اور مضبوط قدم ہے۔

ہم یہ بتا دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ ہم نے معائب دور کرنے، مباحث کی تکمیل اور نقائص کے ازالے کے سلسلے میں اپنی سی بھرپور کوشش کی ہے، اس کے باوجود ہمیں اس بات کا اعتراف ہے کہ کتاب کے ہر حصے میں کچھ نہ کچھ نقائص رہے ہوں گے۔

یہ وہ حقیقت جسے ہم نے ابتدا ہی میں محسوس کر لیا تھا، اور اس سے ہم آغاز ہی سے واقف تھے، لہٰذا ہم نے ہر حصے کے آخر میں اس حصے میں زیر بحث آنے والے موضوعات پر ضمیمہ احادیث کے عنوان سے احادیثِ معصومینؑ پیش کرنے کا اہتمام کیا۔ اسی طرح کتاب کے آخر میں ہم نے ایک اور ضمیمے کا اضافہ کیا گیا ہے جس میں نوجوانوں سے متعلق آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ کے استفتاءات کو نقل کیا گیا ہے۔

بہرصورت ہم نوجوانوں سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ کتاب کے بارے میں اپنی تنقید اور تبصرے سے دریغ نہیں کریں گے، تاکہ نہ صرف ہم خود ان سے مستفید ہوں بلکہ آئندہ

اشاعت میں انہیں پیشِ نظر رکھیں۔

آخر میں خداوندِ عالم کی بارگاہ میں دعا گو ہیں کہ ہمارے اس ناچیز ہدیے کو قبول و مشکور فرمائے اور روزِ جزا ہمیں اس کے ثواب سے بہرہ مند فرمائے: یَوْمَ لاَ یَنْفَعُ مَالٌ وَّ لاَ بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ اَتَی اللہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ. (جس دن مال اور اولاد کوئی کام نہ آئے گا، مگر وہ جو قلبِ سلیم کے ساتھ اللہ کی بارگاہ میں حاضر ہو۔ سورۂ شعراء ۲۶۔ آیت ۸۸،۸۹)

احمد احمد۔ عادل القاضی

بیروت۔ یکم جنوری ۱۹۹۵ء

☆☆☆☆☆

①

قرآن کی روشنی میں

گفتگو' تربیت کا ایک ذریعہ

☆ حضرت لقمانؑ کی اپنے بیٹے کو کی گئی نصیحتوں کی روشنی میں (۱)۔ آپ کی نظر میں براہِ راست تربیت ایک انسان کی رہنمائی' اصلاح اور نصیحت آموزی کے سلسلے میں کس حد تک مفید اور موثر ہے؟

○ غالباً تربیت کا شمار ان مسائل میں ہوتا ہے جن میں اثر انداز ہونے والے عوامل مسائل کے ادراک کے موقع پر انسان کے مختلف پہلوؤں کی بنیاد پر مختلف ہوتے ہیں۔ خواہ یہ مواقع غور و فکر کے ہوں یا جذبات و احساسات کے یا انسان کے ارد گرد پھیلی ہوئی فضا اور ماحول ہو۔ اس لحاظ سے قدرتی بات ہے کہ "گفتگو" جو انسانوں کے مابین افکار و خیالات کے تبادلے کا ایک وسیلہ ہے فکری' معنوی اور عملی مضامین کی حامل ہونے کی بنا پر تربیت کا ایک انتہائی اہم اور موثر ذریعہ ہے۔

اسی طرح بعض گفتگوئیں ایسی خاصیت کی حامل ہوتی ہیں کہ انسانوں سے گفتگو کی تاریخ میں بسا اوقات ہمیں نظر آتا ہے کہ ان گفتگوؤں میں استعمال ہونے والے الفاظ ذہن

۱۔ مراد حضرت لقمانؑ کی وہ نصیحتیں ہیں جن کا ذکر سورۂ لقمان کی آیات ۱۳ تا ۱۹ میں ہوا ہے۔

کو ایسے معنی سے روشناس کراتے ہیں جو ان الفاظ کے لغوی معنی سے مختلف ہوتے ہیں۔ اور یوں یہ الفاظ مفاہیم کو کبھی وسعت بخشتے ہیں اور کبھی ان کا دائرہ تنگ کر دیتے ہیں۔

لہٰذا ''گفتگو'' تربیت کا ایک الٰہی وسیلہ ہے جس سے خداوندِ عالم نے اپنے انبیا پر نازل کی جانے والی کتب میں استفادہ کیا ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ تربیت کے سلسلے میں گفتگو کے (مثبت اور منفی) اثرات انسانی تاریخ میں ہمیشہ نظر آتے ہیں۔

گفتگو کے ذریعے نصیحت

اسی درمیان ہم کچھ ایسی اصطلاحات سے واقف ہوتے ہیں جو اپنے اندر مختلف مضامین لیے ہوتی ہیں۔ انہی میں سے ایک قرآنِ کریم میں استعمال ہونے والی اصطلاح ''وعظ'' ہے۔

جس مقام پر حضرت لقمانؑ اپنے فرزند سے گفتگو کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کے ذہن کو عقیدے اور زندگی گزارنے کے لیے لازمی مسائل کی جانب متوجہ کریں' وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ وعظ کا لفظ فکری مسائل کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے اندر احساس و جذبات کے بعض پہلو بھی لیے ہوئے ہے۔ کیونکہ انسانی فکر صرف شعور و آگہی اور خشک علم و دانش کے ذریعے آگے نہیں بڑھتی' بلکہ کوشش کرتی ہے کہ ایسی تعبیروں سے بھی استفادہ کرے جو جذبات و احساسات سے لبریز ہوں۔

عقل اور جذبات کا امتزاج

مذکورہ بالا گفتگو سے ظاہر ہے کہ وعظ' فکر کے ساتھ ساتھ انسانی جذبات و احساسات کو بھی تحریک دیتا ہے۔ بالفاظِ دیگر اس میں عقل و جذبات کی آمیزش ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ انسان کے قلب اور ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے۔

عقل اور جذبات کی آمیزش انسان کے لیے ایک ایسی فضا ایجاد کرتی ہے جو اسکی

ہستی کو جھنجھوڑ کے رکھ دیتی ہے اور اسے اپنی فکر کی نشوونما پر ابھارتی ہے' اور فکر اپنے مختلف عناصر کی بنیاد پر انسان کی ذات میں داخلے کے لیے وسیع افق کھولتی ہے۔ اس چیز کا مشاہدہ ہم ان تمام نصائح میں کر سکتے ہیں جن کا عقلی پہلو جذباتی پہلو سے دور یا علیحدہ نہیں ہوتا۔

یہ روش تربیت کا غالباً وہ واحد موثر طریقہ ہے جو انسان کی شخصیت میں انقلاب برپا کر سکتا ہے۔ اکثر لوگ جو صرف فکر پر بھروسا کرتے ہیں' وہ اپنی فکر کو صرف خشک عقلانیت کی صورت میں بیان کرتے ہیں اور مسئلے کو ریاضی کی خشک مساواتوں کی مانند سامنے لاتے ہیں' جو صرف انسانی عقل و فکر سے سروکار رکھتی ہیں' اور انسانی شخصیت کے دوسرے پہلوؤں (جیسے جذبات و احساسات) کے تقاضوں کا جواب نہیں دیتیں۔ جبکہ ان کے بالمقابل کچھ دوسرے لوگ مسائل کو صرف جذبات و احساسات کے رنگ میں پیش کرتے ہیں۔ یہ چیز بھی انسان کو گہرے غور و فکر سے باز رکھتی ہے' اور اس کے عقیدے اور فکر میں فاصلہ پیدا کر دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ ایسے ہیں جو بعض چیزوں کو فکری طور پر تو قبول کرتے ہیں لیکن ان پر عقیدہ نہیں رکھتے' کیونکہ اُن میں ایمان نہیں پایا جاتا' جو فکر کو احساس میں بدلتا اور وجود میں ایک ہلچل پیدا کرتا ہے۔

نصیحت کا قرآنی اسلوب

یہاں ہمیں پتا چلتا ہے کہ قرآنِ کریم کے طریقۂ نصیحت کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ وہ کوشش کرتا ہے کہ اپنی تربیتی روش کے اجزا روزمرہ زندگی سے حاصل کرے۔ اسی بنا پر وہ ذہن کو گہرے غور و فکر کی دعوت دیتا ہے۔ تاکہ فکر کو اس احساس سے آشنا اور اس احساس کو اس پر مسلط کر دے جسے انسان اپنے اردگرد کے ماحول کو دیکھ کر' سن کر اور چھو کر حاصل کرتا ہے۔ اور پھر خوف و رجا' حب و بغض جیسے وسائل سے استفادہ کر کے فکر کو انسان کے باطن کا

حصہ بنادے۔

اس مقام پر ہمارے علم میں یہ بات آتی ہے اگر وعظ و نصیحت کے اسلوب اور طریقۂ کار کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے اور واعظ اور ناصح مستحکم فکری ذرائع اور نرم و نازک جذباتی وسائل سے استفادہ کرے' اور ان چیزوں کو مدِ نظر رکھے جو انسانی فکر اور احساس کے لیے ضروری ہیں' تو اس طرح گویا اس نے تربیت کا موثر اور کامیاب ترین اسلوب اختیار کیا ہے۔

نصیحت بذریعہ نمونۂ عمل

ایک نکتہ جس کا ذکر یہاں مناسب دکھائی دیتا ہے' وہ یہ ہے کہ کبھی کبھی زبانی کلامی باتیں وعظ و نصیحت پر حاوی ہو جاتی ہیں۔ لیکن بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ وعظ و نصیحت اور کلام و گفتگو کے درمیان بہت دوری پائی جاتی ہے۔ ہم اس مضمون کو اس حدیث سے حاصل کرتے ہیں جس میں کہا گیا ہے کہ: **من لم یکن له من نفسه واعظ' لم تنفعه المواعظ.** (جس شخص کے اپنے اندر نصیحت کرنے والا موجود نہ ہو' اسکے لیے دوسروں کی نصیحت بے سود رہتی ہے) یہ حدیث ہم سے کہتی ہے کہ انسان اپنے تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے خود کو وعظ و نصیحت کر سکتا ہے۔

امام علیؑ نے نہج البلاغہ میں اسی موضوع کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا ہے:

"خیر ما جربت ما وعظک."

"بہترین تجربہ وہی ہے جس سے تم نصیحت حاصل کرو۔"

(نہج البلاغہ۔ مکتوب ۳۱)

لہٰذا' تجربہ کیونکہ فکری پہلو کا حامل بھی ہوتا ہے اور احساس کا پہلو بھی رکھتا ہے' اس لیے وہ انسان کو درس بھی دے سکتا ہے اور فکر بھی' اور گرد و پیش کی حقیقتوں کی شناخت کی اساس پر اس کے لیے محرکِ عمل بھی بن سکتا ہے۔

اسی بنیاد پر ہم دیکھتے ہیں کہ ایسے افراد جو اپنی گفتار سے پہلے اور اس سے زیادہ اپنے عمل سے دوسروں کو نصیحت کرتے ہیں، وہ اپنے اس طرزِ عمل سے نصیحت کے ایک ذریعے کے طور پر استفادہ کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے وعظ و نصیحت کی اصطلاح اپنے اندر تمام فکری وسائل، سوچ بچار، اعمال اور اثر انداز ہونے والے دوسرے ذرائع لیے ہوئے ہے۔ یہ تمام چیزیں وعظ و نصیحت کے مفہوم کی وسعت کی نشاندہی کرتی ہیں، جس کا خلاصہ ان الفاظ میں کیا جا سکتا ہے کہ: وعظ و نصیحت، اس متنوع اور آگہی بخش اسلوبِ عمل کو کہتے ہیں جو انسان کو اسکی لغزشوں کی تصحیح یا اسکے انحراف یا گمراہی کے ازالے، نیز اسکی حیات پر بند آفاق کھولنے کے لیے غور و فکر پر ابھارتا ہے۔

نصیحت لینے والا

نصیحت ناصح کا عمل ہے، ناصح اپنی تمام تر صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر نصیحت چاہنے والے کے سامنے دلائل کے ڈھیر لگاتا ہے۔ لہٰذا نصیحت لینے والے شخص میں بھی نصیحت کے تمام وسائل و ذرائع سے استفادے کی صلاحیت، قابلیت اور ارادے کا پایا جانا ضروری ہے۔

نصیحت ایسے ہی شخص پر کارگر ہوتی ہے جو کسی کلام، عمل، اسوۂ عمل یا متنبہ کرنے والے کسی ذریعے سے متاثر ہوتا ہو۔ لہٰذا ایسا شخص جو مذکورہ عوامل پر بالکل توجہ نہ دے، وہ ایک بے حس لاش کی مانند ہے۔

جس طرح قدرتی طور پر ایک مردہ انسان کا جسم شعور و احساس سے عاری ہوتا ہے، اسی طرح اکثر ایسے زندہ انسانوں میں بھی یہ ایک طبیعی امر ہو جاتا ہے جو اپنی شخصیت کو مردہ کر بیٹھتے ہیں، اپنی فکر کو منجمد کر لیتے ہیں۔ اس بات کا ذکر قرآنِ کریم میں بھی بارہا ہوا ہے، فرمانِ الٰہی ہے:

"لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا وَ لَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَ لَهُمْ

اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا."

''ان کے پاس دل ہیں مگر سمجھتے نہیں ہیں' آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں ہیں' کان ہیں مگر سنتے نہیں ہیں۔'' (سورۂ اعراف ۷۔ آیت ۱۷۹)

یہ آیت ہم سے کہتی ہے کہ جب انسان اپنی شخصیت کے فکری یا جذباتی یا ارادی پہلو کو خشک اور منجمد کرلے' تو وہ ایک بے روح اور جامد انسان میں بدل جاتا ہے۔ ایسے ہی انسانوں کے بارے میں قرآنِ مجید کہتا ہے:

''سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ.''

''آپ انہیں ڈرائیں یا نہ ڈرائیں یہ ایمان نہیں لائیں گے۔''

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۶)

''خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَ عَلٰی سَمْعِهِمْ وَ عَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ."

''خدا نے ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگادی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے ہیں۔'' (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۷)

یعنی ایسا انسان جس کی شخصیت پر وعظ و نصیحت کی کرنیں بکھری ہی نہ ہوں' وہ کیونکر ان سے متاثر ہوسکتا ہے؟

ابراہیمیؑ تربیت

☆ حضرت اسماعیلؑ نے اپنے والدِ گرامی (حضرت ابراہیمؑ) کا خواب سننے کے بعد فرمایا: یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ. (بابا! آپ کو جو حکم دیا گیا ہے اس پر عمل کیجیے۔ سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۲) اور اس طرح انہوں نے خدا کی مشیت کے سامنے تسلیمِ محض ہونے کا مظاہرہ کیا۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا حضرت اسماعیلؑ کے اس درجۂ تسلیم' اطاعت

اور انقیاد کی اقتدا ممکن ہے؟

○ جب ہم حضرت ابراہیمؑ کی زندگی کے مختلف مراحل کا مطالعہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ آپ کے اندر ابتدا ہی سے ایک ایسے انسان کی شخصیت موجود تھی جو اپنی زندگی میں ایک حقیقتِ مطلق کی جانب توجہ کے ذریعے خداوندِ عالم کی جانب متوجہ ہے۔ اگر ہم قرآنی آیات کی روشنی میں حضرت ابراہیمؑ کے طرزِ عمل کا جائزہ لیں تو دیکھتے ہیں کہ آپ گمراہ کن کافرانہ اور مشرکانہ افکار کو چیلنج کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے اپنے اطراف موجود کافر اور مشرک لوگوں کے اذہان میں شکوک وشبہات اور وسوسے پیدا کرتے ہیں۔

اس چیز کا انتہائی کھلا مشاہدہ اس مقام پر کیا جاسکتا ہے جہاں آپ ستاروں اور چاند، سورج کی پرستش کرنے والوں میں شامل ہو جاتے ہیں، تاکہ پہلے تو ان لوگوں کو ان مخلوقات کی عظمت پر متعجب اور حیران کریں اور اسکے بعد فکری مباحثے کے ذریعے انہیں اس بات کی تاکید کریں کہ ستارے، چاند اور سورج معبود نہیں ہو سکتے، کیونکہ معبود ہونے کا مستحق تو بس وہی ہے جو ہمہ وقت حاضر اور تمام عالم پر محیط ہو۔

مذکورہ گفتگو کو سامنے رکھتے ہوئے ہم یہ کہیں گے کہ حضرت ابراہیمؑ کی جدوجہد کا محور معاشرے کو خدا پر ایمان کی جانب لے کے آنا تھا، اور اس مقصد کے لیے آپ نے افرادِ معاشرہ کے افکار پر ضرب لگانے کا طریقۂ کار اختیار کیا تھا۔ آپ کے اس طریقۂ کار کی ایک مثال وہ واقعہ ہے جس میں آپ نے مشرکوں کے بتوں کو توڑ ڈالا اور اس توڑ پھوڑ کا الزام ان کے سب سے بڑے بت پر رکھ دیا، تاکہ بت پرستوں کو اس اعتراف پر مجبور کر دیں کہ ان کے معبود بول چال پر بھی قادر نہیں۔ لہٰذا ان مشرکین نے حضرت ابراہیمؑ کے جواب میں کہا: لَقَدْ عَلِمْتَ مَا هٰٓؤُلَاۗءِ يَنْطِقُوْنَ. (تمہیں تو معلوم ہے کہ یہ بولتے نہیں ہیں۔ سورۂ انبیا ۲۱۔ آیت ۶۵)

حضرت ابراہیمؑ ان لوگوں سے اسی طرح بحث ومباحثہ کرتے تھے، تاکہ ان پر ان کے

افکار کا غلط ہونا واضح کردیں۔ اور جب آپ اپنے والد (بعض مفسرین کے مطابق اپنے چچا) کی کبھی نرم لہجے میں اور کبھی سختی کے ساتھ مخالفت کرتے تھے، تب بھی اسی طریقہ کار سے کام لیتے تھے۔ آپ نے اپنے زمانے کے ظالم بادشاہ کے سامنے بھی یہی اسلوب اپنایا:

"اِذْ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ رَبِّیَ الَّذِیْ یُحْیٖ وَیُمِیْتُ قَالَ اَنَا اُحْیٖ وَ اُمِیْتُ قَالَ اِبْرَاهِیْمُ فَاِنَّ اللّٰهَ یَاْتِیْ بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَاْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِیْ کَفَرَ."

"جب ابراہیم نے کہا کہ میرا خدا زندہ بھی کرتا ہے اور مارتا بھی ہے، تو اس نے کہا کہ میں بھی زندہ کرسکتا اور مارسکتا ہوں۔ تو ابراہیم نے کہا کہ میرا خدا مشرق سے سورج طلوع کرتا ہے تو مغرب سے طلوع کردے، تو کافر مبہوت رہ گیا۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۵۸)

الٰہی انسان

ہم دیکھتے ہیں کہ (ان مذکورہ واقعات میں) حضرت ابراہیمؑ میں ایک ایسی حالت پائی جاتی ہے جس نے انہیں ایک ایسا الٰہی انسان بنا دیا تھا جو اپنی ذمے داری محسوس کرتا ہے کہ ہر حال میں ایک خدا پسند زندگی بسر کرے، خدا کی پرستش کرے اور اپنے آپ کو صرف اسی کا بندہ سمجھے، یہاں تک کہ تمام دنیوی تعلقات، دشواریوں اور حالات سے صرفِ نظر کرتے ہوئے یہ محسوس کرے کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدا کے لیے وقف ہونا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم آپ کے بارے میں فرماتا ہے:

"وَ اتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرَاهِیْمَ خَلِیْلاً."

"اور اللہ نے ابراہیم کو اپنا خلیل اور دوست بنایا ہے۔"

(سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۲۵)

یہ حضرت ابراہیمؑ کی خدا سے انسیت کا فطری نتیجہ ہے کہ خدا بھی انہیں اپنا دوست قرار دیتا ہے۔ یہ دوستی ان دونوں کے درمیان دوطرفہ باہمی محبت ایجاد کر دیتی ہے اور یہ انسان کے اپنے معبود سے ارتباط کا بلندترین درجہ ہے' یہ بندگی کا وہ درجہ ہے جو تکمیل پاتے پاتے دوستی پر منتہی ہوتا ہے۔ خداوند عالم اور حضرت ابراہیمؑ کے درمیان پائی جانے والی یہ دوستی، جس کا سرچشمہ خدا کی بندگی ہے اور جو احساس کی گہرائی میں نشو ونما پاتی ہے اور ایک ایسی حالت ہے جس کے تحت حضرت ابراہیمؑ اپنے وجود اور کائنات کو خدا کی ذات سے قائم سمجھتے ہیں اور یہ انہیں ایک ایسے درجے پر پہنچا دیتی ہے کہ وہ خدا سے مردوں کو زندہ کرنے کی خواہش کرتے ہیں:

''قَالَ اِبْرَاهِيْمُ رَبِّ اَرِنِيْ كَيْفَ تُحْيِ الْمَوْتٰى قَالَ اَوَ لَمْ تُؤْمِنْ قَالَ بَلٰى وَ لٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ.''

''ابراہیم نے کہا کہ پروردگار مجھے یہ دکھا دے کہ تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے۔ ارشاد ہوا' کیا اس پر تمہارا ایمان نہیں ہے۔ عرض کی: ایمان تو ہے لیکن اطمینانِ قلب چاہتا ہوں۔'' (سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۶۰)

اس کی معنی یہ ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ خداوند عالم سے ہمکلام ہوتے وقت اور پروردگار کے سایۂ لطف میں زندگی بسر کرتے ہوئے خدا کی محبت' عبودیت' اطاعت اور ایک مومنانہ معرفت سے گندھی ہوئی قابلِ رشک زندگی گزارتے ہیں۔

اس پہلو سے ہم حضرت ابراہیمؑ کو ایک ایسا انسان پاتے ہیں جس کی زندگی خدا کے سامنے تسلیم و انقیاد کا ایک کامل مظہر ہے۔ اس حقیقت کو ہم اس قرآنی تعبیر سے بھی درک کرتے ہیں جس کے مطابق حضرت ابراہیمؑ ہی وہ پہلے شخص ہیں جن کے بارے میں ''مسلم'' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے:

''مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرَاهِيْمَ هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ قَبْلُ وَ فِيْ هٰذَا.''

''یہی تمہارے بابا ابراہیم کا دین ہے اور اس نے تمہارا نام پہلے بھی اور اس (قرآن) میں بھی مسلم رکھا ہے۔'' (سورۂ حج ۲۲۔آیت ۷۸)

''اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ وَ وَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَ يَعْقُوْبُ يٰبَنِيَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔''

''جب ان سے ان کے پروردگار نے کہا کہ تسلیم ہو جاؤ تو انہوں نے کہا کہ میں رب العالمین کے لیے سراپا تسلیم ہوں' اور اسی بات کی ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ اے میرے فرزندو اللہ نے تمہارے لیے دین کو منتخب کر دیا ہے' اب اس وقت تک دنیا سے نہ جانا جب تک واقعی مسلمان نہ ہو جاؤ۔'' (سورۂ بقرہ ۲۔آیت ۱۳۱،۱۳۲)

لہٰذا حضرت ابراہیمؑ نے لفظ ''اسلام'' کو خدا سے سننے کے بعد اولین بار اسے ایک طرزِ حیات کے طور پر جاری کیا اور اسکی پیروی کی۔ اس بنا پر تمام ابراہیمی نبوتوں (اگر یہ تعبیر درست ہو تو) نے اسلام کو اس لفظ کے عام معنی کے لحاظ سے اپنایا:

''اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ.''

''دین اللہ کے نزدیک صرف اسلام ہے۔'' (سورۂ آلِ عمران ۳۔آیت ۱۹)

''وَ مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ.''

''اور جو اسلام کے علاوہ کوئی بھی دین تلاش کرے گا' تو وہ دین اس سے قبول نہ کیا جائے گا۔'' (سورۂ آلِ عمران ۳۔آیت ۸۵)

یہاں اسلام سے مراد وہ توحیدی دین و مذہب ہے جو تمام نبوتوں میں نظر آتا ہے۔ فطری بات ہے جو ہمیں نظر آتی ہے کہ اپنی پوری زندگی شعوری' وجدانی اور عملی لحاظ سے خدا کے لیے وقف کر دینے والے حضرت ابراہیمؑ عام لوگوں کو دعوتِ اسلام دینے کی

جدوجہد کے ساتھ ساتھ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ اپنے گھرانے کے اندر بھی ایک تربیتی تحریک ایجاد کریں۔ تاکہ جس طرح وہ خود ایک اعلیٰ پائے کے مسلمان ہیں، اسی طرح یہ اسلام ان کی اولاد میں بھی منتقل ہو جائے۔ یہ وہی چیز ہے جس کا ذکر قرآنِ کریم میں آیا ہے:

''وَ وَصّٰی بِھَآ اِبْرَاھِیْمُ بَنِیْهِ وَ یَعْقُوْبُ یٰبَنِیَّ اِنَّ اللهَ اصْطَفٰی لَکُمُ الدِّیْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ۔''

''اور اسی بات کی ابراہیم اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی کہ اے میرے فرزندو! اللہ نے تمہارے لیے دین کو منتخب کر دیا ہے، اب اس وقت تک دنیا سے نہ جانا جب تک واقعی مسلمان نہ ہو جاؤ۔''

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۳۲)

اسلام ایک تربیتی اسلوب

اسلام اسی تربیتی اسلوب کا نام ہے جس کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ نے اپنی اولاد سے چاہا کہ وہ اس کے ذریعے فرمانِ الٰہی کی پیروی کرے۔ واضح ہے کہ یہ وہ تربیتی اسلوب ہے جس نے اپنے آپ کو اسماعیلؑ اور یعقوبؑ کی زندگیوں میں مجسم کیا۔

جب ہم آیۂ قرآن: فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ. (اور پھر ہم نے انہیں ایک نیک دل فرزند کی بشارت دی۔ سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۱) کو پڑھتے ہیں تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ مدتِ دراز تک ناامیدی کے بعد حضرت ابراہیمؑ کو ایک فرزند کی خوش خبری دی گئی ہے۔ خداوندِ عالم انہیں ایک ایسے فرزند سے نوازتا ہے جس کے پائے ثبات میں سخت اور دشوار حالات میں بھی تزلزل اور لڑکھڑاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔

آیۂ کریمہ: فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْیَ. (پھر جب وہ فرزند ان کے ساتھ دوڑ دھوپ کے قابل ہو گیا۔ سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۲) اس بات کی علامت ہے کہ

اسماعیلؑ اپنے والد کے ساتھ گزاری ہوئی مدتِ حیات میں مکمل طور پر ان کے ساتھ ساتھ رہے۔ اور یہ ایک فطری بات ہے' خاص طور پر اس وقت جب ایک طویل عرصے کی ناامیدی کے بعد ایسا پیارا بچہ انسان کو نصیب ہوا ہو۔ حضرت ابراہیمؑ خداوند عالم کے ساتھ اپنی تمام قلبی اور ایمانی وابستگی' اور اپنی معنوی معرفت جو فکری' روحی' عبادی اور عملی پہلوؤں کا آمیزہ تھی' اپنے فرزند اسماعیلؑ میں منتقل کرتے ہیں' یہاں تک کہ سراسر تسلیم و انقیاد کی جو حالت حضرت ابراہیمؑ میں موجود تھی وہ اب حضرت اسماعیلؑ میں بھی پائی جاتی تھی۔

جذباتی احساسات اور نفس کے خلاف جنگ

خداوندِ عالم حضرت ابراہیمؑ اور حضرت اسماعیلؑ کی زندگی کو مستقبل کے تمام باپوں اور بیٹوں کے لیے بارگاہِ الٰہی میں اعلیٰ ترین تسلیم و انقیاد کی ایک مثال کے طور پر پیش کرنا چاہتا تھا۔ شفقتِ پدری' کسی اور کے ہاتھوں اپنے بیٹے کو ذبح ہوتے نہیں دیکھ سکتی' چہ جائیکہ باپ خود اپنے ہاتھوں اپنے فرزند کو ذبح کرے۔ یہ اسی صورت میں ممکن نظر آتا ہے جب باپ اس محبت و چاہت کا گلا گھونٹ دے جو قدرتی طور پر اسے اپنے اکلوتے' خوبصورت اور محبوب فرزند سے ہوتی ہے۔

دوسری طرف اسماعیلؑ بھی اپنے نفس اور اپنی ذات سے محبت کے خلاف جہاد کے اعلیٰ ترین درجات پر اسی طرح پہنچے ہوئے ہیں جس طرح دونوں (باپ بیٹوں) نے ایمان کی راہ میں آنے والی رکاوٹوں کے خلاف جنگ کی تھی' اور ایمان کے اس درجے پر فائز ہیں جوان سے کہہ رہا ہے کہ آگے بڑھ کر اس چیلنج کا جواب دیں۔ لہٰذا حضرت ابراہیمؑ کے لیے ضروری تھا کہ اپنی شفقتِ پدری کو فنا کردیں اور حضرت اسماعیلؑ کے لیے بھی لازم تھا کہ اپنی ذات کے احساس کو مار ڈالیں اور یوں یہ دونوں اس آزمائش سے کامیابی کے ساتھ باہر نکلیں۔ ہم کلامِ الٰہی میں دیکھتے ہیں کہ:

"قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیۡۤ اَرٰی فِی الۡمَنَامِ اَنِّیۡۤ اَذۡبَحُکَ فَانۡظُرۡ مَاذَا تَرٰی."

"انہوں نے کہا کہ بیٹا میں مسلسل خواب میں دیکھ رہا ہوں کہ تمہیں ذبح کر رہا ہوں' اب تم بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے۔"

اس سوال کے جواب میں اسماعیلؑ بلا تامل اور بے دھڑک کہتے ہیں:

"یٰۤاَبَتِ افۡعَلۡ مَا تُؤۡمَرُ سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ مِنَ الصّٰبِرِیۡنَ."

"بابا آپ کو جو حکم دیا جا رہا ہے اس پر عمل فرمائیے انشاءاللہ آپ مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائیں گے۔" (سورۂ صافات ۳۷۔ آیت ۱۰۲)

باپ اور بیٹا

مذکورہ گفتگو سے پتا چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ اپنے فرزند کی تربیت کرتے ہوئے انہیں تسلیم واطاعت کے ایک ایسے اعلیٰ مرتبے تک پہنچانے میں کامیاب ہوئے جہاں انسان خدا کی طلب اور خواہش کے سامنے اپنی ذات کو بھلا بیٹھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے برسوں کی ناامیدی کے بعد صاحبِ اولاد ہونے والے اکثر باپوں کی مانند رَویہ اختیار نہیں کیا۔ انہوں نے حضرت اسماعیلؑ کی پرورش نازونعم کے ساتھ نہیں کی اور انہیں ایسی آزادی نہیں دی کہ وہ عیش کوشی اور لہو ولعب میں پڑ جائیں۔ اور خود پر وہ حالت طاری نہیں ہونے دی جس کے ہوتے ہوئے باپ کو بیٹے کی خطائیں مقدس نظر آتی ہیں اور اسکی برائیاں نیکیاں معلوم دیتی ہیں۔ کیونکہ باپ کی شدید محبت ایسے بیٹے کی آزردگی برداشت نہیں کرسکتی۔

ہمارے خیال میں حضرت اسماعیلؑ اس آزمائش کا سامنا کرنے کے لیے تیار تھے۔ نیز حضرت ابراہیمؑ میں بھی دعوت ورسالت اس قدر کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی کہ آپ اپنے بیٹے کو انسانی محبت وشفقت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے' بلکہ اسے بھی چشمِ رسالت سے دیکھتے تھے۔ وہ خود سے کہتے تھے کہ اسماعیلؑ بھی انسان ہے' اسے بھی خدا کے ایک مخلص بندے کی

مانند توحید کے راستے پر گامزن ہونا ہے۔ لہٰذا ایسا نہ ہو کہ ہمارا باہمی رشتہ ہمیں شخصی اور انفرادی تعلق میں غرق کر دے، بلکہ مجھے چاہیے کہ اسے بھی خدا کا ایک بندہ سمجھتے ہوئے خدا کی عبودیت اور بندگی کی تاکید کروں۔ علاوہ ازایں وہ انسانی معاشرے کا ایک فرد ہے، پس مجھ پر لازم ہے کہ اسے ایسا انسان بناؤں جس کے ایمان و استقامت کے تجربے سے انسانیت مستفیض ہو۔

شخصیت میں رسالی اور انسانی پہلو کی آمیزش

حضرت ابراہیمؑ اپنی شخصیت میں رسالی اور انسانی پہلو کی آمیزش اور انہیں یکجا کرنے پر قادر رہے۔ آپ کی انسانی شخصیت کی رو سے پدرانہ کردار کا تقاضا تھا کہ اپنے بیٹے سے شفقت اور محبت کے ساتھ پیش آئیں۔ انہوں نے محبت کے ذریعے اپنے فرزند کو قربِ الٰہی اور خدا کے بھرپور اور ابدی فیوضات کا حامل ہو جانے کی منزل تک بلند کیا۔

حضرت ابراہیمؑ کی شخصیت کے رسالی پہلو کے تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ آپ خود کو اپنے فرزند کے لیے بھی ویسا ہی رسول سمجھتے تھے، جیسے رسول آپ دوسرے سب لوگوں کی ہدایت کے لیے تھے۔ لہٰذا آپ کچھ ایسے لوگوں کی مانند عمل نہیں کرتے تھے جو دوسروں کو تو دعوت دیتے ہیں لیکن خود ان کے اہلِ خانہ اور اولادیں اس دعوت سے بے بہرہ رہتی ہیں۔ اور آپ یہ نہیں چاہتے تھے کہ صرف دوسروں کی آزادی پر قدغن لگائیں اور خود اپنے گھرانے کو اس دعوت سے دور رکھیں۔

حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ کی ذاتی شخصیت کی تعمیر کے بعد ان کی پیغمبرانہ شخصیت کی نشو و نما کے لیے بھی اقدام اُٹھائے۔ ابھی جبکہ آپ اپنے اس فرزند کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں مصروف تھے، آپ نے انہیں خانۂ کعبہ کی دیواروں کو بلند کرنے کے کام میں شامل کیا: وَ اِذْ یَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَیْتِ وَ اِسْمٰعِیْلُ (اور اس وقت کو یاد کرو

جب ابراہیم و اسماعیل خانۂ کعبہ کی دیواروں کو بلند کر رہے تھے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۲۷)

اور اس طرح آپ اپنے فرزند کو تعمیر کعبہ کے روحانی اور معنوی ماحول میں لائے۔ یہ محض ایک مادّی اور جسمانی عمل نہ تھا بلکہ معنویت اور روحانیت سے بھرپور ایک کوشش تھی۔ اسی طرح اسحاقؑ اور یعقوبؑ نے بھی کیا: اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِيْ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَ اِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهِيْمَ وَ اِسْمٰعِيْلَ وَ اِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚ وَّ نَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (کیا تم اس وقت موجود تھے جب یعقوب کی موت کا وقت آیا اور انہوں نے اپنی اولاد سے پوچھا کہ میرے بعد کس کی عبادت کرو گے، تو انہوں نے کہا کہ آپ کے اور آپ کے آباؤ اجداد ابراہیم و اسماعیل و اسحاق کے پروردگار خدائے وحدہ لاشریک کی اور ہم اسی کے مسلمان اور فرمانبردار ہیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۳۳)

ہمیں قرآنِ مجید میں اس تربیتی اسلوب کا تفصیلی ذکر نہیں ملتا جسے حضرت ابراہیمؑ نے حضرت اسماعیلؑ و اسحاقؑ اور حضرت اسحاقؑ نے حضرت یعقوبؑ کے بارے میں اپنایا لیکن یہ ضرور پتا چلتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے ایک طرف اپنے پند و نصائح کے ذریعے اور دوسری طرف اسوۂ عمل کے توسط سے اپنے بچوں کے لیے ایک ایسا مناسب ماحول فراہم کیا جس نے انہیں آپ کی تعلیمات سے روشناس کیا۔ اور ان ہی اقدامات کا نتیجہ ہے کہ آپ کے فرزند اسماعیلؑ، اسحاقؑ اور یعقوبؑ سب کے سب اطاعتِ الٰہی کے خوگر ہوئے۔

انبیا کی اولادیں بھی دوسروں کی مانند ہوتی ہیں

☆ قرآنِ مجید میں حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کے کردار کے بالمقابل حضرت نوحؑ اور ان کے فرزند کے کردار کا ذکر بھی آیا ہے۔۔۔ ایک طرف ذبح ہو جانے کو کہا جا رہا تھا، دوسری طرف نجات کی طرف بلایا جا رہا تھا، ایک طرف تسلیم و رضا تھی، دوسری طرف انکار اور

روگردانی۔۔۔اس چیز سے کیا ظاہر ہوتا ہے؟

○ انبیا' اولیا اور علما کے بچے بھی دوسرے انسانوں کی مانند اچھے یا بُرے ماحول کا اثر قبول کرتے ہیں۔ اور جب معاشرے میں موجود مثبت اور منفی عوامل انہیں اپنی اپنی طرف کھینچنے کے لیے ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش کریں' تو وہ خود بھی اندرونی طور پر کشمکش سے دوچار ہو جاتے ہیں' جو اس بیرونی دباؤ کا ردِعمل ہوتا ہے۔

لہٰذا ضروری نہیں کہ پیغمبر کا بیٹا بھی لازماً صالح اور نیک کردار ہو' یا امام' عالمِ دین یا مجاہد کا بیٹا بھی ہو بہو اپنے باپ کی خصوصیات کا مالک ہو۔ کیونکہ اس کا باپ ماحول میں موجود اجزا میں سے ایک جز ہوتا ہے اور ان سینکڑوں عوامل میں سے ایک عامل ہے جو اسکی شخصیت کی تعمیر پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ باپ دوسرے متضاد عوامل کی وجہ سے' یا اپنی دعوتی زندگی کی مجبوریوں کی بنا پر ایسی کمزور صورتحال سے دوچار ہوتے ہیں کہ اپنے گھرانے پر خاطر خواہ اثر انداز نہیں ہو پاتے۔ یہ بکثرت داعیانِ دین (انبیا' ائمہ اور علما) کی مشکل ہے۔ کیونکہ بسا اوقات دعوتی زندگی کی مجبوریاں' مشکلات اور پیچیدگیاں انسان کو اپنے اہلِ خانہ کی طرف توجہ نہیں دینے دیتیں۔

گمراہ معاشرے کا اثر

یہاں اس نکتے کی جانب اشارہ کر دینا بھی مناسب دکھائی دیتا ہے کہ کبھی کبھی گمراہ معاشرہ باآسانی' بغیر کسی مزاحمت کے پیغمبر کے اہلِ خانہ کو بھی اپنی راہ پر لگا لیتا ہے۔ دراصل پیغمبر کی جدوجہد ایک بڑی جماعت کے خلاف ہوتی ہے' اور مشکل یہ ہوتی ہے کہ یہ مخالف جماعت اتنے زیادہ مادّی اسباب و وسائل اور وسیع امکانات و ذرائع سے لیس ہوتی ہے کہ پیغمبر اور ان کے اصحاب کے لیے ان سے مقابلہ آسان نہیں ہوتا۔

اسکی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر اور ان کے اصحاب کے پاس تمام وسائلِ قدرت موجود نہیں ہوتے' اور وہ طاقت کے کچھ ہی ذرائع کے حامل ہوتے ہیں جو انہیں قدرتی طور پر حاصل ہوتے ہیں۔ کیونکہ دعوت کا میدان انسانی طاقتوں اور صلاحیتوں کے اظہار کا میدان ہے غیبی قوتوں کو بروئے کار لانے کا میدان نہیں۔ اس میدان میں غیب بعض خاص مواقع پر اور معین حدود ہی میں دخل دیتا ہے اور بسا اوقات تو بالکل ہی دخل انداز نہیں ہوتا۔

اس ماحول میں (گمراہ) معاشرہ پیغمبر' امام یا عالم کے گھرانے پر دباؤ ڈالتا ہے' اسے بھی اپنے پھندے میں کسنے کی کوشش کرتا ہے۔ ایسے معاشرے میں دباؤ ڈالنے والے عناصر کی کثرت پیغمبر کے اہلِ خانہ کو بھی گمراہی کی سمت لے جاتی ہے اور ممکن ہے کبھی ان مصلحین کی مخلصانہ کوششوں کو شکست سے دوچار کر دے۔

ہم کچھ ایسے انبیا' اولیا اور علما کا مشاہدہ کرتے ہیں جنہیں نامناسب بیویوں کی طرف سے مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان بیویوں نے ان کے برخلاف راہ اختیار کی۔ لہٰذا قرآنِ کریم میں حضرت نوحؑ اور حضرت لوطؑ کی ازواج کے بارے میں آیا ہے:

''ضَرَبَ اللّٰہُ مَثَلاً لِّلَّذِیْنَ کَفَرُوا امْرَاَتَ نُوْحٍ وَّ امْرَاَتَ لُوْطٍ کَانَتَا تَحْتَ عَبْدَیْنِ مِنْ عِبَادِنَا صَالِحَیْنِ فَخَانَتٰھُمَا فَلَمْ یُغْنِیَا عَنْھُمَا مِنَ اللّٰہِ شَیْئًا وَّ قِیْلَ ادْخُلَا النَّارَ مَعَ الدّٰخِلِیْنَ.''

''خدا نے کفر اختیار کرنے والوں کے لیے نوح اور لوط کی بیویوں کی مثال بیان کی ہے کہ یہ دونوں ہمارے نیک بندوں کی زوجیت میں تھیں' لیکن جب ان سے خیانت کی مرتکب ہوئیں تو ان کی زوجیت نے خدا کی بارگاہ میں انہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچایا اور ان سے کہہ دیا گیا کہ تم بھی جہنم میں داخل ہونے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ داخل ہو جاؤ۔''

(سورۂ تحریم ۶۶۔ آیت ۱۰)

رسالت سے خیانت

اس گفتگو سے یہ بات بھی علم میں آتی ہے کہ خیانت سے مراد صرف عزت' آبرو اور ناموس کی خیانت نہیں' بلکہ سب سے بڑی خیانت مقامِ رسالت اور امانتِ نبوت سے خیانت ہے۔اور قدرتی طور پر یہ خیانت انبیا' اولیا اور علما کی اولادوں پر بھی منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔

اگر کوئی ماں فکری اور عملی طور پر گمراہ اور کفر آمیز رجحانات سے متاثر ہو' تو یہ چیز انتہائی برے اثرات مرتب کرتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ اپنے گھر میں کافرانہ رجحانات کے داخلے کا ذریعہ بنتی ہے' اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک وقت پیغمبر خود کو (معاشرے کی مانند) گھر میں بھی محصور محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ وہ اپنے گھرانے کو اس بنا پر گمراہ کن رجحانات سے محفوظ نہیں رکھ پاتا کہ وہاں اس کی اہلیہ اسکی مخالف ہوتی ہے۔اور حتیٰ اس صورتحال سے باہر نکلنے کا امکان بھی اس کے پاس نہیں ہوتا۔

گو کہ ہمیں قرآنِ کریم میں حضرت نوحؑ کے بیٹے کی جانب کوئی تاریخی اشارہ نہیں ملتا' لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے والد اسے خطاب کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ میرے ہمراہ کشتی میں سوار ہو جاؤ' اور نقصان اٹھانے والوں میں نہ جاملو: ارْكَبْ مَّعَنَا وَ لاَ تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ (ہمارے ساتھ کشتی میں سوار ہو جاؤ اور کافروں میں نہ ہو جاؤ۔سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۴۲) لیکن جیسا کہ واضح ہے حضرت نوحؑ کا بیٹا گمراہ ہے' وہ اپنے والد کے احترام کو ذرّہ برابر ملحوظ نہیں رکھتا' ان کی تنبیہ کو خاطر میں نہیں لاتا' ان کے غیب کے ساتھ تعلق پر ایمان نہیں رکھتا اور یہ بات نہیں مانتا کہ اس کا باپ اس بڑی مشکل سے نمٹنے کے لیے اتنی طاقت کا مالک ہے کہ کسی اور میں اتنی قدرت نہیں: قَالَ سَاٰوِيْٓ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ. (اس نے کہا میں عنقریب کسی پہاڑ پر پناہ لے لوں گا جو مجھے پانی سے بچا لے گا۔سورۂ

ہود۱۱۔ آیت ۴۳)۔ حضرت نوحؑ جو اب اپنے بیٹے کی ہدایت سے ناامید ہو چکے تھے فرماتے ہیں: لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللهِ (آج کوئی حکمِ خدا سے بچانے والا نہیں ہے۔ سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۴۳)

اس موقع پر حضرت نوحؑ نے اپنے پروردگار کو جو صدا دی اس میں اعتراض کا پہلو نہ تھا' بلکہ آپ نے اسے سوال اور التماس کے لہجے میں پکارا تھا۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے ان سے ان کے فرزند کی نجات کا وعدہ کیا تھا: وَ نَادٰى نُوْحٌ رَّبَّهٗ فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابْنِىْ مِنْ اَهْلِىْ وَ اِنَّ وَعْدَكَ الْحَقُّ وَ اَنْتَ اَحْكَمُ الْحٰكِمِيْنَ قَالَ يٰنُوْحُ اِنَّهٗ لَيْسَ مِنْ اَهْلِكَ اِنَّهٗ عَمَلٌ غَيْرُ صَالِحٍ. (اور نوح نے اپنے پروردگار کو پکارا کہ پروردگار! میرا فرزند میرے اہل میں سے ہے اور اہل کو بچانے کا تیرا وعدہ برحق ہے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ ارشاد ہوا: نوح! یہ تمہارے اہل میں سے نہیں ہے' یہ عملِ غیر صالح ہے۔ سورۂ ہود ۱۱۔ آیت ۴۵'۴۶)

ماں کا اثر

جب ہم خود سے یہ سوال کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ تھی کہ حضرت نوحؑ کا بیٹا اہلِ ایمان میں شامل نہ ہوا؟ تو قرآن کی رو سے ہمیں اس میں حضرت نوحؑ کی زوجہ اور ان کے بیٹے کے باہمی تعلق کا ہاتھ نظر آتا ہے۔ وہ اس طرح کہ اُن کے بیٹے پر زیادہ اس کی ماں کی تربیت کا اثر ہوتا ہے اور وہ بہت کم باپ کے اثرات قبول کرتا ہے۔ کیونکہ اس کا باپ یکا و تنہا ہے' جبکہ اسکی ماں کا رابطہ (اپنے اقربا اور دوسروں کے ساتھ ساتھ) پورے معاشرے سے ہے۔ اور قدرتی بات ہے کہ بچہ اکثریتی گروہ کے اثرات قبول کرتا ہے۔ جبکہ اس کا باپ جو عظیم اور بھاری ذمے داریوں کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھائے ہوئے ہے اور اس کے گرد مومنین کا ایک بہت چھوٹا سا گروہ ہے' اپنے بیٹے پر اثر انداز نہیں ہو پاتا۔

اس وضاحت کے ذریعے ہم حضرت اسماعیلؑ اور حضرت نوحؑ کے بیٹے کے مسئلے کے درمیان فرق کو سمجھ سکتے ہیں۔ اسکی تشریح یہ ہے کہ حضرت اسماعیلؑ نے ایک ایسے ماحول میں پرورش پائی جہاں حضرت ابراہیمؑ نے انہیں گمراہ کن دباؤ سے محفوظ رکھا' حضرت اسماعیلؑ ایک ایسے گھرانے میں پروان چڑھے جہاں انحرافی اور گمراہ کن رجحانات کا گزر نہ تھا' اس لیے کہ ان کی والدہ بھی صالح خاتون اور مومنہ تھیں۔

اسی بنا پر اسلام شادی بیاہ کے معاملے کو اہمیت دیتا ہے اور مومنین کو تاکید کرتا ہے کہ وہ اپنے لیے دیندار شریکِ حیات کا انتخاب کریں۔

ایک شخص رسولِ کریمؐ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے اور سوال کرتا ہے کہ میں کن خصوصیات کی حامل خاتون سے شادی کروں؟ آنحضرتؐ اس سے فرماتے ہیں کہ دیندار (لڑکی) کو شریکِ حیات منتخب کرو۔ اسی طرح آنحضورؐ شوہر کے لیے بھی اسی شرط کو اہمیت دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں:

''اذا جاء كم من ترضون خلقه و دينه فزوجوه الا تفعلوه تكن فتنة في الارض وفساد كبير.''

''جب بھی تمہارے پاس کوئی ایسا مرد تمہاری بیٹی کا رشتہ مانگنے آئے جس کے دین اور اخلاق سے تم مطمئن ہو' تو اسکے ساتھ اپنی لڑکی کی شادی کردو۔ اگر تم ایسا نہ کروگے تو روئے زمین پر بڑا فتنہ و فساد پھوٹ پڑے گا۔''

اسلام گھرانے کی بہتری اور سلامتی کی غرض سے تاکید کرتا ہے کہ خاتونِ خانہ دین کی پابند ہو اور مرد کو بھی متدین ہونا چاہیے' تاکہ بچے کی اوّلین پرورش گاہ ہی ایسی ہو جو اسکے فکر و شعور اور جذبات و احساسات کو مطلوبہ سطح تک بلند کرسکے اور گمراہی سے محفوظ رہنے کے لیے اسکے اندر ابتدائی حفاظتی رکاوٹ کھڑی کردے۔

لیکن اگر والدین کے درمیان کشمکش پائی جائے۔ مثلاً باپ بچوں کو دین و مذہب کا

پابند بنانا چاہتا ہو لیکن ماں انہیں لادینیت اور گمراہی کی طرف دھکیلنا چاہتی ہو (یا اس کے برعکس ہو) تو ایسی صورت میں قدرتی بات ہے کہ بچوں کی مناسب تربیت نہیں ہو سکتی۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ تربیت کے سلسلے میں والدین کا عامل ہی ہر مرض کی دوا ہے۔ لیکن یہ بات زور دے کر ضرور کہتے ہیں کہ بچے کے مستقبل کے بناؤ یا بگاڑ میں والدین کا کردار انتہائی اہم ہوتا ہے۔ البتہ دوسرے عوامل کے اثرات کا بھی ہم انکار نہیں کرتے۔

اس گفتگو کی روشنی میں حضرت نوحؑ کی داستان، ہمیں سکھاتی ہے کہ باپ کو اپنی اولاد کی تربیت کی جانب متوجہ رہنا چاہیے' ہاتھ پر ہاتھ دھرے اس اطمینان کے ساتھ نہیں بیٹھے رہنا چاہیے کہ اس کا بیٹا مستقبل میں ایک صالح اور نیک کردار انسان ثابت ہوگا۔ نیز اسے اپنی بیوی کے بُرے کردار اور اخلاق کی طرف سے بھی چوکنا رہنا چاہیے' کیونکہ اس کا اثر اس کے بچے پر پڑتا ہے۔ تاہم اگر طاقتور عوامل کے اثرات قبول کرنے کی وجہ سے اسکی اولاد گمراہ ہو جائے' تو اس بات کو اسے اپنے اوپر حد سے زیادہ سوار نہیں کرنا چاہیے اور خود کو کسی مشکل میں نہیں ڈالنا چاہیے۔ لوگوں کو بھی بیٹے کے بگاڑ کو باپ کی خرابی کی دلیل نہیں سمجھنا چاہیے۔ بدقسمتی سے بعض لوگ ایسے مواقع پر یہی کہتے ہیں کہ جاؤ جاؤ پہلے اپنے گھر کو ٹھیک کرو۔

درست ہے کہ خداوندِ عالم نے اہلِ خانہ کی رہنمائی اور اقربا کو تنبیہ و ہدایت' انسان کی ذمے داری قرار دی ہے' لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ اس بارے میں صد در صد ذمے دار ہے۔ بلکہ اس پر اتنی ہی ذمے داری عائد ہوتی ہے جتنی اس میں اس سلسلے میں قدرت اور توانائی ہے۔

صداقت' شبہوں کا ازالہ کرتی ہے

☆ آپ کا کیا خیال ہے' کیا ایک سماجی مصلح کی گھریلو زندگی کی ناسازگاری اسکی اصلاحی جدوجہد کو نقصان نہیں پہنچاتی' یا کم از کم اسکی قدر و قیمت کو گھٹا نہیں دیتی؟

○ بالکل، یہ صورتحال کبھی کبھی داعی اور مصلح کے خلاف عوام کے ذہن میں ایک ناپسندیدہ تاثر چھوڑتی ہے۔ خواہ یہ داعی پیغمبر ہو، امام ہو یا اہلِ ایمان میں سے کوئی شخص۔ لوگ کوشش کرتے ہیں کہ اس صورتحال کے منفی پہلو کو نمایاں کریں اور یہ بات پھیلائیں کہ یہ شخص اپنی دعوت میں سچا نہیں اور اسکی دعوت اور سرگرمیوں کا واحد مقصد لوگوں کو اپنا فریفتہ اور گرویدہ بنانا اور منصب و مقام اور مال و دولت کے حصول کے لیے ان سے فائدہ اٹھانا ہے۔

قرآنِ کریم میں جہاں خداوندِ عالم نے انبیا کی اقوام کے بارے میں گفتگو کی ہے، وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ یہ اقوام اپنے پیغمبروں پر تہمت لگاتی ہیں کہ ان کی جدوجہد لوگوں پر تسلط و اقتدار اور مادّی فوائد کے حصول کے لیے ہے۔ جس طرح کہ حضرت موسیٰ اور فرعون کے قصے میں ملتا ہے کہ لوگ کہا کرتے تھے کہ اگر موسیٰ اپنی دعوت میں سچے ہیں اور اس پر صدقِ دل سے ایمان رکھتے ہیں، تو اس کے اظہار کا طریقہ یہ ہے کہ وہ اپنے گھرانے کو بھی دعوت دیں اور انہیں بھی اپنے اوپر ایمان لانے والا بنائیں۔

اسی طرح جب لوگ دیکھتے ہیں کہ کوئی شخص بلند بانگ نعرے لگا رہا ہے اور لوگوں کو اصلاح کی دعوت دے رہا ہے، جبکہ خود ان چیزوں کا پابند نہیں، تو اس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر وہ اپنی دعوت میں مخلص ہے، تو پہلے خود اپنی اصلاح کرے، بعد میں دوسروں کو دعوت دے۔

جی ہاں! یہ صورتحال عام حالات میں منفی اثرات مرتب کرتی ہے۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اگر یہ شخص (عالم یا کوئی بھی دوسرا داعی) لوگوں کو باور کرادے کہ وہ اپنی دعوت میں سچا ہے اور لوگ بھی اسے اپنے مشن میں مخلص سمجھنے لگیں اور یہ بھی دیکھ لیں کہ وہ اپنی گمراہ اولاد سے ساز باز نہیں کرتا اور انہیں دوسرے افراد پر کوئی ترجیح نہیں دیتا، نیز اپنی دعوت کے دوران اس نے اپنے اہلِ خانہ کو راہِ راست پر لانے میں کوئی سستی نہیں کی ہے، کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے، تو لوگ دعوت کے سلسلے میں اسکی سچائی اور اخلاص پر یقین کر لیتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابولہب‘ جو پیغمبر اسلامؐ کا چچا تھا‘ آنحضرتؐ کی دعوت کا سخت مخالف تھا‘ لیکن اس چیز نے لوگوں کے اذہان میں آنحضرتؐ کے لیے کوئی منفی اثر مرتب نہیں کیا‘ کیونکہ آنحضرتؐ کے دعوتی کردار‘ دعوتی سرگرمیوں میں آپ کی تن دہی اور سخت جدوجہد اور مسلمان بیگانوں کو غیر مسلم اقربا پر مقدم رکھنے کے عمل نے‘ لوگوں پر یہ واضح کر دیا کہ آنحضرتؐ کے رشتے داروں پر اسلامی دعوت کے اثر انداز نہ ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ اپنی دعوت میں مخلص نہیں‘ بلکہ یہ اُن لوگوں کی شخصیت میں موجود پیچیدہ عناصر کا نتیجہ ہے۔ اسی بنا پر اس بات نے آنحضرتؐ پر کوئی منفی اثر نہیں ڈالا۔

ہماری رائے ہے کہ اگر داعیان ومبلغانِ دین اپنے اہلِ خانہ اور رشتے داروں سے برتاؤ میں اس بات کی پابندی کریں اور لوگوں پر یہ بات ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے بچوں سے مشفقانہ تعلق کی بنا پر ان کی گمراہی کو نظر انداز نہیں کریں گے‘ تو اس صورتحال (یعنی ان کے بچوں اور اہلِ خانہ کی گمراہی) کا منفی اثر زائل ہو کر شاید ان کے لیے ایک مثبت عامل میں بدل جائے۔

گمراہ کن ماحول اور اخلاقی مانع

☆ سورۂ یوسف میں ہم ایک ایسے جوان کا تذکرہ پاتے ہیں جو شہوت انگیز ماحول میں گھرے ہونے کے باوجود پرہیز گاری کا ثبوت دیتا ہے اور اپنے نفس کی حفاظت کرتا ہے۔ ہمارے زمانے کے جوان کس طرح حضرت یوسفؑ کی تاسی کر سکتے ہیں؟

○ حضرت یوسفؑ جس صورتحال سے دوچار ہوئے‘ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں‘ تو پتا چلتا ہے کہ انہیں ہمارے زمانے کے نوجوان کی نسبت کہیں زیادہ سخت اور انتہائی دشوار صورتحال کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ کیونکہ موجودہ زمانے میں فریب اور گمراہی کے وسیع مواقع کی طرف نوجوان اپنے شوق اور ارادے سے قدم اٹھاتے ہیں‘ اور اکثر مواقع پر وہ یہ راہ طوعاً و کرہاً

اختیار نہیں کرتے اور ان سے ان کی آزادی اور اختیار سلب نہیں کیا جاتا۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کو اس عورت کے شوہر نے خرید کر اپنا غلام بنایا تھا' جو رات دن آپ کے ساتھ رہتی ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ از خود بغیر کسی بیرونی مداخلت کے اس عورت کی طرف سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ کسی نے بھی یہ نہیں کہا کہ حضرت یوسفؑ نے اس کے حسن و جمال کی طرف کسی رغبت کا اظہار کیا اور ان کی شخصیت میں موجود جنسی خواہش بیدار ہوئی۔ یہ تمام باتیں اس بات کی علامت ہیں کہ حضرت یوسفؑ اس حالت کی مخالف ذاتی عصمت کے مالک تھے۔

ممکن ہے کوئی یہ کہے کہ حضرت یوسفؑ کیونکہ غلام تھے اس لیے ان میں اپنی مالکن سے دست درازی کی جرأت نہ تھی۔ یعنی حضرت یوسفؑ اور اس عورت کے درمیان ایک داخلی حجاب حائل تھا جس نے انہیں اس عمل کے ارتکاب سے روکے رکھا۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ اگرچہ یہ حجاب بعض مواقع پر رکاوٹ ثابت ہوتا ہے لیکن لمبے عرصے تک موثر نہیں رہتا' بالخصوص جب خود عورت ارتکابِ گناہ پر آمادہ ہو۔

پردۂ ایمانی

حضرت یوسفؑ نے جس صورتِ حال کا شدت کے ساتھ مقابلہ کیا۔ یعنی عزیز مصر کی بیوی کی ناجائز خواہش کو جس سختی سے مسترد کیا' اس سے واضح ہوتا ہے کہ آپ کے اس اجتناب کا سبب کوئی داخلی حجاب نہ تھا' بلکہ جو چیز حائل ہوئی وہ ایمانی رکاوٹ تھی۔ لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ اللہ رب العزت فرماتا ہے: وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ وَ هَمَّ بِهَا لَوْ لَآ اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ (اور یقیناً اس عورت نے ان سے برائی کا ارادہ کیا اور وہ بھی ارادہ کر بیٹھتے' اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۲۴)

بعض لوگ اس آیت کی یہ تفسیر کرتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ نے اس عورت سے برائی کا قصد کرلیا تھا' لیکن جس تفسیر کی جانب ہمارا جھکاؤ ہے اور جسے ہم قرآنی بیان کے نزدیک ترین سمجھتے ہیں' وہ یہ ہے کہ حضرت یوسفؑ محض غیر شعوری طور پر اسکی جانب مائل ہوئے تھے' بالکل اسی طرح جیسے انسان اپنی پسندیدہ غذا کی طرف راغب ہوتا ہے اور اس موقع پر غیر شعوری طور پر بھوک محسوس کرتا ہے' لیکن یہ میل اور رغبت دیر پا نہیں ہوتی' کیونکہ یہ غیر شعوری ہوتی ہے' ارادی اور عمدی نہیں: لَوْ لآ اَنْ رَّا بُرْهَانَ رَبِّه (اگر اپنے رب کی دلیل نہ دیکھ لیتے) یعنی اگر ان کا ایمان بیدار نہ ہو جاتا۔ لہٰذا عصمت کے معنی حرام کھانوں' مشروبات اور حرام خواہشات کی جانب سے بے رغبتی اور بے میلی نہیں' بلکہ اسکے معنی یہ ہیں کہ معصوم حرام کا ارتکاب نہیں کرتا' حرام میں ملوث نہیں ہوتا اور جبلی اور فطری رجحانات کے زیر اثر عملِ بد کا مرتکب نہیں ہوتا۔

اس داستان کی شکل وصورت اس وقت اور واضح ہو جاتی ہے جب عزیز مصر کی بیوی مصری بیگمات کی ایک محفل جماتی ہے اور وہاں ان کے سامنے حضرت یوسفؑ کو طلب کرتی ہے اور جوں ہی ان عورتوں کی نگاہ حضرت یوسفؑ کے سراپے پر پڑتی ہے' وہ بے اختیار کہہ اٹھتی ہیں: حَاشَ لِلّٰهِ مَا هٰذَا بَشَرًا اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ. (حاشا اللہ یہ تو انسان نہیں بلکہ کوئی محترم فرشتہ ہے۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۳۱)

اس موقع پر حضرت یوسفؑ کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ان کے گرد حصار تنگ سے تنگ تر ہوتا چلا جا رہا ہے' یہاں تک کہ ان سے بے اعتنائی ان کے بس سے باہر ہو جائے گی' کیونکہ اس سلسلے میں وہ اپنی پوری طاقت صرف کر چکے تھے۔

اس صورتِ حال پر توجہ کے ذریعے ہم حضرت یوسفؑ کی اس تکلیف اور اذیت کو محسوس کر سکتے ہیں جو آپ نے اس عورت کی گمراہ کن دعوت سے بچاؤ کے سلسلے میں اٹھائی تھی۔ اور یہی درد و رنج ہے جس کی بنا پر وہ خدا سے التجا کرتے ہوئے فرماتے ہیں: رَبِّ

السِّجۡنُ اَحَبُّ اِلَيَّ مِمَّا يَدۡعُوۡنَنِيۡۤ اِلَيۡهِ وَ اِلَّا تَصۡرِفۡ عَنِّيۡ كَيۡدَهُنَّ اَصۡبُ اِلَيۡهِنَّ. (پروردگار! یہ قید مجھے اس کام سے زیادہ محبوب ہے جس کی طرف یہ مجھے دعوت دے رہی ہیں اور اگر تو ان کے مکر کا رخ میری طرف سے موڑ نہ دے گا' تو میں ان کی طرف مائل ہو سکتا ہوں۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۳۳)

اخلاقی مانع

اس داستان پر غور کرنے سے پتا چلتا ہے کہ حضرت یوسفؑ کی مضبوط ایمانی شخصیت نے انہیں اس گڑھے میں گرنے سے محفوظ رکھا۔ یہ قوتِ ایمانی آپ کو اپنے پدرِ بزرگوار کی صحبت اور خداوندِ عالم کی عظمت و بزرگی کے بارے میں غور و فکر کے ذریعے حاصل ہوئی تھی۔ حضرت یوسفؑ عظیم روحانی آرزوؤں کے حامل تھے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے انتہائی شفقت اور محبت سے اپنے فرزند کی تربیت کی اور انہیں ایک مضبوط اخلاق کا مالک انسان بنانے میں کامیاب ہوئے۔ غالباً حضرت یعقوبؑ کی حضرت یوسفؑ سے والہانہ محبت کا راز بھی ان کی یہی خصوصیت تھی' نہ کہ ان کا حسن و جمال۔

جب ہم اس بات کا مطالعہ کرتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ نے کس انداز سے اپنے بچوں کی تربیت کی تو دیکھتے ہیں کہ حضرت یعقوبؑ کی بھرپور کوشش یہ تھی کہ اپنے بچوں میں ایمان کو تقویت دیں اور انہیں اطاعتِ الٰہی کا عادی بنائیں۔

پھر یہیں سے یہ بات بھی علم میں آتی ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے اپنے اس ممتاز فرزند (حضرت یوسفؑ) کو خداوندِ عالم پر ایمان سے سرشار اور پیغامِ ربانی کے راستے سے ہم آہنگ پایا اور اسی بنا پر اسے اپنے دوسرے بچوں پر فوقیت دی۔ یہ امتیاز دوسرے بچوں میں حسد کے جذبات بھڑکانے کا سبب بنا' یہاں تک کہ وہ حضرت یوسفؑ سے چھٹکارا حاصل

کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔

پیغمبرانہ روح

شاید یہ چیز ہم پر حضرت یوسفؑ کے پیغمبرانہ روح کا حامل ہونے کی وضاحت کر سکے کہ اسی وقت سے جبکہ آپ کے بھائیوں نے آپ کے خلاف سازش کے تانے بانے بنے اور آپ سے دغابازی کے مرتکب ہوئے اور اس وقت تک جبکہ آپ کو قید میں ڈالا گیا' آپ نے کسی ایک فرد سے بھی ایمان وتقویٰ کے سلسلے میں رہنمائی وہدایت حاصل نہ کی تھی' بلکہ آپ کو اندرونِ خانہ سے بھی اور معاشرے کی طرف سے بھی گمراہی کی جانب دعوت وترغیب دی گئی تھی۔

جب ہم زندان میں آپ کی قید کے عرصے پر نگاہ ڈالتے ہیں' تو آپ وہاں بھی لوگوں کو خدا کی طرف دعوت دینے میں کوشاں نظر آتے ہیں: يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ. (اے میرے قید خانے کے ساتھیو! تم ہی بتاؤ کہ متعدد خدا بہتر ہیں یا ایک خدائے واحد وقہار۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۳۹)

اس گفتگو سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ حضرت یوسفؑ دعوتی ذہنیت کے مالک تھے اور صرف اپنی اصلاح اور تہذیبِ نفس ہی کو کافی نہیں سمجھتے تھے' آپ کی کوشش ہوتی تھی کہ دوسروں کو بھی پیغامِ الٰہی سے آشنا کریں' اپنی اور اپنے معاشرے کی اصلاح کے لیے پایا جانے والا یہی دعوتی جذبہ تھا جو حضرت یوسفؑ کو یہ مؤقف اپنانے پر آمادہ کرتا تھا اور یہی وہ چیز ہے جس پر ہم ایمانی اور دعوتی جذبے کی تربیت اور نشوونما کے پروگرام بنانے کی ضرورت کے دوران تاکید کرتے ہیں۔

اس مقام پر ہم یہ کہنا ضروری سمجھتے ہیں کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے سرگرمِ عمل مومن کی جدوجہد اسے قوتِ مدافعت بخشتی ہے اور اسے دوسروں کے اثرات سے محفوظ رکھتی

ہے۔لیکن ایسا مومن جو اس سلسلے میں اہتمام نہیں کرتا اور معاشرے کی اصلاح سے لاتعلق رہتا ہے' وہ ایسی قوت اور مدافعت کا مالک نہیں ہوتا۔

حضرت یوسفؑ جو اپنی دعوت اور پیغام کے سلسلے میں ایک فعال اور متحرک انسان تھے' ہمارا اعتقاد ہے کہ اسلامی بنیاد پر ان کی تربیت اور اپنی دعوت کے سلسلے میں ان کی شعوری کوششوں نے انہیں اس مقام پر ثابت و استوار رکھا اور ان کے قدموں میں لغزش نہ آنے دی۔

ان کی ثابت قدمی اور استقلال کی وجہ یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ جن لوگوں کے درمیان وہ زندگی بسر کر رہے ہیں ان کی انہیں ہدایت و رہنمائی کرنی چاہیے' نہ کہ وہ خود ان لوگوں کے اثرات قبول کرنے لگیں۔

کیا عورت بھی ایسے کردار کی مالک ہو سکتی ہے؟

☆ یہاں تک مرد کے مضبوط کردار کی بابت گفتگو ہوئی ہے' جس کی مثال حضرت یوسفؑ تھے' عورت کے کردار کی مضبوطی اور اسکی اہمیت و اثرات کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ جب ہم حضرت یوسفؑ کے کردار کی پختگی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں' تو ہماری نظر میں (عورت کے مقابل) ایک مرد کی شخصیت نہیں ہوتی ہے' بلکہ انہیں ہم ایک مخلص' باایمان اور داعیانہ کردار کے حامل انسان کے طور پر دیکھتے ہیں' جو خدا کی طرف دعوت اور اسکی راہ میں جہاد کے راستے پر گامزن ہے۔ لہٰذا یہاں ایک مسلمان اور مومن عورت بھی ہماری مخاطب ہے۔ تاہم جو چیز ضروری ہے وہ ماحول اور معاشرے میں سالم اور درست تربیتی ماحول کی فراہمی اور حرکت اور جدوجہد کی ذہنیت کا پیدا کرنا ہے' جو مسلمان عورت اور اسی طرح مسلمان مرد کو کردار کی پختگی عطا کرے۔ پھر یہ بات بھی ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کسی کی انسانیت جانچنے کا پیمانہ یہ نہیں ہے کہ اُس نے اپنی خواہشات کی کتنی تسکین کی ہے'

بلکہ پیمانہ یہ ہے کہ اُس نے کس قدر اپنے فریضے کو ادا کیا ہے۔ اس بات کی جانب اشارہ ابن عباس کے نام امیر المومنینؑ کے ایک مکتوب میں ہوتا ہے، جس میں آپ نے تحریر فرمایا:

"فلا یکن افضل مانلت فی نفسک من دنیاک بلوغ لذة او شفاء غیظ و لکن اطفاء باطل و احیاء حق و لیکن سرورک بما قدمت و اسفک علی ماخلفت و همک فیما بعد الموت."

"خبردار تمہارے لیے دنیا کی سب سے بڑی نعمت کسی لذت کا حصول یا جذبۂ انتقام کی تسکین ہی نہ بن جائے۔ بلکہ بہترین نعمت باطل کے مٹانے اور حق کے زندہ کرنے کو سمجھو اور تمہارے لیے خوشی کا باعث وہ اعمال ہوں جنہیں تم نے پہلے بھیج دیا ہے اور تمہارے لیے باعثِ افسوس وہ سرمایہ ہو جسے صحیح مصرف کے بغیر چھوڑا ہے اور تمہاری تمام تر فکر موت کے بعد کے مرحلے کے بارے میں ہونی چاہیے۔" (نہج البلاغہ۔ مکتوب ٦٦)

اس گفتگو کو دیکھئے تو یہ تاکید کرتی نظر آتی ہے کہ انسان کی تمام تر جدو جہد اپنی خواہشات کی تسکین کے لیے نہ ہو، بلکہ اس کی پوری کوشش اپنے اوپر عائد ہونے والے فرائض اور ذمے داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہو۔ البتہ اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اپنی جبلتوں اور فطری خواہشات کا گلا گھونٹ ڈالیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ فطری خواہشات اور جبلتوں کو کنٹرول کر کے انہیں خدا پسند سمت دیں اور اس سلسلے میں خدا کی قرار دی ہوئی حدوں کا خیال رکھیں اور اس بات کو ذہن نشین رکھیں کہ ایک متحرک، فعال، خدا کے دین کی طرف دعوت دینے والے اور احکامِ الٰہی پر عمل پیرا مسلمان کی حیثیت سے دوسرے انسانوں کو جبلتوں کے تسلط سے نجات دلانا ہماری ذمے داری ہے، نہ کہ ہم خود بھی جبلتوں کے زیر تسلط آ کر اس بحران کو دوچند کر دیں۔

عقدۂ حسد

☆ سورۂ یوسف کے ایک حصے میں برادرانِ یوسفؑ کی دھوکا دہی کا تذکرہ ہوا ہے۔ یہ بات پیش نظر رکھتے ہوئے کہ حضرت یوسفؑ اور اُن کے بھائیوں نے حضرت یعقوبؑ کے زیر سایہ ایک ساتھ تربیت پائی' آپ حضرت یوسفؑ کے بالمقابل اُن کے بھائیوں کے مؤقف اور کردار کی کس طرح توجیہ کریں گے؟

○ دکھائی یہ دیتا ہے کہ بہت سے انسانوں کی مشکل یہ ہے کہ انہوں نے ایمان کو اپنے لیے ایک ازخود حاصل امتیاز سمجھا ہوا ہے۔ خواہ یہ انسان انبیا کی اولاد ہوں' ائمہ کی یا علما کی اور خواہ یہ مسلمان معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے اہلِ ایمان ہوں۔ ایمان نے ایسے لوگوں کی روح کی گہرائی اور شخصیت کے باطن میں جگہ نہیں بنائی ہوتی اور اس سے ان کا باطن سرشار اور متاثر نہیں ہوا ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نظر میں پورا کا پورا دین صرف تقلیدی طور پر محض چند مخصوص عبادی اور معنوی اعمال کی انجام دہی تک منحصر ہو کے رہ جاتا ہے۔

بصد افسوس' اخلاقی مسائل کے بارے میں یہ لوگ سنجیدگی اور گہرائی کے ساتھ توجہ نہیں دیتے' جن میں نفسانی خواہشات اور شیطانی وسوسوں کی مخالفت کی ضرورت ہوتی ہے اور جو انسان میں الٰہی اور شیطانی عناصر کے درمیان جنگ کا ایک میدان ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ یہ لوگ ان امور میں تربیت کو اپنی شخصیت کے لیے کوئی بنیادی حیثیت دینے کو تیار نہیں ہوتے۔

عصرِ ائمہؑ میں

انبیا' اولیا' علما اور مومنین کی بہت سی اولادوں میں بھی غیر اخلاقی صفات پائی جاتی ہیں۔ عصر ائمہؑ میں بھی بنی حسینؑ (جو مقامِ امامت پر فائز تھے) کے خلاف بنی حسنؑ کا مؤقف قابلِ توجہ ہے' جس سے اُن کے حسد کا پتا چلتا ہے۔ اسی طرح دوسرے ائمہؑ کے بعض

فرزندوں کا طرزِ عمل ہے۔ مثال کے طور پر انہی میں سے ایک کا ہارون الرشید کے دربار میں امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی چغل خوری کرنا اور اسی طرح امام محمد تقی علیہ السلام کے فرزند جعفر (جو جعفر کذاب کے نام سے مشہور ہے) کا منفی کردار' حسد کی نمایاں مثالیں ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ مذکورہ مثالوں میں ایک ایسی خاص حالت پائی جاتی ہے جو داخلی ماحول کو مثبت کی بجائے (بعض لحاظ سے) منفی باتوں کی پرورش کا ذریعہ بنا دیتی ہے۔ کیونکہ ایسے انسان فضائل اور اعلیٰ اخلاقی اقدار سے معمور فضا میں زندگی بسر کرنے کے باوجود' ان فضائل کے بارے میں کوئی مثبت احساس نہیں رکھتے۔

حضرت یعقوبؑ کے فرزندوں کا مسئلہ بھی یہی تھا' اس لیے کہ وہ یوسفؑ اور ان کے دوسرے بھائی (ان دس بھائیوں کی مائیں علیحدہ علیحدہ تھیں) کے حوالے سے ایک نفسیاتی کمپلکس کا شکار تھے۔

حضرت یعقوبؑ اپنے دوسرے فرزندوں کی نسبت حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائی (بنیامین) سے زیادہ جذباتی لگاؤ رکھتے تھے اور ان دو کو ان دس پر مقدم رکھتے تھے۔ لہٰذا ان کے بقیہ فرزندوں کا ان سے حسد میں مبتلا ہو جانا شاید اسی جذباتی تفریق کا نتیجہ قرار دیا جا سکے۔

دوسرا قابلِ ذکر امکان یہ ہو سکتا ہے کہ حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائی (بنیامین) کی کامیابیاں ان کے دوسرے بھائیوں کے دل میں ان کے خلاف حسد کی وجہ بنی ہوں اور وہ انہیں نقصان پہنچانے کے بارے میں سوچنے لگے ہوں۔

اگر یہاں کوئی یہ سوال کرے کہ وہ پیغمبر تھے (پس کیوں ایسے طرزِ عمل کے مرتکب ہوئے) تو اس کا جواب یہ ہے کہ ان کا پیغمبر ہونا ثابت نہیں۔ غالباً قرآنِ کریم سے بھی یہ بات اخذ نہ کی جا سکے۔ تاہم یہ ممکن ہے کہ اپنے طرزِ عمل کی خرابی کا علم ہو جانے کے بعد وہ نیک اور صالح انسان بن گئے ہوں اور اس نفسیاتی کمپلکس سے چھٹکارا حاصل کر لیا ہو۔

دعوت کے دوران

مذکورہ بالا گفتگو کی روشنی میں، ہم اپنے معاشرے کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے، اپنے فریضے کو واضح کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اس بات کو بنیادی عنوان سے پیشِ نظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ علما، مومن والدین اور صالح رہنما و قائدین (معاشرے اور گھر) کی عمومی ایمانی فضا سے مطمئن ہو کے نہ بیٹھ جائیں۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ وہ سوچنے لگیں کہ ان کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت اور اصلاح کے لیے ایسے مومن معاشرے میں زندگی بسر کرنا ہی کافی ہے جو انہیں سیدھے اور صحیح راستے پر لگا دے۔ بلکہ انہیں لازماً تربیت اور رہنمائی کے ایسے جدید طریقوں سے استفادے کی کوشش کرنی چاہیے جو ان جوانوں کے لیے تازگی اور کشش کے حامل ہوں، تا کہ وہ شوق و رغبت کے ساتھ راہِ راست اختیار کریں۔ یہ کام مختلف طریقوں اور طرح طرح کے حالات سے استفادے کے ذریعے انجام پائے گا۔

ہمارا خیال ہے کہ ایمان کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کر کے، ان طریقوں میں جدّت پیدا کر کے اور اس مقصد کے لیے مختلف مواقع پیدا کر کے مومن معاشرے کی فضا کو یکسانیت اور روٹین (routine) سے باہر نکالنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ یہ یکسانیت اس بات کا موجب ہوتی ہے کہ ہمارے نزدیک یہ اہم اور حساس مسائل بھی زندگی کے ایسے روزمرہ مسائل کی مانند ہو جاتے ہیں جن کے بارے میں ہم غور و فکر نہیں کرتے اور جن سے بے اعتنا رہتے ہیں۔

حسد کا کوئی فائدہ نہیں

ہمیں سورۂ یوسف سے اس تربیتی مفہوم کو سمجھنے کی ضرورت ہے، تا کہ ہم حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی داستان کے ذریعے حاسد میں اُسکے خلاف جذبۂ عداوت بھڑکانے کے سلسلے میں حسد کی تاثیر کو جان سکیں جس سے وہ حسد کرتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ہر چند برادرانِ یوسف حضرت یوسف اور ان کے بھائی (بنیامین) سے حسد میں مبتلا تھے اور انہیں قتل کرنے یا نقصان پہنچانے کے لیے منصوبے بناتے تھے لیکن اس داستان کا نتیجہ بتاتا ہے کہ انہیں اس تگ ودو سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

جب حضرت یوسفؑ ان کے ساتھ احترام سے پیش آتے ہیں' انہیں اپنے پاس بلاتے ہیں اور جب خداوند عالم ان کے والد اور بھائیوں کو طویل جدائی کے بعد اکھٹا کر دیتا ہے' تو آپ کمالِ بزرگواری کا مظاہرہ کرتے ہوئے انہیں اپنے گلے لگا لیتے ہیں۔ اب برادرانِ یوسف پر ظاہر ہوتا ہے کہ یوسفؑ تو بڑے وسیع النظر انسان ہیں' ایسا بلند مقام اور منصب پا لینے کے باوجود وہ ذرا نہیں بدلے اور انہوں نے بدسلوکی اور جیسے کو تیسے کا رویہ نہیں اپنایا' بلکہ وہ اپنی پیغمبرانہ شخصیت کے تقاضے کے مطابق انہیں اپنے پاس بلاتے ہیں اور درگاہِ خدا میں اپنے اور اپنے بھائیوں کے حق میں دعا کرتے ہیں۔

وہ لوگ جو نیک اور پاکباز' متحرک اور فعال انسانوں سے حسد کرتے ہیں (خواہ وہ لوگ ان کے اقربا ہوں یا اجنبی افراد) انہیں یہ بات سوچنی چاہیے کہ وہ کس طرح ابتدا ہی میں ایسے انسانوں کی شخصیت سے اپنے پسندیدہ مثبت اور درست نتائج حاصل کر سکتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ اگر برادرانِ یوسف' حضرت یوسفؑ سے صاف وشفاف میل جول رکھتے' باہم گفت وشنید کرتے' تو لازماً اس معنوی عنصر کو کشف کر لیتے جس سے حضرت یوسفؑ کی ذات مالا مال تھی اور یہی بات ان کی ان بہت سی نفسیاتی پیچیدگیوں کو حل کر دیتی جو حضرت یعقوبؑ کی حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائی (بنیامین) کی جانب خاص توجہ اور مخصوص لگاؤ کو دیکھ کر ان میں پیدا ہوئی تھیں اور ممکن ہے یہ پیچیدگیاں وجود میں ہی نہ آتیں۔

یہ بات ہر انسان کو اپنی گرہ میں باندھ لینی چاہیے کہ حسد کا کوئی عملی نتیجہ برآمد نہیں ہوتا اور نہ ہی یہ محسود (جس سے حسد کیا جائے) کو دشواریوں میں مبتلا کرنے کی ان کی آرزو کو پورا کرتی ہے۔ خاص طور پر اگر وہ مضبوط ایمان کا مالک ہو اور یہ عقیدہ رکھتا ہو کہ خداوند عالم ہر

عامل سے بالاتر ہے اور وہی ہے جو انسانوں میں تغیر و تحول ایجاد کرتا ہے‘ وہی ہے جو دلوں کو منقلب کرتا ہے‘ معاملات اور امور کی تدبیر اسی کے ہاتھ میں ہے۔

لہٰذا حاسدوں کا حسد دوسروں پر کوئی منفی اثر نہیں ڈال سکتا‘ اُن کی دشمنی کسی کو اُس وقت تک کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تک خدا نہ چاہے‘ کیونکہ کائنات میں کچھ بھی اذن و ارادۂ الٰہی کے بغیر واقع نہیں ہوتا۔

حاسد کو ذرا سوچنا چاہیے

کتنا اچھا ہو کہ حاسد ہماری معروضات پر سوچ بچار کرے اور اپنی فکر اس نکتے پر مرکوز کرے کہ خداوند عالم کا خزانہ انتہائی وسیع اور لامحدود ہے اور وہ محسود کو بخشی ہوئی کسی چیز میں کمی کیے بغیر اسی طرح کی چیز حاسد کو بھی عطا کرسکتا ہے۔ پس اس کے لیے بہتر ہے کہ وہ حسد کی بجائے غبطہ (رشک) کرے۔ اور غبطہ کے معنی یہ ہیں کہ انسان خدا سے تمنا کرے کہ اس نے فلاں شخص کو جو کچھ عطا کیا ہے‘ اسکی مانند یا اس سے بھی زیادہ اور بہتر مجھے عطا فرمائے۔

لہٰذا ہمارے خیال میں اس قصے (یوسفؑ اور برادرانِ یوسف کی داستان) کو حسد کے آغاز اور انجام کے درمیان فرق کے اسباب جاننے کے لیے ایک زندہ نمونہ ہونا چاہیے۔ خاص کر اپنے بھائیوں کی خیانت پر حضرت یوسفؑ کے ردِعمل کا جائزہ لے کر‘ نیز اس حقیقت کے بارے میں غور و فکر کر کے کہ خداوندِ عالم نے کس طرح حضرت یوسفؑ کو انتہائی برے حالات سے (جبکہ وہ موت کے منھ میں پہنچ چکے تھے‘ اور انہیں غلاموں کی منڈی میں پہنچا دیا گیا تھا) نجات دلا کر ایک بلند مقام سے ہمکنار کیا‘ انہیں شاندار منصب عطا کیا‘ یہاں تک کہ وہ مصر کے حاکم بن گئے۔ حضرت یوسفؑ ان الفاظ کے ذریعے اسی بات کی جانب اشارہ فرماتے ہیں:

”رَبِّ قَدْ اٰتَيْتَنِيْ مِنَ الْمُلْكِ وَ عَلَّمْتَنِيْ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ اَنْتَ وَلِیّٖ فِی الدُّنْیَا وَ الْاٰخِرَۃِ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ اَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ."

"پروردگار تو نے مجھے ملک بھی عطا کیا اور خوابوں کی تعبیر کا علم بھی دیا' تو زمین اور آسمانوں کا پیدا کرنے والا ہے اور دنیا اور آخرت میں میرا ولی اور سرپرست ہے' مجھے دنیا سے فرمانبردار اٹھانا اور صالحین سے ملحق کر دینا۔"

(سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۱۰۱)

ان الفاظ کے ذریعے حضرت یوسفؑ اس احساس کا اظہار کرتے ہیں کہ ان تمام امور میں خداوندِ عالم کا فضل و کرم ان کے شاملِ حال تھا۔

حاسد انسان کو محسود کے خلاف سازش اور منصوبہ بندی سے قبل حضرت یوسفؑ کے قصے پر غور و فکر کرنا چاہیے۔ اسے سمجھ لینا چاہیے کہ خداوندِ تبارک و تعالیٰ اپنے مومن و مخلص بندے کے مقام اور مرتبے کو اس قدر بلندی تک پہنچا سکتا ہے کہ حاسد آرزو کرنے لگے کہ اے کاش وہ اپنی اسی پہلی حالت پر باقی رہتا تاکہ میں اسکی اس ترقی اور درجات کی بلندی کی وجہ سے روحانی اذیت کا شکار نہ ہوتا۔ حاسد کو حسد سے باز رہنا چاہیے' تاکہ محسود کی ترقی اور درجات کی بلندی اس میں روحانی اذیت وجود میں لانے کا سبب نہ بنے۔

اس ناپسندیدہ عادت کا شکار وہ تمام لوگ جو راہِ خدا میں سرگرمِ عمل ہیں' چاہے وہ علما میں سے ہوں یا ان کا تعلق مومنین سے ہو' انہیں اپنی اس مومنانہ جدوجہد کے راستے میں وسیع النظر اور وسیع القلب ہونا چاہیے اور یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ:

"الحسد یاکل الایمان کما تاکل النار الحطب."

"حسد ایمان کو اسی طرح کھا جاتا ہے جس طرح آگ خشک لکڑی کو۔"

روحانی ضعف

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ برادرانِ یوسف کے اس نامناسب طرزِ عمل کی وجہ ان کا مفاہیم (خواب کی تعبیر وغیرہ) سے مکمل طور پر آگاہ نہ ہونا تھا۔ جبکہ کچھ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ان کے اس طرزِ عمل کی وجہ ان کا روحانی ضعف تھا۔ آپ کیا فرماتے ہیں؟

○ خواہ وہ مفاہیم (خواب کی تعبیر وغیرہ) سے مکمل طور پر آگاہ رہے ہوں یا ان کی آگہی ناقص ہو' بہرصورت روحانی پہلو اس مسئلے کا بنیادی پہلو ہے۔ کیونکہ ایک مسلمان کی زندگی کو صحیح سمت پر لگانے اور اسی راستے پر گامزن رکھنے کے لیے صرف مکمل آگہی ہی کافی نہیں' بلکہ اس سلسلے میں بنیادی کردار اس کے روحانی پہلو کو حاصل ہے۔ کیونکہ انسان کی حرکت اور عمل اس کے روحانی پہلو سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہی پہلو ہے جو اسے زندگی کے اہم مسائل میں سختیوں اور محرومیوں پر تحمل کی قدرت بخشتا ہے اور یہی روحانی پہلو اور اخلاقی امور کی پابندی ہے جو اسے الٰہی فرائض کی بجاآوری پر آمادہ کرتی ہے۔

اس بنیاد پر ہمارا خیال ہے کہ معنوی اور روحانی پہلو ہی اس مسئلے کی بنیاد اور اساس ہے۔ اسی بنا پر ہم نے ابتدا میں کہا تھا کہ ایسے افراد جو دینی ماحول میں زندگی بسر کرتے ہیں اور جنہوں نے دین کو تقلیدی اور موروثی طور پر اپنایا ہوا ہے اور وہ دین کو اپنی ذاتی جاگیر سمجھتے ہیں (جس میں کسی دوسرے کو دخل اندازی کی اجازت نہیں) اور یہی وجہ ہے کہ بعض لوگ جب اپنے علما کو متوجہ کرتے ہیں' اور انہیں ان کے منفی طرزِ عمل سے آگاہ کرتے ہیں' تو وہ بھڑک اٹھتے ہیں اور ان لوگوں سے اظہارِ ناراضگی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم ہمیں پڑھاتے ہو' جبکہ تمہیں جو کچھ آتا ہے وہ ہمارا سکھایا ہوا ہے اور ہم ہی تمہیں وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ یہ علما ان لوگوں سے زیادہ علم و ادراک کے مالک ہوتے ہیں لیکن افسوس کہ عملی لحاظ سے اخلاقی مسائل کی زیادہ پابندی کا مظاہرہ نہیں کر پاتے۔

دوستی کا مناسب ماحول

☆ فرمانِ الٰہی ہے کہ: اَلْاَخِلَآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ. (آج کے دن صاحبانِ تقویٰ کے علاوہ تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہو جائیں گے۔ سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ٦٧)۔ اس آیۂ کریمہ کو پیشِ نظر رکھا جائے' تو دوستوں کے انتخاب کا مسئلہ جوانوں کے لیے انتہائی درجہ اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ آپ اس بارے میں کن بنیادوں کا تعین کرتے ہیں؟

O صرف جوانوں ہی کی بات نہیں بلکہ ہر باایمان شخص پر لازم ہے کہ اپنے لیے ایک ایسے ماحول کا انتخاب کرے جہاں اس کا ایمان تقویت اور نشو ونما پائے۔

یہ معاملہ بالکل بیج کی بوائی کے معاملے کی مانند ہے۔ یعنی اگر اسے نامناسب زمین اور غیر موافق ماحول میں بو دیا جائے' تو اس کی فطری نشو ونما نہیں ہو سکے گی۔ چاہے اسکی نشو ونما کے لیے بہت سے غیر قدرتی ذرائع کام میں لائے جائیں اور یہ اسے تناور درخت بنا دیں اور اسکی بقا کا ذریعہ بن جائیں' لیکن اس کے باوجود یہ مصنوعی ذرائع اس کے معنوی پہلو اور اس کی قدرتی خاصیت فراہم کرنے پر قادر نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ غیر فطری ذرائع اور غیر قدرتی فضا میں بڑھنے والے نباتات میں وہ خصوصیات نہیں پائی جاتیں جو قدرتی فضا میں اور فطری وسائل کے ذریعے نشو ونما پانے والے نباتات کا خاصّہ ہیں۔ لہٰذا مومن انسان کے لیے بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے رہن سہن کے لیے فطری فضا اور ماحول فراہم کرے' تاکہ وہاں اس کا ایمان نمو اور افزائش پا سکے۔

اس مقام پر ہمیں اسلام کی وہ ہدایت نظر آتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ مرد کو دیندار عورت سے اور عورت کو ایسے مرد سے شادی کرنی چاہیے جس کے دین واخلاق کی طرف سے اسے اطمینان ہو۔ کیونکہ گھر کی فضا ایمان کی نشو ونما کا گہوارہ ہے۔

اسی طرح اسلام کی یہ ہدایت بھی نظر آتی ہے جس میں "خضراء الدمن" سے رشتہ استوار کرنے کو منع کیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے:

"ایاکم وخضراء الدمن.... قالوا: وماخضراء الدمن؟
قال: المراة الحسناء فی منبت السوء."

"کوڑے کرکٹ پر اُگنے والی سبزی سے پرہیز کرو۔ پوچھا گیا: کوڑے کرکٹ پر اگنے والی سبزی سے کیا مراد ہے؟ فرمایا: ایسی خوبصورت عورت جس کی پرورش خراب ماحول میں ہوئی ہو۔"

یہ تاکید اس بنا پر ہے کہ برا ماحول اس عورت کے ایمان کی فطری نشو ونما نہیں ہونے دیتا اور قدرتی طور پر اس کے اخلاق پر بھی ناخوش آئند اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ اسی طرح جیسے آلودہ زمین میں کاشت کی جانے والی سبزیوں میں اس زمین کی آلودگیاں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔

اس مقام پر انسانوں کو آپس میں ملانے والے ایک اور جذباتی بندھن کے عنوان سے دوست اور ہم نشین کا کردار سامنے آتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسانی زندگی پر فکر و شعور سے زیادہ جذبات و عواطف اثر انداز ہوتے ہیں۔ کیونکہ فکر کا تعلق عقیدے اور ایمان سے ہوتا ہے اور کسی کا اپنے عقیدے اور ایمان کو دوسرے میں منتقل کرنا اس وقت تک مشکل ہے جب تک مقابل کے اندر انہیں قبول کرنے کے سلسلے میں نرم گوشہ پیدا نہ کر لیا جائے۔ لیکن جذباتی اور عاطفی پہلو انسان کے شعور و احساس کو اس حد تک متاثر کر سکتا ہے کہ ممکن ہے وہ اپنی فکر سے غافل ہو جائے اور اس کے نتیجے میں جذبات کبھی کبھی انسان کی فکر پر بھی غالب آ جاتے ہیں اور مقابل کو اس طرح زیر اثر لے لیتے ہیں کہ آخر کار وہ اپنی فکر سے دست بردار ہو کے دوسرے کی فکر قبول کر لیتا ہے۔

روابط میں جذبات وعواطف کا کردار

ہمیں بہت سے جوان نظر آتے ہیں جو کچھ جذباتی عوامل کی وجہ سے بعض ایسی پارٹیوں او گروہوں کی جانب مائل ہو جاتے ہیں جو ان کی فکر اوردین سے موافق نہیں ہوتیں۔ یہ صورتحال کبھی تو دوستانہ روابط اور صحبت کے اثر سے وجود میں آتی ہے اور کبھی اس کی وجہ جنسِ مخالف کی جانب رغبت ہوتی ہے۔

ان پارٹیوں سے وابستہ ہو جانے والے بہت سے لوگ جب ان میں اپنی شمولیت کے محرکات کے بارے میں غور وفکر کرتے ہیں' تو ان پر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ ان کا ان پارٹیوں کی جانب رجحان' ان جذباتی عوامل کا نتیجہ تھا جو انہوں نے اپنے کسی دوست یا ہم نشین سے قبول کیے تھے۔

اس بنیاد پر مومن انسان کو چاہیے کہ اپنے لیے ایسے دوست کا انتخاب کرے جس سے میل ملاپ اسکے ایمان کی تقویت اور نشو ونما کا موقع بھی فراہم کرے۔ لہٰذا لازم ہے کہ نادان کی صحبت سے پرہیز کیا جائے۔ کیونکہ نادان اپنے جہل کے ذریعے جلد یا بدیر اپنے دوست کو گمراہ کردے گا۔

اسی طرح ''احمق'' سے بھی دوستی نہیں رکھنی چاہیے' جس کی زندگی توازن اوراعتدال سے محروم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسا بے وقوف دوست' حدیث کے بقول: یضرک فی الوقت الذی یرید فیه ان ینفعک . (تمہیں فائدہ پہنچانا چاہے گا لیکن عین اسی وقت (نہ چاہتے ہوئے بھی) تمہیں نقصان پہنچا بیٹھے گا)

فاسق سے بھی دوستی کا رشتہ استوار نہ کرنا' کیونکہ دوستانہ ماحول کی وجہ سے اسکی بری عادات واطوار اور ناپسندیدہ آداب وافعال کو نظر انداز کرنے لگو گے اور اس طرح تم بھی گناہ سے آلودہ ہو جاؤ گے۔

کافر کو بھی دوستی کے لیے منتخب نہیں کرنا چاہیے اور اسے دوست بنا کے اپنے ذہن کے دروازوں کو اسکے کفر آلود افکار کے لیے نہیں کھول دینا چاہیے۔ یہاں تک کہ اسکے افکار و عقائد معمولی دکھائی دینے لگیں اور انسان انہیں مسترد کرنے کے بارے میں سوچ بچار نہ کرے۔

اسکے برعکس لازم ہے کہ عاقل اور ایسے باایمان شخص کو دوستی کے لیے منتخب کیا جائے جس کے قلب اور روح کی گہرائیوں میں ایمان جاگزیں ہو۔ تاکہ آپ نے جو راہ حیات اپنائی ہے' آپ کا دوست اپنے تمام تر اثرات کے ساتھ اس سے مختلف راہ حیات پیش نہ کرے' بلکہ دونوں ایک ہی راہ کے مسافر اور ایک ہی منزل کے راہی ہوں۔

بُرے دوستوں سے پرہیز

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ دوست جذبات وعواطف کے ذریعے اپنے دوست پر مثبت یا منفی اثرات ڈالتا ہے۔ لہٰذا دوستی انسان کی زندگی کے لیے ایک انتہائی اہم مسئلے کی حیثیت رکھتی ہے' اور اس مفہوم کو ہم قرآنِ کریم کی اس آیت میں پاتے ہیں جس میں بتایا گیا ہے کہ روزِ قیامت انسان اپنے دنیوی اعمال کا نتیجہ دیکھنے کے بعد یہ کہے گا کہ:

"وَ یَوْمَ یَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰی یَدَیْهِ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِی اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِیْلاً یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلاَنًا خَلِیْلاً لَقَدْ اَضَلَّنِیْ عَنِ الذِّکْرِ بَعْدَ اِذْ جَآئَنِیْ وَ کَانَ الشَّیْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلاً۔"

"اس دن ظالم اپنے ہاتھوں کو کاٹے گا اور کہے گا کہ کاش میں نے رسول کے ساتھ ہی راستہ اختیار کیا ہوتا۔ ہائے افسوس' کاش میں نے فلاں شخص کو اپنا دوست نہ بنایا ہوتا۔ اس نے تو ذکر کے آنے کے بعد بھی مجھے گمراہ کر دیا اور شیطان تو انسان کو رسوا کرنے والا ہے ہی۔"

(سورۂ فرقان ۲۵۔ آیات ۲۷ تا ۲۹)

خداوندِ عالم کی پیش کی ہوئی اس مثال میں ہم ایک ایسے انسان کو پاتے ہیں جو دنیا میں اپنی گمراہی اور کج روی پر حسرت وندامت کا اظہار کرتا ہے۔ اسکی تباہی اور نامرادی کی وجہ ایسے دوستوں کا اثر قبول کر لینا ہے جو گمراہی اور برے کاموں کو اسکے سامنے سجا سنوار کر پیش کرتے تھے اور اسکے جذبات واحساسات کو اپنے قابو میں کیے ہوئے تھے' جس کے نتیجے میں یہ انسان خدا کی رحمت سے محروم ہو جاتا ہے۔

ایک قرآنی مثال

اگر ہم اس موقع پر چند مثالیں پیش کریں' تو یہ بات واضح ہوتی ہے کہ قرآنِ کریم میں تابع اور متبوع' پیرو اور پیشوا کے الفاظ عام معنی میں استعمال ہوئے ہیں۔ کبھی کبھی یہ پیروی استکبار واستضعاف کا سبب بن جاتی ہے۔ لیکن ہم ان دو عنوانات سے جامع ترین معنی اخذ کر سکتے ہیں اور انسانوں کی ہر قسم کی اطاعت وپیروی کو اسکے دائرے میں شامل کر سکتے ہیں' خواہ وہ احساسات اور عواطف کے زیر اثر بیوی کا شوہر کی اطاعت کرنا ہو' یا شوہر کا بیوی کی' یا اسی طرح ایک دوست کا دوسرے دوست کی پیروی کرنا ہو:

" اِذۡ تَبَرَّاَ الَّذِیۡنَ اتُّبِعُوۡا مِنَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا وَ رَاَوُا الۡعَذَابَ وَ تَقَطَّعَتۡ بِہِمُ الۡاَسۡبَابُ وَ قَالَ الَّذِیۡنَ اتَّبَعُوۡا لَوۡ اَنَّ لَنَا کَرَّۃً فَنَتَبَرَّاَ مِنۡہُمۡ کَمَا تَبَرَّءُوۡا مِنَّا کَذٰلِکَ یُرِیۡہِمُ اللّٰہُ اَعۡمَالَہُمۡ حَسَرٰتٍ عَلَیۡہِمۡ وَ مَا ہُمۡ بِخٰرِجِیۡنَ مِنَ النَّارِ. "

"اس وقت جبکہ پیشوا اپنے پیروکاروں سے بیزاری کا اظہار کریں گے اور سب کے سامنے عذاب ہوگا اور تمام وسائل منقطع ہو جائیں گے اور پیروکار یہ بھی کہیں گے کہ اے کاش ہم نے ان سے اسی طرح بیزاری اختیار کی ہوتی جس طرح یہ آج ہم سے اظہارِ بیزاری کر رہے ہیں۔ خدا ان سب کے

اعمال کو اسی طرح حسرت بنا کر پیش کرے گا اور ان میں سے کسی کو بھی جہنم سے چھٹکارا نہیں ملے گا۔" (سورۂ بقرہ ۲۔ آیات ۱۶۶' ۱۶۷)

یہاں ہم دیکھتے ہیں کہ قرآنِ کریم زور دے کر یہ بات کہہ رہا ہے کہ خود پیروکار ہی جوابدہ ہوں گے' خواہ انہوں نے جذباتی یا مادّی دباؤ کے زیرِ اثر ہی گمراہ فرد کی پیروی کی ہو۔

قرآنِ کریم انسانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ وہ مذکورہ تجربے سے استفادہ کریں' اس سے نصیحت حاصل کریں' عبرت پکڑیں اور ایسی فضا سے چھٹکارا حاصل کریں جو اُن پر ایسا دباؤ مسلط کر دیتی ہے۔ ہم اس مفہوم کو قرآنِ کریم کی ایک دوسری آیت سے اخذ کرتے ہیں جس میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَفّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِيْٓ اَنْفُسِهِمْ قَالُوْا فِيْمَ كُنْتُمْ قَالُوْا كُنَّا مُسْتَضْعَفِيْنَ فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اَلَمْ تَكُنْ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ وَ سَآءَتْ مَصِيْرًا."

"جن لوگوں کو فرشتوں نے اس حال میں اٹھایا کہ انہوں نے اپنے نفس پر ظلم کیا تھا اور ان سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ ہم زمین میں کمزور بنا دیے گئے تھے فرشتوں نے کہا کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم ہجرت کر جاتے۔ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین منزل ہے۔" (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۹۷)

لہٰذا جب خداوندِ سبحان ان نامراد لوگوں کو ان کی گمراہی اور مستکبروں کے ساتھ ان کی ہمراہی کی وجہ سے مواخذے کے قابل سمجھتا ہے' تو قدرتی بات ہے کہ ان سے چاہتا ہے کہ وہ گمراہی کا سبب بننے والے ماحول سے دور رہیں' تاکہ اس ماحول کا دباؤ انہیں گمراہ نہ کر دے۔ اس اشارے کے ذریعے یہ آیت رہنمائی کرتی ہے کہ ہر انسان کو ایسے جذباتی یا مادّی دباؤ میں آنے سے خود کو بچانا چاہیے جس سے اسکے گمراہ ہو جانے کا امکان ہو

اور اگر اُسے ایسے دباؤ سے بچنا محال نظر آتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ اس زہریلے ماحول سے دوری اختیار کرے تاکہ نجات پاسکے۔

قرآنِ کریم لوگوں کے باہمی عمومی روابط اور ان کے ایک دوسرے پر اثر انداز ہونے کے باب میں مذکورہ تربیتی اسلوب پیش کرتا ہے اور انہیں دوسروں کی فکر کے سامنے نہ جھکنے، فکری استقلال پر قائم رہنے، اندھی تقلید سے پرہیز، دباؤ کے ماحول سے دوری اور ایمان کی حفاظت کے لیے ٹھوس اور بنیادی سعی و کاوش کی ہدایت کرتا ہے۔

دوست میدانِ حشر میں

اس مقام پر ہم اس آیۂ کریمہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جس میں ارشادِ رب العزت ہے:

"اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ."

"آج کے دن صاحبانِ تقویٰ کے سوا تمام دوست ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے۔" (سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۶۷)

کیونکہ اس دنیا میں برقرار ہونے والی دوستیوں کے بارے میں عالمِ آخرت میں جوابدہ ہونا پڑے گا، اور وہاں ان تمام دوستوں کا مواخذہ کیا جائے گا جو دنیا میں لہو ولعب، خیانت و گمراہی اور کفر و شرک کے معاملات میں باہم شریک تھے۔ اور انہیں اپنے حتمی مقدر کا سامنا کرنا پڑے گا، اور ایک کو دوسرے کی گمراہی کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔ اور یوں ایسا شخص جو دنیا میں اپنے کسی دوست کے زیرِ اثر انحراف اور گمراہی کی راہ پر چل پڑا ہوگا، جب روزِ قیامت اس پر انکشاف ہوگا کہ اس کا یہ دوست درحقیقت دوستی کے لبادے میں اس کا دشمن تھا، تو یہ حقیقت جان کر وہ اس سے الجھ پڑے گا، اسکے دل میں اسکے لیے عداوت اور عناد پیدا ہوجائے گی اور گزشتہ دوستی دشمنی میں تبدیل ہوجائے گی۔

لیکن وہ پرہیزگار افراد جو دنیا میں نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے معاون اور مددگار رہے ہوں گے، فرامینِ الٰہی کے سامنے خاضع اور سر جھکائے رہے ہوں گے، جن کی پیشانیاں خدا کے سامنے سربسجود رہی ہوں گی اور جو ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کرتے رہے ہوں گے، قدرتی بات ہے کہ ان کی دوستی آخرت میں بھی قائم اور پائیدار رہے گی، کیونکہ دنیا میں ان کا بندھن صالح بندھن تھا، جو محض اس دنیا تک محدود نہیں رہتا بلکہ سرائے آخرت میں بھی جاری رہتا ہے۔

دوستوں کے حقوق

☆ عوام الناس میں مشہور ہے: **الصدیق عندالضیق**۔ (دوست وہ ہے جو برے وقت میں کام آئے) یا: **فی الاسفار تعرف الاخوان**۔ (دوستی سفر میں پہچانی جاتی ہے) اسی طرح کی اور بھی کہاوتیں معاشرے میں رائج ہیں۔ آپ فرمائیے کہ ایک دوست کے دوسرے دوست پر کیا حقوق ہوتے ہیں؟

○ درحقیقت دوستی اور رفاقت دو افراد کے درمیان احساس کی یگانگت کی ایک صورت ہے۔ لہٰذا جب لوگ دوستی کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو درحقیقت ایثار اور وفا موضوعِ بحث ہوتا ہے۔ شاید وہ ضرب الامثال جن میں کہا گیا ہے کہ ''دوست وہ ہے جو برے وقت میں دوست کے کام آئے'' یا ''دوست کو پہچاننا ہو تو سفر میں پہچانو'' اس بات کی عکاس ہوں کہ بدحالی اور سفر وہ دو حالتیں ہیں جن میں انسانوں کے جوہر کھلتے ہیں، ان کی اصلیت سامنے آتی ہے۔

جب ہم دائرۂ ایمان میں دوستی کے بارے میں غور و فکر کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ اسلام مومن انسان پر فرض عائد کرتا ہے کہ اپنے مومن بھائی سے اس کا تعلق کشادہ روئی پر مبنی ہو، وہ اس کا مونس و غمخوار بنے، اس سے سختیاں دور کرے، اسکی ضروریات کا خیال رکھے، تمام

معاملات میں اسکی مدد کے لیے آگے بڑھے اور اسکی جان' مال' عزت وآبرو کی حفاظت کرے۔ لہٰذا ایمانی اخوت کے اعتبار سے (جو دوستی کے بندھن کی مضبوطی کو دو چند کردیتی ہے) مومن انسان پر واجب ہے کہ مشکلات' دشواریوں اور زندگی میں پیش آنے والے سخت حالات میں اپنے مومن بھائی کی مدد اور اس سے تعاون کے لیے بلا تاخیر قدم اٹھائے۔

نماز کی تاکید

☆ قرآنِ کریم میں آیا ہے: وَ اْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ. (اور اپنے اہل کو نماز کا حکم دیں۔ سورۂ طہٰ ۲۰۔ آیت ۱۳۲) اس حکم کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟ بالفاظِ دیگر آیا کسی کے حکم پر پڑھی جانے والی نماز سے وہ آثار ونتائج حاصل ہوسکتے ہیں جن کا وعدہ کیا گیا ہے؟

○ یہاں امر سے مراد امر کے لغوی معنی نہیں ہیں' بلکہ اس جگہ امر' ہر اس عمل کو کہا گیا ہے جسے انسان اپنے مقصد کے حصول کے لیے انجام دے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ اہلِ خانہ خدا کی اطاعت اور اسکی پرستش کریں۔ نماز' خدا کی عبادت اور اس سے اخلاص کا نمایاں مظہر ہے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ تمام ذرائع کو اس امر (نماز) کی ترویج کے لیے کام میں لائے۔ اگر کبھی کلام اثر نہ کرے تو عمل کے ذریعے اپنی بات پہنچائے اور اسی طرح کبھی ترغیب اور تہدید (خوف دلانے) سے بھی کام لیا جاسکتا ہے اور کبھی مناسب فضا اور مددگار حالات فراہم کرکے' یا انسان کو نامناسب ماحول سے پرہیز کی تلقین کے ذریعے اور کبھی تربیت کے دوسرے ذرائع سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

یہاں ''امر'' کے معنی یہ ہیں کہ اس سلسلے (نماز کی ترویج) میں تمام ممکنہ وسائل سے استفادہ کیا جائے۔ البتہ یہ بات پیشِ نظر رہے کہ گفتار اور عمل کی مانند وہ دوسرے تمام وسائل جو ایک انسان دوسرے انسان کو قائل کرنے کے لیے استعمال کرتا ہے قدرتی طور پر ہمیشہ

سوفیصدی کامیاب نتیجہ نہیں دیتے۔ کیونکہ ہر چند انسان انتہائی مہارت کا مالک ہو اور اپنی فکر پر اخلاص اور ایمان رکھتا ہو لیکن اسے اس ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے جو اس انسان کو گھیرے ہوتا ہے جس کی نصیحت مقصود ہوتی ہے' اسی طرح زبانی اور عملی نصیحت کا اثر قبول کرنے کے سلسلے میں افراد کی ذہنی اور فکری خصوصیات نیز اس سلسلے کے مثبت اور منفی عوامل کی قوت اور کمزوری کو بھی مدِنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔

داعیانِ دین کی ذمے داری

اسلام داعیٔ دین' مبلغ' ناصح اور واعظ کو یہ تلقین کرنا چاہتا ہے کہ دوسروں کی ہدایت و رہنمائی' ان کے افکار میں تبدیلی اور ان کے طرزِ حیات کی اصلاح کے لیے ہر ممکن طریقے سے استفادہ ان کی ذمے داری ہے۔ اگر انہوں نے ایسا کیا' تو اس سلسلے میں اپنے فریضے سے سبک دوش سمجھے جائیں گے۔

آیتِ قرآن: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ وَ الْحِجَارَةُ. (اے ایمان والو! خود کو اور اپنے اہلِ خانہ کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ سورۂ تحریم ۶۶۔ آیت ۶) کی تفسیر میں آیا ہے کہ ائمہؑ میں سے کسی سے سوال کیا گیا: "ہم انہیں کس طرح آتشِ جہنم سے بچائیں؟ امامؑ نے فرمایا: انہیں امر و نہی کرو۔ کہا گیا: ہم انہیں امر و نہی کرتے ہیں لیکن وہ ہماری بات نہیں مانتے۔ فرمایا: اگر تم نے انہیں امر و نہی کر دی ہے' تو پھر تم اپنے فریضے سے بری الذمہ ہو گئے ہو۔"

اس شخص کے جواب میں اور اس آیت کی وضاحت کرتے ہوئے امامؑ نے امر و نہی کے سادہ معنی مراد نہیں لیے ہیں' بلکہ انہیں دو ایسے ذرائع کے طور پر پیشِ نظر رکھا ہے جو ممکن ہے کبھی گفتار' کبھی عمل اور کبھی ماحول کی صورت میں ظاہر ہوں۔ لہٰذا کہا گیا ہے کہ تم اپنے فریضے (یعنی واجبات کے لیے امر اور محرمات سے نہی) پر عمل کرو اور اگر تم نے اپنی سکت اور

طاقت کے بقدر ان وسائل وذرائع سے استفادہ کیا' تو اسکے بعد تم پر کوئی ذمے داری نہیں۔

خداوند عالم اپنے نبی کو بھی ان کی طاقت وقدرت کی حد تک ہی جوابدہ سمجھتا ہے اور انہیں اطمینان دلاتا ہے کہ اس سے زیادہ ان پر ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔ فرمانِ الٰہی ہے: اِنَّمَآ اَنۡتَ مُنۡذِرٌ وَّ لِکُلِّ قَوۡمٍ ہَادٍ. (آپ صرف ڈرانے والے ہیں اور ہر قوم کے لیے ایک ہادی اور رہبر ہے۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۷) اور ارشادِ الٰہی ہے: فَذَکِّرۡ اِنَّمَآ اَنۡتَ مُذَکِّرٌ لَسۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِمُصَیۡطِرٍ. (لہٰذا تم نصیحت کرتے رہو کہ تم صرف نصیحت کرنے والے ہو' تم ان پر مسلط اور ان کے ذمے دار نہیں۔ سورۂ غاشیہ ۸۸۔ آیت ۲۱' ۲۲) نیز فرمایا ہے: اَفَاَنۡتَ تُکۡرِہُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوۡنُوۡا مُؤۡمِنِیۡنَ. (تو کیا آپ لوگوں پر جبر کریں گے کہ سب مومن بن جائیں۔ سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۹۹) آپ میں جتنی طاقت وتوانائی ہے بس اسی حد تک مسائل کا مقابلہ کرنے اور ان سے نبردآزما ہونے کے ذمے دار ہیں اور جب آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں سے کام لے لیا اور اپنے پاس موجود امکانات سے استفادہ کرلیا' تو گویا آپ نے اپنا فریضہ ادا کردیا' اب آپ کی ذمے داری ختم ہوئی۔

اس بنیاد پر ہم کہیں گے کہ یہاں امر سے مراد محض زبانی حکم اور فرمان نہیں' بلکہ ایک مسلسل عمل مقصود ہے۔ یعنی انسان ہدایت کے لیے ان تمام وسائل سے استفادہ کرے جو بالواسطہ (indirect) یا براہِ راست (direct) اسکے اختیار میں ہیں اور جن کی تاثیر اور اثر اندازی کی خاصیت سے وہ واقف ہے۔ تاہم اب یہ وسائل اثر کرتے ہیں یا نہیں' یہ بات اس شخص پر موقوف ہے جس کے لیے ان سے استفادہ کیا جارہا ہے۔

والدین سے حسنِ سلوک

☆ فرمانِ الٰہی ہے: وَ اِنۡ جَاہَدٰکَ عَلٰۤی اَنۡ تُشۡرِکَ بِیۡ مَا لَیۡسَ لَکَ بِہٖ عِلۡمٌ فَلَا تُطِعۡہُمَا وَ صَاحِبۡہُمَا فِی الدُّنۡیَا مَعۡرُوۡفًا. (اور اگر تمہارے ماں باپ اس

بات پر زور دیں کہ کسی ایسی چیز کو میرا شریک بناؤ جس کا تمہیں علم نہیں ہے' تو خبردار ان کی اطاعت نہ کرنا لیکن دنیا میں ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنا۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۵) یہ کیسے ممکن ہے کہ مومن اولاد اپنے غیر مومن والدین سے حسنِ سلوک کا مظاہرہ کرے؟

○ جب ہم انسان کے اپنے والدین سے تعلق کے بارے میں اسلام کے دیے ہوئے دستورِ عمل کا مطالعہ کرتے ہیں' تو وہاں ہمیں یہ نہیں ملتا کہ خداوندِ عالم نے انسان پر اپنے والدین کی اطاعت فرض کی ہے۔ کیونکہ وہ تعلق جو والدین کا اپنے بچوں سے رشتہ استوار کرتا ہے' اسکی بنیاد والدین کا اپنے بچوں سے حسنِ سلوک اور احسان ہے۔ رابطے اور تعلق کا یہ بندھن بچے پر واجب نہیں کرتا کہ وہ اپنے والدین کی خواہشات کے سامنے اپنی شخصیت کو مٹا ڈالے۔

والدین کے اچھے برتاؤ کے بالمقابل بچے سے جس جوابی عمل کو مقبول اور معقول سمجھا گیا ہے وہ بچے کا والدین کی اطاعتِ محض نہیں' بلکہ یہ ہے کہ بچہ بھی اپنے ماں باپ سے حسنِ سلوک کرے۔ قرآنِ کریم میں بھی اس موضوع پر گفتگو کی گئی ہے اور ارشادِ الٰہی ہے:

''وَ قَضٰی رَبُّکَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاہُ وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا۔''

''اور آپ کے پروردگار کا فیصلہ ہے کہ تم سب اسکے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرنا اور ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرنا۔''

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۳)

یہاں قرآنِ کریم والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور اچھے برتاؤ کی تاکید کرنے سے قبل پرستش اور عبادت کی بنیاد پر انسان اور خدا کے ربط و تعلق کی بابت گفتگو کرتا ہے۔ کیونکہ یہ تعلق مربوب کا اپنے رب' مخلوق کا اپنے خالق' مملوک کا اپنے مالک اور ہستی کا سرچشمۂ ہستی سے تعلق ہے۔ لہٰذا اس قسم کا رابطہ اور تعلق پرستش اور عبودیت کو واجب کرتا ہے۔ کیونکہ ہماری ہستی اور وجود اسکے ارادے کے تابع ہے اور جب ایسا ہے' تو ہمارے اعمال اور افعال

بھی اسکے ارادے اور حکم کے تابع ہونے چاہئیں۔

والدین کی عظیم خدمات

انسان کے اپنے والدین سے تعلق کی خصوصیات علیحدہ ہیں اور خدا سے تعلق کی خصوصیت علیحدہ۔ والدین بچے کو وجود نہیں بخشتے بلکہ اسے وجود میں لانے کے لیے ایک واسطہ ہوتے ہیں۔ اللہ ہے جو نطفے کو حیات عطا کرتا ہے اور اسکی نشو ونما کے لیے تمام ضروری اسباب فراہم کرتا ہے تاکہ وہ عَلَقَةَ (جما ہوا خون) پھر مُضغةً (گوشت کا لوتھڑا) پھر عِظَماً (ہڈیاں) بنے۔ اس کے بعد اس پر گوشت چڑھاتا ہے اور آخر میں اسے دوسری چیزوں سے آراستہ کرتا ہے۔ بچے کی ولادت کے بعد بھی خدا ہی ہے جو اسکی ماں کے سینے میں دودھ جاری کرتا ہے۔

لہٰذا ماں اور باپ واسطے کا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کا کردار اس صاحبِ ارادہ ہستی کا کردار نہیں ہوتا جو وجود کو حقیقت کا روپ دیتی ہے۔ اس بنیاد پر والدین کا مقام محسن کا مقام ہے' جو بچے پر احسان کرتے ہیں۔ یہاں ہم اس آیۂ شریفہ کی جانب متوجہ ہوتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے: هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ. (کیا احسان کا بدلہ احسان کے سوا کچھ اور بھی ہوسکتا ہے؟ سورۂ رحمٰن ۵۵۔ آیت ۶۰)

ملاحظہ فرمایا کہ والدین سے تعلق حسنِ سلوک اور احسان کا تعلق ہے اور اسکی مثال خداوندِ عالم ہمارے سامنے یوں بیان کرتا ہے:

"اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَ قُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَ قُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا۔"

"اگر تمہارے سامنے ان دونوں میں سے ایک یا دونوں بوڑھے ہو جائیں' تو

خبردار ان سے اف بھی نہ کہنا اور انہیں جھڑکنا بھی نہیں اور ان سے ہمیشہ شریفانہ طرز سے گفتگو کرتے رہنا اور ان کے لیے خاکساری کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکا دینا اور ان کے حق میں دعا کرتے رہنا کہ پروردگار ان دونوں پر اسی طرح رحمت نازل فرما جس طرح انہوں نے بچپنے میں مجھے پالا ہے۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۳، ۲۴)

اللہ تعالیٰ کے نزدیک احسان اور نیک برتاؤ کی سب سے نمایاں مثال یہ ہے کہ انسان ان تمام مواقع پر، جب اسکے والدین اپنی پیری یا بدمزاجی یا بعض عوارض کی بنا پر اس سے سختی کے ساتھ پیش آتے ہیں، ان کے اس رَویے کو برداشت کرے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم اولاد کو ہدایت کرتا ہے کہ ماں باپ کے سامنے ان کا رَویہ انکساری اور عاجزی پر مبنی ہو۔ تاہم اس انکساری و عاجزی کے معنی اپنی انسانی شخصیت سے گر جانا نہیں، اپنے مقام و مرتبے سے پست ہو جانا نہیں، بلکہ مہربانی اور رحمت کی رو سے تواضع اور خاکساری ہے، ہو بہو اسی طرح جیسے انسان اپنے کم سن بچے (سے مہر و محبت کی وجہ سے اس) کے سامنے بچھا جاتا ہے۔

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ خداوندِ سبحان ماں کی زحمتوں اور تکلیفوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرماتا ہے:

"حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ وَهْنًا عَلٰى وَهْنٍ."

"اسکی ماں نے دکھ پر دکھ جھیل کر اسے پیٹ میں رکھا ہے۔"

(سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۴)

اور اسے یاد دلاتا ہے کہ:

"حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّ وَضَعَتْهُ كُرْهًا."

"کہ اسکی ماں نے بڑے رنج کے ساتھ اسے شکم میں رکھا ہے اور پھر بڑی تکلیف کے ساتھ پیدا کیا ہے۔" (سورۂ احقاف ۴۶۔ آیت ۱۵)

اللہ رب العزت ماں کی مشقتوں اور دکھوں کا تذکرہ کر کے بچوں کو یہ پیغام دیتا ہے کہ جس طرح والدین نے تمہارے لیے مشکلات برداشت کیں اور زحمتیں اٹھائیں' اسی طرح تم بھی ان کے لیے مشکلیں' دکھ اور تکلیفیں برداشت کرو۔

والدین کے بالمقابل اولاد کی ذمے داریاں

گزشتہ گفتگو سے' بالخصوص مذکورہ بالا آیات کے مطالعے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ والدین اور اولاد کا باہمی تعلق احسان اور باہمی خوش معاملگی کا تعلق ہے۔ یعنی ماں باپ اپنے بچوں سے اچھا برتاؤ کرتے ہیں' خوش سلوکی سے پیش آتے ہیں' لہٰذا بچوں پر بھی واجب ہے کہ جواباً ان سے اچھا اور نیک سلوک کریں۔ چاہے والدین کافر یا گناہگار ہی کیوں نہ ہوں' بچوں کو بہرصورت حسنِ سلوک اور احسان کی راہ اپنانی چاہیے:

"وَ اِنْ جَاهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِیْ مَا لَیْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا"

"اور اگر وہ کسی ایسی شئے کو میرا شریک بنانے پر مجبور کریں جس کا تمہیں علم نہ ہو' تو خبردار ان کی اطاعت نہ کرنا۔" (سورۂ عنکبوت ۲۹۔ آیت ۸)

اگر چہ کافر کی اطاعت جائز نہیں' چاہے وہ والدین ہی کیوں نہ ہوں' لیکن اسکے باوجود ماں باپ کا کافر' مشرک یا گنہگار ہونا اس انسانی تعلق کو جاری رکھنے میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے جسے خداوندِ عالم نے ہر انسان پر فرض کیا ہے' اور یہ فریضہ ان سے حسنِ سلوک ہے' جس کے متعلق ارشاد ہے:

"فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّ لَا تَنْهَرْهُمَا."

"ان سے اُف بھی نہ کہنا اور نہ ہی درشت لہجے میں بات کرنا۔"

(سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۳)

مذکورہ فرمان، حسنِ سلوک اور اچھے برتاؤ کے محض ایک طریقے کو بیان کرتا ہے، جبکہ حسنِ سلوک کے اور بھی بہت سے انداز ہیں، مثلاً ان کے اخراجات پورے کرنا، ان کی آسائش اور سہولت کے وسائل فراہم کرنا، ان سے خنداں پیشانی اور خوشروئی سے پیش آنا، ان کا بوسہ لینا، انہیں آغوش میں لینا، ان کے علاج معالجے کا خیال رکھنا اور ان تمام چیزوں کو ملحوظ رکھنا جو ایک انسان کی راحت و آرام، خوشی اور مسرت کا موجب ہوتی ہیں۔

محبت کا ہدایت میں بدلنا

والدین سے حسنِ سلوک ان کی ہدایت اور رہنمائی کا ذریعہ بھی بن سکتا ہے۔ اور اس بات کو ہم امام جعفر صادق علیہ السلام سے مروی ایک داستان میں دیکھتے ہیں: ایک عیسائی شخص امامؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ کی تعلیم و ہدایت کے نتیجے میں اسلام قبول کیا۔ پھر عرض گزار ہوا کہ: میری ماں ابھی تک عیسائی مذہب پر باقی ہے، میں اس سے کیسا سلوک کروں؟ امامؑ نے فرمایا: اب تم اپنی ماں سے اس سے بھی بہتر سلوک کرنا جیسا اس وقت کیا کرتے تھے جب تم عیسائی تھے۔ وہ شخص امامؑ کی خدمت سے رخصت ہوا اور آپ کی نصیحت پر عمل کرنے لگا۔ اب وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنی ماں کا خیال رکھتا اور اس کی روزمرہ ضرورتوں کو پورا کرتا۔ جب اسکی ماں نے اپنے بیٹے کی اس روز افزوں چاہت و محبت کا مشاہدہ کیا، تو متعجب ہوئی اور اس سے پوچھا: کیا بات ہے؟ اس سے پہلے بھی تمہارا برتاؤ میرے ساتھ اچھا تھا، لیکن ابھی کچھ عرصے سے میں دیکھ رہی ہوں کہ تم کچھ زیادہ ہی میرا خیال رکھنے لگے ہو، آخر اس تبدیلی کی وجہ کیا ہے؟ اس نے جواب دیا: بات دراصل یہ ہے کہ میں دین اسلام قبول کر چکا ہوں، اس دین کے پیشوا نے مجھے اس عمل کی تلقین کی ہے۔ ماں نے پوچھا: کیا وہ پیغمبر ہیں؟ اس نے کہا: نہیں، البتہ فرزندِ پیغمبر ہیں۔ ماں نے کہا: یہ تو انبیا کے اخلاق میں سے ہے۔ بیٹا! مجھے بھی اپنے دین کے متعلق بتاؤ۔ اس نے اپنی ماں کے سامنے

دین اسلام پیش کیا اور وہ عورت اسی وقت دائرۂ اسلام میں داخل ہوگئی۔

اس روایت سے یہ نتیجہ لیا جاسکتا ہے کہ اگر کوئی اولاد اپنی تمام توجہ، احساسات اور محبت کو اپنے کافر یا گنہگار ماں باپ پر مرکوز کردے تو اپنے اس عمل کے ذریعے ان کی فکر اور رجحانات کو بدل کر انہیں راہِ راست پر لاسکتی ہے۔

والدین کی خوشنودی کی حدود

☆ جنابِ عالی کی گفتگو کی روشنی میں اس حدیث کی کیا تفسیر کریں جس میں کہا گیا ہے:

رضا اللہ من رضا الوالدین. (والدین کی رضا میں خدا کی رضا ہے)

○ یہ جملہ میں نے سنا ضرور ہے لیکن اس کے حدیث ہونے یا نہ ہونے کا مجھے علم نہیں۔ ممکن ہے یہ جملہ اس بات کی جانب اشارہ ہو کہ خداوندِ عالم انسان سے چاہتا ہے کہ وہ والدین کی خوشنودی حاصل کرے۔ لیکن اس سے مراد وہی رضایت اور خوشنودی ہے جو اطاعتِ الٰہی کی حدود کے اندر اندر ہو۔ ایسا نہیں ہے کہ ہر قیمت پر والدین کی رضا حاصل کی جائے اور ان کی خوشنودی کا خیال رکھا جائے۔ مثلاً اگر والدین اپنی اولاد کو کسی ایسے عمل کی انجام دہی کی تاکید کریں جو خلافِ مصلحت ہو، یا کوئی گناہ آلود عمل بجالانے پر مجبور کریں، یا اسکے سپرد کوئی ایسا کام کریں جو (چاہے کسی مستحب امر میں ہی سہی) خدا کی اطاعت میں رکاوٹ ہو، تو ایسی صورت میں اولاد پر والدین کی خوشنودی کا حصول لازم نہیں، کیونکہ خدا کسی ایسے انسان کو دوسروں پر مسلط دیکھنا نہیں چاہتا جس کے دل میں دین کے بارے میں کدورت ہو اور جسے مستحبات کی انجام دہی اور مکروہات سے گریز پسند نہ ہو۔

اس گفتگو کے نتیجے میں یہ بات سامنے آتی ہے کہ "والدین کی رضا میں خدا کی رضا ہے" سے مراد یہ ہے کہ ماں باپ کی خوشنودی کا حصول اس دائرے تک محدود ہے جس میں خداوندِ عالم نے اولاد کے ذمے والدین کے کسی حق کی ادائیگی رکھی ہو۔ لہٰذا اولاد پر لازم

ہے کہ وہ خدا کی بتائی ہوئی راہ پر چلیں۔ خداوندِ عالم ان سے اس وقت تک راضی نہ ہوگا جب تک ان کے والدین خوش نہ ہوں' کیونکہ اگر اولاد خدا کے بتائے ہوئے راستے کو چھوڑ کر اپنے والدین سے بُرا سلوک کرے اور ان سے نیک برتاؤ نہ کرے' تو دراصل اس نے خدا کے حکم کی نافرمانی کی ہے اور اسکے بتائے ہوئے راستے کو ترک کیا ہے۔

قول و فعل کی ہم آہنگی

☆ ارشادِ الٰہی ہے: يَآأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لاَ تَفْعَلُوْنَ. (اے اہلِ ایمان ایسی بات کیوں کہتے ہو جس پر عمل نہیں کرتے۔ خدا سخت ناراض ہوتا ہے اس بات پر جو تم کہتے ہو لیکن اس پر عمل نہیں کرتے۔ سورۂ صف ۶۱۔ آیت ۲'۳) کیا یہ ممانعت ہر اس قول کی مطلق ممانعت ہے جس پر عمل نہ کیا جائے یا اس نیت کی مذمت ہے جو گفتار کے موقع پر بے عمل شخص کے باطن میں ہوتی ہے؟

O اس آیت کا مقصد قول و فعل یا ایمان کے درمیان ہم آہنگی کی ضرورت پر زور دینا ہے۔ اس اعتبار سے کہ قول ایمان کا اظہار کرتا اور اسے آشکارا کرتا ہے اور اس طرزِ عمل کا ترجمان ہے جسے ایمان مردِ مومن پر فرض کرتا ہے اور وہ اس مقصد کے لیے جدوجہد میں مصروف ہوتا ہے جس کا تقاضا اس سے ایمان کی استقامت کرتی ہے۔

گویا اس آیت میں خداوندِ عالم اس بے عمل گروہ سے فرماتا ہے کہ: تم نے اپنے ایمان کا زبانی اعتراف تو کیا ہے لیکن عملاً اس راستے پر گامزن نہیں ہو جسے ایمان نے تم پر فرض کیا ہے۔ تمہارے ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ راہِ خدا میں جہاد کرو اور خدا کی دعوت قبول کرو' لیکن تمہارا ایمان صرف ایک ذہنی سوچ ہے جس نے عالمِ حقیقت میں عمل کا روپ اختیار نہیں کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو دین کی صرف باتیں کرتے ہیں' اپنی دینداری کا اعلان کرتے ہیں لیکن عملاً دین کی پیروی نہیں کرتے۔

لیکن اگر کبھی ایسا ہو کہ انسان اسلام کے بلند مقاصد کی حمایت کرتے ہوئے کوئی ایسی بات کہے جس پر وہ (ایک یقینی موضوع کے طور پر) ایمان نہ رکھتا ہو تو یہ چیز مذکورہ آیۂ کریمہ میں کی جانے والی مذمت میں شامل نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ جب ہم نے یہ بات سمجھ لی ہے کہ ایمان اور عمل کے درمیان توازن ضروری ہے۔ یعنی قول کو ایمان کا عکاس ہونا چاہیے۔ لہٰذا ایک ایسا انسان جو ایسی بات کہتا ہے جس پر ایمان نہیں رکھتا، یا ایسا موٴقف اپناتا ہے جس پر اسے یقین نہیں ہوتا، تو وہ ایمان کے راستے سے خارج نہیں ہوتا کیونکہ وہ یہ کام اس بنیاد پر کرتا ہے کہ ایمان کے تقاضے نے اس پر یہ چیز واجب کی ہوتی ہے۔

کیونکہ خداوندِ عالم مومن انسان سے چاہتا ہے کہ وہ دشوار حالات میں ایسا طرزِ عمل اختیار کرے جس کا نتیجہ اسلام کے بلند مقاصد اور عظیم اہداف کے لیے نقصان کا باعث نہ ہو۔ اسی بنا پر انسان کے قول و فعل میں اختلاف کے مسئلے کا جائزہ لیتے ہوئے اس ماحول کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے جس میں وہ قول ادا ہوا ہے۔ دیکھنا چاہیے کہ کیا وہ ماحول ایسا ماحول تھا جس میں قلبی ایمان سے مکمل طور پر ہم آہنگ بات کہی جاتی، یا نہیں وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں ایسی گفتگو کی جانی چاہیے تھی جو عظیم دینی اہداف اور اصل دینی موٴقف کی تقویت کا باعث ہو، اگرچہ یہ کہی جانے والی بات، کہنے والے کے قلبی عقیدے کے برخلاف ہو۔

گوشہ نشینی

☆ کیا جوانانِ کہف نے اپنے معاشرے کی حقیقتوں سے راہِ فرار اختیار کی تھی، یا ایک خاص زمانے کے لیے گوشہ نشینی اپنائی تھی؟

○ جوانانِ کہف کے احوال کا مطالعہ کرتے ہوئے ہمارے سامنے دو احتمال آتے ہیں۔ پہلا احتمال تو یہ ہے کہ ان پر ماحول کا دباؤ اس قدر بڑھ چکا تھا کہ وہ خوفزدہ تھے کہ کہیں طاغوتی طاقتیں انہیں کفر اختیار کرنے پر مجبور نہ کردیں۔ نیز انہیں اس بات کا بھی دھڑکا تھ

کہ کہیں ان پر معاشرتی دباؤ اس حد تک نہ بڑھ جائے کہ وہ اس کا مقابلہ نہ کرسکیں۔ اور جیسا کہ مستضعفین (جن کی جان لینے کو فرشتے اس وقت گئے جب وہ خود پر ظلم کر رہے تھے) کے بارے میں خدائے تعالیٰ کے کلام میں ہماری نظر سے گزر چکا ہے کہ خداوندِ عالم کو یہ بات پسند تھی کہ وہ اپنے دین کی حفاظت اور اس ماحول سے نجات کے لیے اپنے وطن سے ہجرت کر جائیں، تاکہ جس معاشرے میں وہ رہ رہے ہیں وہاں کا سخت دباؤ انہیں اپنے دین سے دستبردار ہونے پر مجبور نہ کردے۔ شاید اصحابِ کہف کا تعلق اسی گروہ (مستضعفین) سے ہو اور انہیں یہی مشکل درپیش ہو۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ وہ ایک ایسا موقع حاصل کرنا چاہتے ہوں جس میں زیادہ توانائی جمع کر کے معاشرے میں لوٹیں اور اپنے اوپر پڑنے والے شدید دباؤ میں کمی لائیں، اور نئے سرے سے اپنا پروگرام شروع کریں۔ البتہ اس دوسرے احتمال کو تقویت پہنچانے والے قرائن اور شواہد ہمارے پاس موجود نہیں ہیں، جبکہ پہلا احتمال زیادہ قوی نظر آتا ہے۔

اہم یہ ہے کہ اس بات کو پیشِ نظر رکھیں کہ خداوندِ متعال اس داستان کو بعد میں آنے والے مومنین کے لیے عبرت قرار دینا چاہتا ہے اور ان پر یہ واضح کرنا چاہتا ہے کہ وہ اپنے حکیمانہ ارادے کے تحت مختلف وسائل اور گوناگوں راہوں سے اپنے بندوں کو نجات بخشتا ہے۔

عبادت کا وسیع مفہوم

☆ خداوندِ متعال قرآنِ مجید میں فرماتا ہے: وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (اور میں نے جنات اور انسان کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ سورۂ ذاریات ۵۱۔ آیت ۵۶) خدا نے ہمیں کیسی عبادت کے لیے خلق کیا ہے؟

○ عبادت کے معنی ہیں انتہائی درجے کی فرمانبرداری اور بندگی۔ یعنی خداوندِ عالم یہ چاہتا ہے کہ جن و انس اسکے احکام و فرامین کے تابع و فرمانبردار رہیں۔ خداوندِ عالم جنوں اور

انسانوں سے چاہتا ہے کہ ان کا ارادہ خدا کے ارادے کے تابع ہو' ان کے اعمال و افعال خدا کے امر و نہی کے مطابق ہوں اور روئے زمین پر انسان کی پوری حیات خدا کی اس خلافت کی مظہر ہو جس کی ذمے داریوں کا بوجھ خدا انسان سے اٹھوانا چاہتا ہے۔

اس گفتگو کی روشنی میں ہم پر واضح ہوتا ہے کہ عبادت ہر اس چیز کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے جس میں خدا کے اوامر و نواہی کا لحاظ رکھا گیا ہو۔ با الفاظِ دیگر اس میں ہر وہ عمل شامل ہے جو خدا کی محبت میں اور اسکی رضا کے لیے انجام دیا گیا ہو۔ اس مفہوم کو ہم ان احادیث سے اخذ کرتے ہیں جو کہتی ہیں: العبادة سبعون جزء' افضلها طلب الحلال. (عبادت کے ستّر حصے ہیں اور اس کا افضل ترین حصہ طلبِ حلال ہے) یا: افضل العبادة العفاف. (بہترین عبادت پاک دامنی ہے) یا: ماعبدالله بشی ء افضل من عفة بطن و فرج. (خدا کی عبادت شکم اور فرج کی پاکیزگی سے بڑھ کر کسی اور عمل کے ذریعے نہیں ہوتی) یا وہ حدیث جو کہتی ہے: طلب العلم عبادة. (طلبِ علم عبادت ہے) یا وہ جس میں ہے: تفکر ساعة خیر من عبادة سنة. (ایک ساعت غور و فکر ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے) یعنی غور و فکر' سوچ بچار عبادت کی ایک ایسی قسم ہے جو ایک سال کی عبادت (جیسے بے معرفت نماز) سے برتر ہے۔

ارادۂ الٰہی کی انجام دہی

اس طرح ہم یہ سمجھ سکتے ہیں کہ خداوند عالم جن و انس سے جس عبادت کا طلبگار ہے' اور جس کے متعلق چاہتا ہے کہ وہ اسے زندگی کے مقصد اور ہدف کے طور پر پیشِ نظر رکھیں' وہ یہ ہے کہ وہ عالمِ ہستی میں خدا کی مشیت اور ارادے کو حقیقت کا روپ دیں۔ شاید یہ مفہوم خداوندِ عالم کے اس کلام سے حاصل کیا جا سکے جس میں وہ انبیا کو بھیجنے اور آسمانی کتب کے نزول کی حکمت بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا

مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. (بے شک ہم نے انبیا کو واضح دلیلوں کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو بھی نازل کیا ہے تا کہ لوگ عدالت کے ساتھ عمل کریں۔ سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵) اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ بعثتِ انبیا کا مقصد یہ ہے کہ لوگ عدل و انصاف کے مطابق عمل کریں۔ لہٰذا انبیا اس لیے آئے ہیں تا کہ وہ لوگوں کے لیے ان چیزوں کو بیان کریں جو خدا اُن سے چاہتا ہے۔ اور یوں خداوندِ عالم کے نزدیک انسان کی زندگی کا مقصد یہ ہے کہ لوگ عدل و انصاف کی کو ملحوظ رکھیں۔

عدالت کا قیام

اس بنیاد پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ عدالت کا قیام اور انصاف کا رواج درحقیقت عبادتِ عملی کی ایک قسم ہے، جس پر عمل کا تقاضا خداوندِ عالم اپنے بندوں سے کرتا ہے۔ مذکورہ آیۂ کریمہ میں "عبادت" کے وہ معنی مراد نہیں ہیں جو عام طور پر مشہور و معروف ہیں، جن کے مطابق خدا نے جن و انس کو نماز پڑھنے یا روزہ رکھنے کے لیے خلق کیا ہے۔ بلکہ یہاں عبادت کا مفہوم اس عامیانہ معنی سے کہیں بالاتر اور ماورا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ فقہا کے بقول ہر ایسا عمل جسے انسان خدا کی خوشنودی اور اسکے تقرب کے ارادے سے انجام دے عبادت ہے۔

قرآنی جوان

☆ ہم ایسی نسل اور ایسے جوان تیار کرنا چاہتے ہیں جن کی زندگیاں قرآنی ہدایات و تعلیمات میں ڈھلی ہوئی ہوں، اس کا کیا طریقہ ہے؟

O جب آپ "قرآنی نسل" یا "قرآنی جوان" کا کلمہ استعمال کرتے ہیں، تو درحقیقت آپ کی گفتگو اُن قرآنی مفاہیم کے بارے میں ہوتی ہے جو چاہتے ہیں کہ جوان ان کے سانچے میں ڈھل جائیں۔ خواہ یہ مفاہیم عقیدتی ہوں، یا اخلاقی، یا عبادی، یا عملی۔ لہٰذا جوانوں

پر لازم ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرتے ہوئے اسے سمجھ کے پڑھیں ہمیشہ قرآن کریم کی جانب شعوری اور عملی انداز سے متوجہ ہوں ان کی قرأت خشک اور بے روح نہ ہو طوطے کی طرح زبانی رٹنے پر اکتفا نہ کریں۔

لہٰذا ہمارے وہ جوان جو ایک اسلامی زندگی بسر کر رہے ہیں اور خدا کی طرف دعوت کی راہ پر گامزن ہیں وہ ایک مرتبہ پھر اسلامی دعوت کے ابتدائی دور اور نزول قرآن کے عہد سے تعلق رکھنے والے متحرک جوانوں کے کردار کو دہرا سکتے ہیں وہ جوان جن کی پوری حیات پر قرآن کریم ایک الٰہی محرک کے طور پر سایہ فگن تھا۔

اہم یہ ہے کہ مسلمانوں کی نسل نو اپنے پورے شعور اور پورے وجود کے ساتھ قرآنی تعلیمات سے کسب فیض کرے قرآن کریم کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھامے اور اس عمل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنا اسوہ اور ماڈل بنائے جن کے اخلاق کی توصیف ان کی ایک زوجہ نے ان الفاظ میں کی ہے: کان خلقه القرآن۔ (قرآنِ کریم آپ کا خلق تھا)

ہمیں بھی قرآنی اخلاق سے اسی طرح آراستہ ہونا چاہیے کہ لوگ ہمارے کردار و رفتار کو قرآن کا عملی نمونہ پائیں ہمیں قرآنی تعلیمات کی جیتی جاگتی تصویر محسوس کریں۔

☆☆☆☆☆

ضمیمۂ احادیث (۱)

خواہشاتِ نفس کے بارے میں

☆ قال الامام علی (علیه السلام): "آفة العقل الهوىٰ."

امام علیؑ نے فرمایا: ''خواہشِ نفس عقل کو برباد کردیتی ہے۔''

☆ وقال (ع): "الشهوات سموم قاتلات."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: ''نفسانی خواہشات مہلک زہروں کی مانند ہیں۔''

☆ وقال (ع): "حلاوة الشهوة ينغصها عار الفضيحة."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: ''خواہشاتِ نفس کی شیرینی کو ذلت و رسوائی تلخ کردیتی ہے۔''

☆ وقال (ع): "ان الجنة حفت بالمكاره، وان النار حفت بالشهوات."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: ''جنت مشکلات اور سختیوں میں لپٹی ہوئی ہے اور دوزخ خواہشاتِ نفس میں۔''

☆ وقال (ع): "بقدر اللذة يكون التنغيص."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "گناہگار گناہ سے حاصل ہونے والی لذت کی مقدار کے برابر ناگواری اور تلخ کامی کا مزہ چکھے گا۔"

☆ وقال رسول الله(صلى الله عليه و آله): "رب شهوة ساعة اورثت حزنا طويلا."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "کبھی کبھی لمحہ بھر کی نفسانی لذتیں اپنے پیچھے طویل رنج وغم چھوڑ جاتی ہیں۔"

☆ وقال علی(ع): " من تلذذ بمعاصی الله اورثه الله ذلا."

حضرت علیؑ نے فرمایا: "خدا کی نافرمانی سے لذت حاصل کرنے والے کو خدا ذلت وخواری سے دوچار کرتا ہے۔"

☆ وقال(ع): "الهوى اله معبود، والعقل صديق محمود."

آپؑ ہی کا فرمان ہے: "نفسانی خواہشات، خواہش پرستوں کے معبود ہیں اور عقل وخرد قابلِ ستائش دوست۔"

☆ وقال(ع): "انک ان اطعت هواک اصمک واعماک وافسد منقلبک وارداک."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "خواہشاتِ نفس کی پیروی انسان کی آنکھ اور اس کے کان بند کر دیتی ہے، اس کا مستقبل تباہ اور اسے برباد کر دیتی ہے۔"

☆ وقال(ع): "اول الشهوات طرب و آخرها عطب."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "شہوت کا آغاز طرب اور مستی سے ہوتا ہے اور اس کا انجام صرف اور صرف ہلاکت ہے۔"

☆ وقال(ع): "اقمعوا هذه النفوس فانها طلقة، ان تطيعوها تنزع بكم الى شر غاية."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "نفسانی خواہشات کو اپنے دل و جان سے نکال پھینکو کہ یہ سرکش ہوتی

ہیں اور (ہوشیار کہ) اگر تم نے اپنی لگام ان کے حوالے کر دی، تو یہ تمہیں بدترین انجام سے دوچار کر دیں گی۔"

☆ وقال الامام الصادق (علیه السلام) :" احذروا اهواءكم كما تحذرون اعداءكم ' فليس شيء اعدى للرجال من اتباع اهوائهم وحصاد السنتهم."

امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: "اپنی نفسانی خواہشات سے ایسے ہوشیار رہو جیسے اپنے دشمن سے چوکنا رہتے ہو، کیونکہ خواہشاتِ نفس کی پیروی اور بے تکی گفتگو انسان کی بدترین دشمن ہیں۔"

☆ وقال علی (ع): "ردع النفس عن الهوى ' الجهاد الاكبر."

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: "اپنے نفس کو خواہشاتِ نفسانی سے باز رکھنا جہادِ اکبر ہے۔"

دوستی اور ہم نشینی کے بارے میں

☆ قال رسول الله (ص): " جماع الشر مقارنة قرين السوء."

رسول اللہؐ کا ارشاد ہے: "بُرے کی دوستی، تمام برائیوں کی جڑ ہے۔"

☆ وقال الحواريون لعيسى (عليه السلام): "ياروح الله! من نجالس اذا؟ قال: من يذكركم الله رويته 'و يزيد فى علمكم منطقه' ويرغبكم فى الآخرة عمله."

حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا: "اے روح اللہ! ہم کن خصوصیات کے حامل شخص کے ساتھ نشست و برخاست رکھیں؟ فرمایا: ایسے شخص کے ساتھ جس کا دیدار تمہیں خدا کی یاد دلائے، جس کی گفتگو تمہارے علم میں اضافہ کرے اور جس کا عمل تمہیں آخرت کی جانب راغب کرے۔"

☆ وقال الامام علی (ع): "جليس الخير نعمة ' جليس الشر نقمة."

امام علیؑ نے فرمایا: "نیکوکار سے دوستی نعمت اور بدکار سے دوستی بلا ہے۔"

☆ وقال الامام زين العابدين (عليه السلام): "مجالسة الصالحين داعية

الی الصلاح:"

امام زین العابدینؑ نے فرمایا: "نیکو کاروں کی ہم نشینی نیکی اور بھلائی پر ابھارتی ہے۔"

☆ وقال لقمان لابنه: "یا بنی جالس العلماء وزاحمهم بر کبتیک فان الله یحیی القلوب بنور الحکمة کما یحیی الارض بوابل السماء."

حضرت لقمانؑ نے اپنے فرزند سے فرمایا: "اے بیٹا علما کی صحبت میں بیٹھنا اور ان کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنا کیونکہ خداوند متعال دلوں کو حکمت کے نور سے اسی طرح زندہ کرتا ہے جس طرح زمین کو بارش سے زندہ کرتا ہے۔"

☆ وقال الامام علی(ع): "جالس الحلماء تزدد حلما."

امام علیؑ نے فرمایا: "بردبار لوگوں کی صحبت اختیار کرو اس طرح تمہاری بردباری میں اضافہ ہوگا"

☆ وقال(ع): "جالس العلماء تسعد."

آپؑ نے فرمایا: "علما کی صحبت اختیار کرو سعادت پاؤ گے"

☆ وقال رسول الله(صلی الله علیه و آله وسلم): "جالس الابرار فانک ان فعلت خیرا حمدوک وان اخطات لم یعنفوک."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "نیک لوگوں کی رفاقت اور ہم نشینی اپناؤ کہ اگر تم نیکی کرو گے تو وہ تمہیں سراہیں گے اور اگر کسی خطا کے مرتکب ہوگے تو وہ تمہارے ساتھ درشتی اور بدسلوکی سے پیش نہیں آئیں گے۔"

☆ وقال الامام علی(ع): "جالس الفقراء تزدد شکرا."

حضرت علیؑ نے فرمایا: "ناداروں کی صحبت اپناؤ تمہارے شکر میں اضافہ ہوگا"

☆ وقال الرسول الکریم(ص): "سائلوا العلماء وخاطبوا الحکماء وجالسوا الفقراء."

رسول کریمؐ نے فرمایا: "اپنے مسائل علما سے دریافت کرو، داناؤں سے گفتگو کرو اور ناداروں

کے ساتھ نشست و برخاست رکھو۔"

☆ وعن علی(ع): "مجالسة اهل الهوی منساة للایمان و محضرة للشیطان."

حضرت علیؑ کا ارشاد ہے: "خواہشاتِ نفس کی پیروی کرنے والوں کی ہم نشینی ایمان کو بھلا دیتی ہے اور شیطان کو حاضر کر دیتی ہے۔"

☆ وقال(ع): "جانبوا الاشرار و جالسوا الاخیار."

آپؑ ہی نے فرمایا: "بدکاروں سے دور رہو اور نیکوکاروں کی صحبت اپناؤ۔"

شرم و حیا کے بارے میں

☆قال رسول الله(ص): "الحیاء لایاتی الابالخیر."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "حیا صرف بہتری لاتی ہے۔"

☆وقال (ص): "ان الله یحب الحیی المتعفف' ویبغض البذی السائل الملحف."

آپؐ ہی نے فرمایا: "خداوندِ عالم باحیا اور پاک دامن انسان کو پسند کرتا ہے اور بدزبان اور چمٹ جانے والے سائل کو ناپسند کرتا ہے۔"

☆وقال(ص): "ان الحیاء من شرائع الاسلام."

آپؐ ہی نے فرمایا: "بے شک حیا اسلام کی شریعت ہے۔"

☆ وقال الامام علی(ع): "الحیاء سبب الی کل جمیل."

امام علیؑ نے فرمایا: "شرم و حیا وہ رسی ہے جس کے دوسرے سرے پر خوبیاں ہیں۔"

☆ وقال(ع): "احسن ملا بس الدنیا الحیاء."

آپؑ ہی نے فرمایا: "اس دنیا کا بہترین لباس حیا ہے۔"

☆ وقال(ع): "من کساه الحیاء ثوبه خفی علی الناس عیبه."

آپؑ ہی نے فرمایا: ''جو شخص حیا کی چادر اوڑھ لے' اسکے عیب انسانوں سے چھپے رہتے ہیں۔''

☆ وقال(ع): "الحياء غض الطرف."

آپؑ ہی نے فرمایا: ''نگاہوں کا جھکا لینا حیا ہے۔''

☆ وقال النبي الاكرم(ص): "ما كان الفحش في شيء قط الا شانه' ولا كان الحياء في شيء قط الا زانه."

نبی کریمؐ نے فرمایا: ''ناسزا گوئی ذلت وخواری کا موجب ہے اور حیا زینت اور نیکیوں کا باعث۔''

☆ وقال(ص): " لو كان الحياء رجلاً لكان صالحا."

آپؐ ہی نے فرمایا: ''اگر حیا انسان (کی شکل میں مجسم) ہوتی تو بے شک نیکوکار انسان کی شکل اختیار کرتی۔''

☆ وقال الامام الكاظم(عليه السلام): " الحياء من الايمان ' والايمان في الجنة ' والبذاء من الجفاء والجفاء في النار."

امام موسیٰ کاظمؑ نے فرمایا: ''حیا ایمان کا جز ہے اور ایمان کا مقام بہشت ہے' بدزبانی جفا ہے اور جفا جہنمی ہے۔''

دوستی اور معاشرت کے بارے میں

☆ قال رسول الله(ص): "المرء على دين خليله فانظر من تخالل."

رسول اللہؐ نے فرمایا: ''انسان اپنے دوست کے دین پر ہوتا ہے۔ پس اچھی طرح دیکھ لو کہ کسے دوست بنا رہے ہو۔''

☆ قال علي(ع): "ابذل لاخيك دمك و مالك ' ولعدوك عدلك وانصافك ' وللعامة بشرك واحسانك."

حضرت علیؑ نے فرمایا: ''اپنے بھائی کے لیے جان و مال فدا کر دو' اپنے دشمن سے عدل و

انصاف برتو اور عام لوگوں سے خنداں پیشانی سے پیش آؤ اور احسان کرو۔"

☆ وقال(ع): "احبب حبیبک هونا ما فعسی ان یکون بغیضک یوما ما ' وابغض بغیضک هونا ما فعسی ان یکون حبیبک یوما ما."

آپ ہی نے فرمایا: "دوستی میں حد سے نہ گزرو' مبادا وہ دوست کسی دن تمہارا دشمن ہو جائے (اسی طرح) دشمنی کو بھی حد میں رکھو' شاید دشمن ایک دن تمہارا دوست بن جائے۔"

☆ وقال(ع): "صاحب الاخوان بالاحسان ' و تغمدذنوبهم بالغفران."

آپ ہی نے فرمایا: "اپنے بھائیوں سے حسنِ سلوک کرو اور ان کی غلطیوں کو بخش دو۔"

☆ وقال(ع): "التوددالی الناس رأس العقل."

آپ ہی نے فرمایا: "لوگوں سے محبت اور مہربانی عقل کی اساس ہے۔"

☆ وقال(ع): "بالتودد تتاکد المحبة."

آپ ہی نے فرمایا: "مودت سے محبت میں اضافہ ہوتا ہے۔"

☆ وقال(ع): "بحسن العشرة تدوم المودة."

آپ ہی نے فرمایا: "حسنِ معاشرت سے مودت و محبت کو دوام حاصل ہوتا ہے۔"

☆ وقال(ع): "ایاک ان تخرج صدیقک اخراجایخرجه عن مودتک ' واستبق له من انسک موضعا یثق بالرجوع الیه."

آپ ہی نے فرمایا: "ایسا نہ ہو کہ اپنے دوست کو خود سے اس قدر دور کر دو کہ اس سے مودت و محبت کا رشتہ بالکل ہی ٹوٹ جائے' اور (ہر حال میں) اپنے دل میں اسکی محبت باقی رکھو' تا کہ اسکے سہارے وہ تمہاری طرف پلٹ آئے۔"

☆ وقال(ع): "عمارة القلوب فی معاشرة ذوی العقول."

آپ ہی نے فرمایا: "صاحبانِ عقل کے ساتھ میل جول دلوں کی آبادی کا باعث ہے۔"

☆ وقال(ع): "معاشرة ذوی الفضائل حیاة القلوب."

آپ ہی نے فرمایا: "صاحبانِ فضل کے ساتھ میل جول دلوں کی حیات اور شادابی کا موجب ہے۔"

☆ وقال(ع): "خوافی الاخلاق تکشفها المعاشرۃ۔"

آپ ہی کا ارشاد ہے: "میل جول سے انسان کی پوشیدہ اخلاقی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔"

☆ وقال(ع) موصیا ابنه الحسن(ع): "احبب لاخیک ماتحب لنفسک، واکره له ما تکره لها۔"

آپ ہی نے اپنے فرزند امام حسن علیہ السلام کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: "جو چیز اپنے لیے پسند کرتے ہو وہی اپنے بھائی کے لیے چاہو اور جس چیز کو اپنے لیے ناپسندیدہ سمجھو اسے اس کے لیے بھی برا سمجھو۔"

☆☆☆☆☆

۲

نقطۂ انقلاب

(Turning Point)

سعادت وشقاوت

☆ حدیث میں ہے: **السعید سعید فی بطن امه' والشقی شقی فی بطن امه.** (نیک شکمِ مادر ہی میں نیک ہوتا ہے اور بُرا شکمِ مادر ہی میں بُرا ہوتا ہے) اس حدیث کا مفہوم یہ ہے کہ والدین کی خصوصیات موروثی طور پر بچے کے حصے میں آتی ہیں۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس روایت کی رو سے بچے اپنے افعال میں مجبور ہوتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

○ پہلی بات: ممکن ہے اس حدیث سے ہم ایک ایسا مفہوم حاصل کر سکیں جس کے تحت وراثت اور اسکے منفی یا مثبت اثرات کا مسئلہ ہی درمیان میں نہ آئے جس کی بنا پر یہ کہا جاتا ہے کہ بچوں کی نیک بختی اور بد بختی کا موجب وہ صفات وخصوصیات ہوتی ہیں جو بچے اپنے والدین سے وراثت میں پاتے ہیں۔ بلکہ اس حدیث سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ انسانوں کی پیدائش کے وقت ہی سے ان کے مستقبل کا علم رکھتا ہے' اور جانتا ہے کہ وہ نیک بختی کی راہ پر چلیں گے یا بد بختی کا راستہ اپنائیں گے۔ اللہ رب العزت بندوں کے اس دنیا میں نیک بختی یا بد بختی کے راستے پر قدم رکھنے سے قبل ہی واقف ہے کہ وہ دنیا

میں کس راہ پر گامزن ہوں گے۔

یہ جبر نہیں ہے

ممکن ہے بعض اذہان میں یہ شبہ پیدا ہو کہ یہ حدیث جبر کی جانب اشارہ کرتی ہے۔ اس سلسلے میں ہمارا جواب یہ ہے کہ ہمارا یہ اعتقاد (کہ خداوندِ عالم اسی وقت سے انسان کی نیک بختی اور بد بختی کا علم رکھتا ہے جبکہ وہ ابھی اپنی ماں کے شکم ہی میں ہوتا ہے) انسان کی سعادت یا شقاوت کے اس کے اپنے ارادے اور اختیار سے تعلق کی نفی نہیں کرتا۔ کیونکہ خداوندِ عالم اس بات کو جانتا ہے کہ انسان کا مستقبل، جس کا تعین خود انسان کا عزم وارادہ کرتا ہے، کیا ہوگا۔ لہٰذا نیک بخت انسان کی سعادت کا سبب یہ ہوتا ہے کہ وہ خود اختیاری طور پر اپنے لیے حق، نیکی اور عدالت کا راستہ منتخب کرتا ہے اور بد بخت کی بد بختی کا موجب ظلم اور بدی کی راہ اپنانا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس بارے میں خداوندِ عالم کا علم اپنی سعادت یا شقاوت کے تعین کے سلسلے میں انسان کے ارادے اور اختیار کو باطل نہیں کرتا۔

خداوندِ عالم تمام باتوں، بشمول انسان کی سعادت اور شقاوت کا علم رکھتا ہے اور اسکی مشیت کے مطابق تمام مسائل ان طبیعی قوانین کے ذریعے واقع ہوتے ہیں جو اللہ رب العزت نے انسان کی شخصیت یا کائنات کو ودیعت کیے ہیں۔ مثال کے طور پر خداوندِ عالم بارش برسنے کے وقت سے آگاہ ہے لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ بارش براہِ راست مشیت ایزدی سے برسے گی۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ خداوندِ عالم حوادث کے واقع ہونے سے قبل ہی ان کے وقوع پذیر ہونے کا علم رکھتا ہے، لیکن حوادث ان اسباب وعلل کے توسط سے واقع ہوتے ہیں جنہیں خداوندِ عالم نے کائنات میں قرار دیا ہے۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کی سعادت اور شقاوت، نیک بختی اور بد بختی مقدمات اور نتائج کے درمیان پائے جانے والی اسباب وعلل کی کارفرمائی کی بنا پر خود

انسان کا ارادہ واختیار رقم کرتا ہے۔ لہٰذا مذکورہ حدیث انسان کی زندگی کے بناؤ یا بگاڑ میں اسکے ارادے اور اختیار کی نفی نہیں کرتی۔

وراثت اور انسانی ارادہ

دوسری بات: مذکورہ حدیث کے ذریعے اگر وراثت اور انسان کی سعادت یا شقاوت کے درمیان تعلق دریافت ہو بھی جائے، تب بھی یہ امر وراثتی عناصر کے مقابلے پر انسان کی آزادی کو لغو قرار نہیں دیتا۔ اس لیے کہ وراثتی عناصر انسان کو ایک معین عمل کی انجامدہی پر اکسانے کا باعث تو ہوسکتے ہیں لیکن ان کے اثرات اس حد تک قوی نہیں ہوتے کہ انسان سے ایک دوسرے راستے پر قدم بڑھانے یا ایک دوسرے افق پر پرواز کرنے کی قدرت و صلاحیت سلب کرلیں۔ انسان کی شخصیت میں موجود وراثتی عناصر اس میں فکری، نفسیاتی یا عملی عوامل ایجاد کرتے ہیں، جو بسا اوقات کسی عمل کی انجام دہی کے لیے اس کے نفس یا فکر پر دباؤ ڈالتے ہیں۔

البتہ یہ صورتحال انسان کو بے دست و پا نہیں کردیتی، اور وہ ان عناصر کے سامنے بے بس نہیں ہوتا، کیونکہ خداوندِ عالم نے انسان کو عقل کی نعمت اور ارادے کا گوہر بھی عطا کیا ہے اور اس کے لیے ایسے مواقع فراہم کیے ہیں جن سے استفادے کے ذریعے وہ اپنے لیے دوسری راہوں کا انتخاب کرسکتا ہے۔ یہ وراثتی عوامل ہو بہو ایسے ہی ہیں جیسے صحت سے متعلق عوامل۔ مثلاً ایک ایسا انسان جس کی ولادت صحت کے لیے مکمل طور پر مضر ماحول میں ہوئی ہو، اس بات پر قادر ہوتا ہے کہ صحت کے لیے مفید عوامل سے استفادہ کرکے مطلوبہ صحت حاصل کرسکے۔ اسی طرح ایک ایسا انسان جس نے صحت کے لیے مفید ماحول میں آنکھ کھولی ہو، اسکے لیے بھی یہ امکان موجود ہے کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار کو غلط طور پر کام میں لاکر اپنے لیے مضرِ صحت حالات پیدا کرلے۔

لہٰذا ہم یہ عقیدہ نہیں رکھتے کہ وراثت انسان سے اس کا ارادہ سلب کرسکتی ہے' یا اس کے اختیار کی قوت اس سے چھین سکتی ہے' البتہ اس حد تک قبول کرتے ہیں کہ وراثت اپنی معین کردہ ڈگر کے برخلاف راستہ اختیار کرنے پر انسان کے سامنے مشکلات کھڑی کرتی ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسان جس طرح اپنی جسمانی اور شعوری تکمیل کی راہ میں اندرونی مشکلات سے دوچار ہوتا ہے اسی طرح باہر سے بھی اور خارجی عوامل کے توسط سے آنے والی مشکلات بھی اسکے لیے تکامل کی راہ پر چلنا دشوار کردیتی ہیں۔

بسااوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان برائیوں سے مکمل طور پر لتھڑے ہوئے ایک ایسے ماحول میں زندگی بسر کرتا ہے جو اسکے سامنے تمام برائیوں کے راستے کھول دیتا ہے' لیکن اسکے باوجود وہ اس ماحول کے اثرات پر غالب آسکتا ہے اور اپنے لیے خیر کی راہ کا انتخاب کر سکتا ہے۔ دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ ایک نیک اور صالح ماحول میں زندگی گزارنے والا انسان اپنے اندرونی دباؤ اور جبلی خواہشات کے غلبے کی بنا پر اس صالح ماحول کے اثرات سے مستفید نہ ہو اور اس کا جھکاؤ شر اور برائیوں کی سمت ہو جائے۔

ماحول تبدیل کرنے کے سلسلے میں انسان کی قدرت

انسان کے اندر موجود اندرونی عوامل' اسکے باطن میں بیٹھے ہوئے موروثی عناصر اور ان بیرونی عوامل کے درمیان کوئی فرق نہیں جو چاروں طرف سے انسان کو گھیرے ہوئے ہوتے ہیں اور جن کا وہ روز وشب سامنا کرتا ہے۔

ہر دو صورتوں میں انسان اپنے داخلی اور خارجی حالات بدلنے پر قادر ہے۔ یہ مفہوم ہم اس آیۂ کریمہ سے حاصل کرتے ہیں جس میں ارشادِ قدرت ہے: اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ. (اور خدا کسی قوم کی حالت کو اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنے آپ کو تبدیل نہ کرلے۔ سورۂ رعد ۱۳۔ آیت ۱۱)

یعنی انسان میں اپنے حالات تبدیل کرنے کی قدرت پائی جاتی ہے۔ خواہ یہ حالات ان موروثی عناصر کے پیدا کردہ ہوں جو اس پر دباؤ ڈالتے ہیں یا اس پر اثر انداز ہونے والی جبلی خواہشات کا نتیجہ ہوں' یا ان خارجی عوامل کی بنا پر ہوں جس میں وہ گھرا ہوتا ہے۔

خداوندِ متعال نے اس کلام میں حالات کی تبدیلی کو خود انسان کی فکر' احساس اور اسکے باطن میں موجود عناصر میں تبدیلی سے وابستہ قرار دیا ہے۔ اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ انسان خود پر اثر انداز ہونے والے ہر داخلی اور خارجی عامل کے مقابل ڈٹ جانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ خواہ یہ عناصر اسکی ذات کا حصہ ہوں یا اسکے اردگرد کا ماحول۔

علاوہ ازایں اسلام شدت کے ساتھ جہادِ نفس (جسے جہادِ اکبر کا نام دیا گیا ہے) کی تاکید کرتا ہے۔ اس جہاد کو جہادِ اکبر کا نام دینا اس کے دوران پیش آنے والی شدید صعوبتوں اور دشواریوں کی جانب اشارہ ہے۔ مختصر یہ کہ انسان جس طرح (خارجی) ماحول کے منفی اثرات پر قابو پانے کی قدرت رکھتا ہے' اسی طرح باطنی منفی عوامل پر بھی غالب آسکتا ہے۔

ماحول کی طرف سے استضعاف

☆ ایسے بچے جو خراب اور غیر سالم گھریلو ماحول میں آنکھ کھولتے ہیں اور جن کے معاشرے میں بھی ان کے والدین کے ناپسندیدہ اعمال کو بُری نظر سے نہیں دیکھا جاتا (اور معاشرہ بھی ان کے اعمال کی تائید کرتا ہے) ہمارا آپ سے سوال یہ ہے کہ ایسے حالات اور ماحول میں جوان کی ذمے داری کیا ہے؟

O ''اسلام کے نقطۂ نظر سے مسئولیت'' کے موضوع میں ''مستضعف'' کے عنوان سے ایک تعبیر پائی جاتی ہے' جو بسا اوقات فکری استضعاف کے لیے استعمال ہوتی ہے اور عقیدتی' سیاسی اور اجتماعی مفہوم پیدا کر لیتی ہے اور کبھی خارجی استضعاف کے عوامل کے بارے میں استعمال ہوتی ہے' جس سے مراد کسی قوی عنصر کے مقابل انسان کی قدرتِ عمل کا ختم

ہو جاتا ہے۔

اگر استضعاف سے مراد فکری استضعاف ہو، تو سوالِ بالا کا جواب واضح ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایسا ماحول جہاں حق وعدالت کے برخلاف عقائد وافکار رائج ہوں اور جو ایک ایسا بند معاشرہ ہو جو اپنے افراد کو کسی دوسرے تصور کے بارے میں سوچنے سمجھنے تک کی اجازت نہ دیتا ہو، تو وہاں زندگی بسر کرنے والا انسان اپنے ماحول میں مکمل طور پر غرق ہو جاتا ہے اور اسکے سوا اسے کوئی دوسری چیز نہیں سوجھتی۔

ایسے ماحول میں زندگی بسر کرنے والے انسان کی مثال بالکل اس شخص کی سی ہوتی ہے جسے ایک تنگ وتاریک کمرے میں قید کر دیا گیا ہو اور دنیا و مافیھا سے بے خبر رکھا گیا ہو۔ قدرتی بات ہے کہ ایسا انسان اس تنگ وتاریک ماحول کے سوا دوسری کسی چیز سے آشنا نہیں ہوگا اور اس کے سوا کسی دوسری دنیا کا تصور بھی اس کے ذہن میں نہیں آئے گا۔

ایسا انسان جن کے سامنے کسی دوسرے احتمال کا دروازہ بند ہو، یا اسکے فکری تصورات کی دنیا میں کسی دوسرے احتمال کے لیے دروازہ کھلا نہ ہو اور نتیجے کے طور پر وہ تعلیم کے ذریعے اس دوسرے احتمال کی پرورش اور اسکے مثبت نتائج تک پہنچنے کی قدرت نہ رکھتا ہو، تو فقہی اصطلاح میں ایسے انسان کو ''جاہلِ قاصر'' کہتے ہیں۔ یعنی ایسا جاہل جو اپنی فکری فضا یا عمل وفعالیت کے میدانوں میں حق کے ایک (اجمالی) تصور کا مالک ہو لیکن کیونکہ اسکے سامنے کسی دوسرے احتمال اور خیال کا دروازہ بند ہے اس لیے اسکے پاس حق کی پہچان اور شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں۔ (ایسے شخص کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں ہوتی کہ حق اسکی اختیار کردہ راہ کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ ہے)

عذر رکھنے والے اور عذر نہ رکھنے والے

ایسا انسان جو معرفت کی راہ پر قدم بڑھائے، اُس کا سامنا مختلف افکار و خیالات سے

ہوتا ہے۔ اسکے برعکس ایسا شخص جو صرف ایک اندازِ فکر میں زندگی بسر کرتا ہے' دوسرے افکار و خیالات سے یکسر نا آشنا ہوتا ہے' ہم اسے "جاہلِ قاصر" کہتے ہیں۔ اور ایسا انسان معذور ہے۔ قرآنِ کریم اس قسم کے انسانوں کی جانب یوں اشارہ کرتا ہے: اِلَّا الْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الْوِلْدَانِ لاَ يَسْتَطِيْعُوْنَ حِيْلَةً وَّ لاَ يَهْتَدُوْنَ سَبِيْلاً. (علاوہ ان کمزور مردوں' عورتوں اور بچوں کے جن کے اختیار میں کوئی تدبیر نہ تھی اور وہ کوئی راستہ نہ نکال سکتے تھے۔ سورۂ نسا ۴۔ آیت ۹۸)

البتہ ایک دوسرا ماحول ایسا بھی پایا جاتا ہے جس میں انسان متعدد اور رنگارنگ افکار کا سامنا کرتا ہے اور ان کے بارے میں غور و فکر کرسکتا ہے۔ مثلاً ایک ایسا انسان جو کسی عیسائی یا سنّی معاشرے میں زندگی بسر کرتا ہے اور وہاں رہتے ہوئے سنتا ہے کہ تشیع کے نام سے بھی مسلمانوں کا ایک فرقہ پایا جاتا ہے۔ یا ایک ایسا انسان جو کسی کمیونسٹ سماج میں زندگی بسر کرتا ہے اور سنتا ہے کہ ڈیموکریسی' سرمایہ داری' یا اسلام کے نام سے بھی مکاتبِ فکر پائے جاتے ہیں' اور وہ ان مختلف عقائد و افکار کے بارے میں سوچ بچار کرسکتا ہے۔ ایسا انسان اگر اپنے عقیدے یا فکر سے چمٹا رہے اور دوسرے مکاتب' عقائد اور تصورات کی جانچ پرکھ نہ کرے تو وہ معذور نہیں کہلائے گا۔ کیونکہ کسی بھی چیز پر اعتقاد اور یقین کے دو پہلو ہوتے ہیں۔ ایک اثباتی پہلو اور دوسرا انکاری پہلو۔ اثباتی پہلو' ان عناصر پر مشتمل ہوتا ہے جو اس عقیدے پر ایمان اور اسکی قبولیت کا راستہ ہموار کرتے ہیں اور انکاری پہلو وہ دلائل اور علامات ہوتی ہیں جن کی بنیاد پر کسی فکر کو مسترد کیا جاتا ہے۔ لہٰذا کسی بھی فکر اور عقیدے کو قبول کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس بات پر ایمان لایا جائے کہ "یہ فکر یا عقیدہ حق ہے اور اسکے برخلاف افکار و عقائد باطل ہیں۔"

لہٰذا جب تک آپ دوسرے عقائد کو باطل ثابت نہ کرسکیں' اُس وقت تک اپنے عقیدے کی حقانیت پر مطمئن ہو کے نہیں بیٹھ سکتے۔ اور ایسے اطمینان کا حصول صرف اسی

صورت میں ممکن ہے جب ہم اپنی تمام تر فکری قوتوں کو کام میں لائیں تا کہ ہمارا ذہن جس کسی چیز کی حقانیت کو ممکن قرار دے ہم فکری کدوکاوش کے ذریعے اسکی حقیقت تک پہنچ سکیں۔

پوری جدوجہد کرنا

اگر آپ بھرپور جدوجہد کے بعد ایک معین نتیجے پر پہنچ جائیں' جو ممکن ہے حق ہو اور شاید حق نہ ہو' تو اس صورت میں آپ معذور ہوں گے۔ لیکن اگر دوسرے احتمالات کی شناخت کے سلسلے میں آپ کوتاہی کے مرتکب ہوں تو جاہلِ مقصر (۱) کہلائیں گے۔ اور جاہلِ مقصر شرعی اور عقلی لحاظ سے معذور نہیں ہوتا۔ کیونکہ جب خداوندِ سبحان نے انسان کو حق کی معرفت کے ذرائع فراہم کیے ہیں تو اس سے یہ بھی چاہا ہے کہ ان ذرائع و وسائل سے استفادہ کرے اور صرف اس بہانے سے جمود کے عالم میں پڑا نہ رہے کہ یہ ذرائع فطری طور پر مجھے فراہم نہیں ہوئے۔

بعض احادیث میں آیا ہے کہ جب روزِ قیامت انسان کو محشور کیا جائے گا تو اس سے کہیں گے: تم نے کیوں عمل نہ کیا؟ وہ کہے گا: مجھے علم نہ تھا۔ جواباً کہا جائے گا: کیوں علم نہ تھا؟

اور اسی بارے میں فرمانِ الٰہی ہے: قُلْ فَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ. (کہہ دیجیے کہ اللہ ہی کے پاس محکم اور رسا دلیلیں ہیں۔ سورۂ انعام ۶۔ آیت ۱۴۹)

یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے اور وہ یہ کہ ایسا انسان جسے معرفت کے ذرائع میسر ہوں لیکن سفر' ہجرت' مراسلت یا حصولِ علم کی قدرت نہ رکھتا ہو' تو روزِ قیامت اس سے صرف ان اعتقادی مسائل کے بارے میں سوال و جواب کیے جائیں گے جنہیں تنہا عقل کے ذریعے دریافت کیا جا سکتا ہے۔ جیسے خدا کی وحدانیت اور اسی قسم کے دوسرے مسائل۔ بالفاظِ دیگر

۱۔ جو شخص معرفت کے وسائل و امکانات کے باوجود حق کو تلاش نہ کرے اسے جاہلِ مقصر کہتے ہیں۔

صرف ان امور کے بارے میں اس سے مواخذہ کیا جائے گا جنہیں وہ اپنی فطری عقل کے ذریعے دریافت کرسکتا ہے۔ لیکن ایسے امور جن کے بارے میں انسان کسی خارجی تعلیم کے بغیر شناسائی حاصل نہیں کرسکتا، تو اگر حصولِ علم کے لیے کافی وسائل اسکے اختیار میں نہ ہوں، تو وہ معذور ہے۔

عقیدے میں تقلید

☆ وہ اعتقادات جن کے بارے میں غور وفکر اور تحقیق و جستجو لازم ہے، انہیں تقلیدی طور پر اختیار کرنے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ گزشتہ سوال کے جواب کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اس بات کو آگے بڑھاتے ہوئے عرض کرتے ہیں کہ بہت سے لوگ جن حالات اور جس ماحول میں زندگی بسر کررہے ہیں، اپنی سستی اور کاہلی کی وجہ سے اسی میں مگن رہتے ہیں اور خود کو دوسرے مسالک اور مختلف عقائد کے بارے میں غور وفکر، تحقیق اور جستجو کی زحمت میں نہیں ڈالتے۔ ان لوگوں کی یہ حالت کبھی کبھی اس حد کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کے ذہن میں دوسروں کی کم از کم ایک فیصد حقانیت کا خیال بھی نہیں گزرتا۔

قرآن، عقیدے کے بارے میں زمانۂ جاہلیت کے مشرک عربوں کے اس طرزِ عمل کو مسترد کرتا ہے جس پر وہ اصرار کرتے تھے اور ان لوگوں کے یہ کہنے پر کہ: اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓی اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰٓی اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ. (ہم نے اپنے باپ دادا کو ایک طریقے پر پایا ہے اور ہم انہی کے نقشِ قدم کی پیروی کرنے والے ہیں۔ سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۲) ان سے سوال کرتا ہے کہ: اَوَ لَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰی مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ. (چاہے میں اس سے بہتر پیغام لے آؤں جس پر تم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ سورۂ زخرف ۴۳۔ آیت ۲۴) یا: اَوَ لَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ شَيْـًٔا وَّ لَا

یَھۡتَدُوۡنَ. (چاہے ان کے باپ دادا بے عقل ہی رہے ہوں اور ہدایت یافتہ نہ رہے ہوں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ١٧٠)

خداوندِ سبحان انسان کو عقیدے میں تقلید کا پابند نہیں کرتا' بلکہ وہ چاہتا ہے کہ انسان خود اپنی عقل کی مدد سے اپنے لیے عقیدے کا انتخاب کرے۔ اس نے دوسرے عقائد کی حقانیت کے گمان کو اس پر حجت قرار دیا ہے۔ یعنی اگر انسان کے سامنے اس بات کا معقول احتمال موجود ہو کہ جس عقیدے پر وہ ایمان رکھتا ہے اُسکے علاوہ ایک دوسرا عقیدہ حق ہے' تو اس پر لازم ہے کہ اس سلسلے میں رکاوٹ بننے والی ہر قسم کی مشکلات کے باوجود اس نئے عقیدے کے بارے میں تحقیق و تفتیش کرے۔ کیونکہ ہم بکثرت لوگوں کو دیکھتے ہیں جو ایک ماحول میں رہتے ہوئے خاص طرزِ فکر کے حامل ہو جاتے ہیں' لیکن کسی دوسرے ماحول میں منتقل ہونے کے بعد ان پر وہاں موجود رجحانات کا غلبہ ہو جاتا ہے' اور وہ اپنے پہلے طرزِ فکر سے روگرداں ہو جاتے ہیں۔ یہ امر اس فکر کے واقعی ہونے کو ظاہر کرتا ہے جو ایسے ہی انسان کو ذمے دار قرار دیتی ہے جس نے حالات کے سامنے گھٹنے ٹیک دیے ہوں' اس کے خلاف بغاوت کی جرأت نہ رکھتا ہو۔

بلوغ اسلامی نقطۂ نگاہ سے

☆ بلوغ کا مرحلہ علمِ حیاتیات (Biology) کے اعتبار سے بھی اور تکلیفِ شرعی کے پہلو سے بھی ایک انسان کی زندگی کا نقطۂ انقلاب (Turning Point) ہے۔ تربیت' نفسیات اور سماجیات کے بعض ماہرین اس مرحلے کو ایک مردِ مسلم کی زندگی کا پیچیدہ ترین مرحلہ قرار دیتے ہیں۔ بلوغ کے مرحلے کو آپ کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

O اسلام' انسان کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اس بات کی تاکید کرتا ہے کہ اسکے وجود میں اور اسکی شخصیت کے اندر بے چینی اور بے قراری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ جس

مقام پر خداوندِ عالم ہمارے لیے حضرت آدمؑ کو انسان کا ماڈل اور نمونہ قرار دے کر فرماتا ہے: وَ لَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَ لَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا. (اور ہم نے آدم سے اس سے پہلے عہد لیا تھا مگر انہوں نے اسے ترک کردیا اور ہم نے ان کے پاس عزم وثبات نہیں پایا۔ سورۂ طٰہٰ ۲۰۔ آیت ۱۱۵) یہاں ذاتی طور پر ابوالبشر حضرت آدمؑ مراد نہیں ہیں بلکہ ''نوعِ آدم'' مراد ہے، جو مضبوط عزم وارادے کی مالک نہیں۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے: خُلِقَ الْاِنْسَانُ مِنْ عَجَلٍ سَاُورِيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَلَا تَسْتَعْجِلُوْنِ. (انسان کے ضمیر میں عجلت شامل ہوگئی ہے اور عنقریب ہم تمہیں اپنی نشانیاں دکھلائیں گے، تو پھر تم لوگ جلدی نہیں کرو گے۔ سورۂ انبیاء ۲۱۔ آیت ۳۷) اور فرمایا گیا ہے: وَ كَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا. (اور انسان بہت جلد باز واقع ہوا ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۱۱) نیز فرمان ہے: وَ خُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا. (اور انسان تو کمزور ہی پیدا کیا گیا ہے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۲۸) نیز ارشاد ہے: اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ ضُعْفٍ. (اللہ ہی وہ ہے جس نے تم سب کو کمزوری سے پیدا کیا ہے۔ سورۂ روم ۳۰۔ آیت ۵۴) اور فرمان ہے: وَ مَآ اُبَرِّئُ نَفْسِيْ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ. (اور میں اپنے نفس کو بھی بری قرار نہیں دیتا کہ نفس بہرحال برائیوں کا حکم دینے والا ہے، مگر یہ کہ میرا پروردگار رحم کرے۔ سورۂ یوسف ۱۲۔ آیت ۵۳)

چنانچہ بکثرت آیاتِ قرآن اس حقیقت کی ترجمان ہیں کہ تخلیق کے موقع پر انسان کو سراپا قدرت وقوت کے ساتھ خلق نہیں کیا گیا، بلکہ اسکی شخصیت میں کمزور عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔

جب ہم ان کمزور عناصر کی جستجو کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ یہ عناصر انسان کی شخصیت کی گہرائی میں موجود ہیں۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں انسانی جبلتوں کا مثبت کردار انسان کی حیات کی بقا اور دوام کا موجب ہوتا ہے، جبکہ جبلتوں کا منفی عمل اور ان کا انحرافی رُخ انسان کی حیات کے لیے ضرر رساں ہے، اور اس کے اندر توازن کا خاتمہ کردیتا ہے۔ لہٰذا انسان درحقیقت جبلتوں

کے منفی اور مثبت خطوط کے درمیان حرکت کرتا ہے۔ خداوندِ عالم نے شاہراہِ زندگی پر سفر کے لیے انسان کو عقل عطا کی ہے' جو ارادے کی مدد سے انسان کے وجود کے مختلف پہلوؤں میں توازن اور ہم آہنگی ایجاد کر سکتی ہے۔

بلوغ ایک طبیعی حالت ہے

گزشتہ گفتگو کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بلوغ کو انسان کی ایک طبیعی حالت سمجھنا چاہیے۔ اس مرحلے میں انسان میں جسمانی نشوونما کا عمل اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ اسے اپنی جبلّی ضروریات محسوس ہونے لگتی ہیں۔ اس مرحلے کے آغاز پر ایک طرح کی سرکشی اسکے وجود میں انگڑائی لیتی ہے اور اسے دوسروں کی اطاعت اور پیروی سے نکال کر اپنی ذات کے شعور اور خودمختاری کی حالت میں لے آتی ہے۔ لیکن اس موقع پر ایک واضح راہِ راست کی سمت اسکی رہنمائی کرنے والی کوئی چیز موجود نہیں ہوتی۔

بلوغ کا مرحلہ ہو بہو سمندر کی متلاطم موجوں کے توازن اور ٹھہراؤ کے مرحلے کی مانند ہوتا ہے۔ گویا اپنی زندگی کے مرحلۂ ثانی میں داخل ہونے والا انسان اپنے وجود میں ایک نئی شخصیت اور نئی ہستی کے لیے آمادگی پاتا ہے' جس کا آغاز ایسے تجربے سے ہوتا ہے جو اسے ایک یکسر نیا انسان بنا دیتا ہے اور اس جدید مرحلے کے لیے اسکے سامنے ایک نئے قاعدے کی بنیاد رکھتا ہے۔

اس مرحلے میں تربیت کا اہم اور کلیدی کردار سامنے آتا ہے جو انسان کو تباہی سے محفوظ رکھتا ہے' کیونکہ جبلّت کا جنون' بالفاظِ دیگر انسان میں سرکش خواہشات کا طغیان اور ایک غیر واضح افق سے واقفیت اسکے توازن کو درہم برہم کر دیتے ہیں اور اس بے اعتدالی کی وجہ جوان میں تجربے کا فقدان ہوتا ہے جس کی مدد سے وہ اپنے کردار و عمل میں توازن اور اعتدال پیدا کر سکتا ہے۔

اسلام اور بچوں کی نگہداشت

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں بچوں کی دیکھ بھال اور نگہداشت کی بہت زیادہ تاکید کی گئی ہے۔ایک حدیث میں ہے:اترکہ سبعاو ادبہ سبعاو اصحبہ سبعا. (بچے کو پہلے سات سال اسکے حال پر چھوڑ دو، دوسرے سات سال اسے ادب تمیز سکھاؤ اور تیسرے سات سال میں اسکے ساتھی اور دوست بن جاؤ)۔لہٰذا ادب آموزی کا زمانہ جو ۷ برس سے ۱۴ برس کی عمر پر محیط ہے، راہِ راست کی سمت انسان کی رہنمائی کا زمانہ ہے۔اس زمانے میں بچے میں شخصیت کے عناصر تشکیل دینے والے پاکیزہ بیج بونے چاہئیں، تاکہ جب وہ ۱۴ برس یا اس سے قبل یا بعد بلوغ کی منزل پر پہنچے، تو احکام وضوابط کا مطیع وفرمانبردار ہو۔

پھر چودھویں برس سے شروع ہونے والے دوستی اور رفاقت کے زمانے سے مراد یہ ہے کہ زمانۂ بلوغ میں نوجوان کی نگہداشت کے لیے ایسا طریقہ اختیار کیا جائے جو اسکے لیے ایک ایسا ماحول پیدا کردے جس سے براہِ راست استفادے کے ذریعے وہ اپنی آئندہ زندگی کے میدان میں فطری انداز میں قدم رکھ سکے۔

مرحلۂ بلوغ نوجوان کی شخصیت کی تعمیر میں جو خاص اہمیت رکھتا ہے، ہم اسے کم کرنا نہیں چاہتے، لیکن مسئلے کو اس درجہ اہم بھی نہیں سمجھتے جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے، اور وہ اسے انتہائی اہم قرار دیتے ہیں۔البتہ ہم اس بات پر اعتقاد رکھتے ہیں کہ دیکھ بھال، نگرانی اور نگہداشت اس حد تک کڑی نہیں ہونی چاہیے کہ نوجوان خود کو زنجیروں میں جکڑا ہوا سمجھنے لگے، جس کی وجہ سے وہ اندرونی طور پر گھٹن کا شکار ہو جائے اور نفسیاتی مریض بن جائے۔ جبکہ دوسری طرف اسے ایسی مکمل آزادی دینا بھی مناسب نہیں جس میں وہ خود کو ہر حد و حدود، اصول وقانون سے آزاد سمجھنے لگے اور توازن اور اعتدال کے راستے سے پھسل جائے۔مختصر یہ کہ نگہداشت کا عمل ایسا سخت بھی نہ ہو جسے جبر کہا جائے اور ایسا نرم بھی نہ ہو کہ جسے غفلت

اور سستی کہہ سکیں، بلکہ انتہائی نرمی اور انتہائی سختی کے بیچ بیچ ہونا چاہیے۔

نوجوان اور انحرافی طرزِ عمل

☆ زمانۂ بلوغ اور جوانی کی ایک خصوصیت تجربے کی کمی اور ناپختگی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس دور میں انحرافی طرزِ عمل کے مظاہر بہت زیادہ دیکھنے میں آتے ہیں۔ کیا اسلامی تعلیمات میں ایسی ہدایات و رہنمائیاں موجود ہیں جن کے ذریعے اس دور میں واقع ہونے والی لغزشوں کی روک تھام کی جاسکے؟

O اسلام والدین سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ اپنے بچے کے جوانی کے مرحلے میں قدم رکھنے سے قبل ہی اسکی شخصیت کے روحانی پہلو پر توجہ دیں اور اس مقصد کے لیے اسے آہستہ آہستہ عبادت کا عادی اور خدا پرستی کا خوگر بنائیں۔ اسی طرح اسلام جوان (لڑکے اور لڑکی دونوں) کو اپنی خود مختار اور مستقل شخصیت کا احساس عطا کر کے انہیں ''خود اعتمادی'' بخشتا ہے۔

جب جوان کا شعور پختہ ہو جاتا ہے اور اسکے ذریعے وہ اپنے امور و معاملات کا انتظام کر سکتا ہے، تو اسلام اس پر سے بزرگوں کی ولایت اٹھالیتا ہے: وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰۤى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْۤا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ. (اور یتیموں کا امتحان لو جب وہ نکاح کے قابل ہو جائیں، تو اگر ان میں رشید (باشعور) ہونے کا احساس کرو، تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔ سورۂ نساء۴۔ آیت ۶)

رشد ایک ذہنی حالت ہے۔ جس کا سرچشمہ انسان کی عقل اور فکر ہے۔ یہ حالت پالینے کے بعد انسان دوسرے افرادِ معاشرہ کی مانند خود سے متعلق معاملات اور مسائل کے بارے میں عاقلانہ اور متوازن عمل دخل کی قدرت حاصل کر لیتا ہے۔ لہٰذا نوجوانی کا مرحلہ کوئی غیر معمولی مرحلہ نہیں بلکہ انسان کی فطری حالتوں میں سے ایک حالت ہے جس میں انسان سنِ بلوغ گزار کر شعور اور پختگی کے مرحلے میں قدم رکھ رہا ہوتا ہے۔

نوجوانی اور ذمے داری

اسلام کی نظر میں انسان اس وقت مکلّف قرار پاتا ہے جب وہ سنِ بلوغ میں قدم رکھنے کے بعد اپنے اچھے بُرے کا خود ذمے دار ہو جاتا ہے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ اسلام نوجوانی کے مرحلے کو انسان کے لیے فرائض اور ذمے داریوں سے بےتعلقی اور سبک باری کا مرحلہ نہیں سمجھتا کیونکہ ممکن ہے جوانی کا مرحلہ اسکی عمر کے آخری دور تک جاری رہے' اور وہ اس طرح سے کہ جبلّتوں کی سرگرمیاں جو انسان کے منفی پہلو کو اندرونی اور بیرونی عناصر کی تحریک کے ذریعے بیدار کرتی ہیں' وہ ابتدائے شباب سے زندگی کے اختتام تک اس میں پائی جاتی ہیں اور جیسا کہ ہم جانتے ہیں بعض لوگ چالیس' پچاس یا ساٹھ سال کی عمر تک جوان رہتے ہیں۔ کیونکہ جوانی کی کوئی معین عمر نہیں ہوتی' بلکہ یہ ایک ایسی حالت کا نام ہے جس کی سرگرمیاں بلوغ کے آغاز ہی سے شروع ہو جاتی ہیں اور جس کے جسمانی اور نفسیاتی اثرات اس وقت تک جاری رہتے ہیں جب تک انسان کی جبلّتیں بیدار رہتی ہیں۔

نصیحت اور رہنمائی

لہٰذا لازم ہے کہ بچے کے بالغ ہونے سے پہلے ہی اسکی روحانی' فکری اور اجتماعی (نیز دیگر میدانوں میں) رہنمائی کے کام کا آغاز کر دیا جائے۔ تاکہ جوان کو (زمانۂ بلوغ) میں جبلّتوں کی بیداری کے نتیجے میں سامنے آنے والی مشکلات سے محفوظ رکھا جا سکے' نیز یہ رہنمائی زندگی کے دوسرے مراحل میں بھی اسے راہِ راست پر رکھنے کی ضمانت ہو۔ اسکے علاوہ تربیت اور رہنمائی کے اصولوں میں اس بات کو بھی ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے کہ ہم آج کے انسان کو متحرک زندگی اور نت نئے مسائل کے اعتبار سے گزشتہ زمانے کے انسان سے مختلف سمجھیں اور اسے محدود اور مقیّد کرنے کی کوشش نہ کریں' بلکہ اسکی فکر اور روح کے دریچوں کو کھولیں تاکہ وہ زندگی کی صاف اور پاکیزہ ہوا میں سانس لے سکے۔

استمنا یا خود لذتی، مجرم کون ہے؟

☆ زیر بحث موضوع سے تعلق رکھنے والا ایک مسئلہ جس پر شرعی نقطۂ نظر اور عمومی رہنمائی کے پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے، وہ خود لذتی یا استمنا (Hand Practices) کا مسئلہ ہے۔ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

○ اسلام ''خود لذتی'' کو حرام قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام چاہتا ہے کہ انسان صرف ازدواجی تعلقات کے ذریعے جنسی تسکین حاصل کرے۔ لہٰذا جنسی تسکین کے لیے شرعی اور اخلاقی اصولوں کے برخلاف کوئی بھی طریقہ اپنانا اسلام کے نقطۂ نظر سے مردود اور مذموم ہے، اسکے علاوہ اسکے نفسیاتی اور طبی نتائج بھی برآمد ہوتے ہیں۔

لہٰذا خود لذتی حرام اور ممنوع عمل ہے۔ خواہ اسکے لیے کوئی بھی طریقہ اختیار کیا جائے۔ حتیٰ جنسی تحریک کا سبب بننے والے ایسے تصورات بھی، جو منی کے اخراج پر منتہی ہوں، حرام ہیں۔

اگر ہم ان قدرتی اور حقیقی وجوہات کو جاننا چاہیں جو نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں میں اس قبیح اور ناپسندیدہ عادت کا سبب بنتی ہیں، تو ہمیں معاشرے میں موجود طرح طرح کے دباؤ اور رکاوٹوں میں اسکی وجوہات تلاش کرنی چاہئیں۔ اسکی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ہمارے سماجی رسم و رواج نے مرد و زن کے ملاپ کے لیے صرف دائمی عقد کا دروازہ کھلا چھوڑا ہے۔ دوسرا سبب معاشی دباؤ ہے جو نوجوان کی جلد شادی میں رکاوٹ بنتا ہے۔ ایک اور وجہ معاشرے کی وہ فرسودہ روایات ہیں جو شریکِ حیات کے انتخاب کے سلسلے میں لڑکی کو سبقت کرنے سے باز رکھتی ہیں۔

جلد شادی

اسلام جلد شادی کی تاکید کرتا ہے اور ازدواج کو ایک طبیعی امر کے بطور پیش کرتا ہے۔

نیز اسے معاشرے کی مسلط کردہ تمام قیود سے مبرا قرار دیتا ہے۔ مثلاً فکری پختگی' معاشرتی مقام اور معاشی قدرت وغیرہ جیسی شرائط۔

اسلام کی نظر میں شادی کا (ایک) مقصد مرد وزن کی جنسی جبلّت کی تسکین ہے۔ نیز وہ سمجھتا ہے کہ اس رشتے کے پہلو بہ پہلو دوسرے مسائل بھی نشو ونما' تکامل وترقی پا سکتے ہیں' جیسے کہ مختلف دوسرے روابط وتعلقات میں ہوتا ہے۔

البتہ بچوں کی پیدائش اور ان کی تربیت جیسے مسائل کے لیے مناسب راہِ حل نکالے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ ان مسائل کا بہرصورت سامنا کرنا پڑے گا' چاہے شادی دیر سے کی جائے یا ابتدائے شباب میں۔ لیکن اسلام لڑکے لڑکیوں کی جلد شادی کر دینے کی تاکید کرتا ہے اور مہر کو لڑکی کی رضامندی کے حصول کے صرف ایک ذریعے کے عنوان سے ملحوظ رکھتا اور معتبر سمجھتا ہے۔ اسی طرح اسلام مالی اور اقتصادی پہلو سے بھی شادی کو سہل بنانے کی تاکید کرتا ہے۔ جبکہ معاشرتی رسوم ورواج نے اس پہلو سے بھی شادی کو مشکل بنادیا ہے۔

اسلامی احکام وتعلیمات کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں زندگی بسر کرنے والے طالبِ علم اپنا تعلیمی سلسلہ جاری رکھتے ہوئے بھی شادی کا بندھن قائم کر سکتے ہیں۔ اگر لڑکا اور لڑکی دونوں ہی طالبِ علم ہیں' تو اس دوران چاہیں تو اپنے والدین ہی کے گھر میں رہائش اختیار کریں یا ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیں اور ایسی سادہ زندگی بسر کریں جو ان کے زمانہ طالبِ علمی کا تقاضا ہے۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ معاشرے کی تقلید میں سماجی اور اقتصادی پابندیاں مسلط کر کے شادی کے راستے میں آہنی رکاوٹیں حائل کردی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب تیس برس یا اس سے زیادہ عمر کو پہنچ کر شادی کی نوبت آتی ہے۔

بہرصورت اسلام نے (مسائل کے باوجود) ابتدائے شباب ہی میں شادی کو بہت سی روحانی اور اخلاقی مشکلات کے حل کی ایک بنیادی راہ کے طور پر پیش کیا ہے۔

ازدواجِ موقت (متعہ)، اور جنسی مسئلے کو قبیح سمجھنا

فقہ امامیہ میں اس مسئلے کے حل کی ایک اور راہ بھی تجویز کی گئی ہے، جسے ازدواجِ موقت (متعہ) یا غیر دائمی نکاح کہا جاتا ہے۔ البتہ اس سلسلے میں دوشیزاؤں کے لیے خاص طور پر شرعی اور سماجی احتیاطوں کو پیشِ نظر رکھا گیا ہے، جبکہ بیوہ اور طلاق یافتہ خواتین کے لیے اس طرح کی کوئی مشکل نہیں۔

اسلام جنسی جبلّت کی تسکین کے لیے مرد و زن کے درمیان جائز جنسی تعلق کو ایسا پست تعلق نہیں سمجھتا جو عورت کی حیثیت اور احترام گھٹانے کا موجب ہو۔ اسلام کی نظر میں جنسی تسکین بھی کھانے اور پینے کی مانند ایک مکمل فطری ضرورت ہے، اور اگر کوئی انسان اپنی اس جسمانی طلب کو (شرعی ضوابط کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے) دوسرے انسان کے ذریعے سے پورا کرے، تو یہ عمل اسکی شخصیت، عزت، حیثیت اور احترام کو کوئی نقصان نہیں پہنچاتا۔ جنسی مسائل کے بارے میں معاشرے میں رائج توہمات کو قبول کرنا درحقیقت فطرت سے دور ہونا اور اسے فراموش کر دینا ہے۔

جنس ایک مکمل فطری مسئلہ ہے۔ لہٰذا عورت اور مرد باہمی رضامندی سے شادی کا فیصلہ کرنے کے بعد (شرعی اور قانونی تقاضے پورے کر کے) انتہائی فطری طور پر ایک دوسرے کی جنسی احتیاج کی تسکین کر سکتے ہیں اور اس میں اصلاً کسی کی تحقیر یا تذلیل کا پہلو نہیں نکلتا۔ کیونکہ یہ سننِ الٰہی میں سے ایک ہے۔ اگر مرد و زن کے لیے دائمی نکاح ممکن نہ ہو، تو وہ شرعی شرائط ملحوظ رکھ کر اور معاشرتی ضوابط کو سامنے رکھتے ہوئے (اگر معاشرہ اسے قبول کر سکے تو) نکاحِ موقت کر سکتے ہیں۔ اس نکاح کے نتیجے میں ہر چند نہ چاہتے ہوئے متولد ہونے والے بچے زوجین کے شرعی بچے شمار ہوتے ہیں۔

اس مسئلے میں اصل مشکل معاشرے کی طرف سے پیدا کردہ ہے، جس نے نوجوان

لڑکوں اور لڑکیوں پر اس سرکش خواہش (جس کا عمر کے اس حصے میں قدرتی طور پر انسان کو سامنا ہوتا ہے) کی تسکین کے تمام دروازے بند کردیے ہیں اور یوں دانستہ یا نادانستہ طور پر انہیں خودلذتی اور استمنا کی اس بُری لت کی جانب دھکیل رہا ہے۔

جنسی تعلیم اور معاشرتی رجحانات

☆ معاشرے میں رائج اقدار کی موجودگی میں جنسی مسائل کے بارے میں عوام الناس کے خیالات کی تصحیح کس طرح کی جائے اور اسے صحیح سمت دینے کے سلسلے میں مشکلات اور پیچیدگیوں کو کس طرح برطرف کیا جائے؟

O اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں جنسی مسائل کے بارے میں معاشرے کے ذہن کو بدلنا ہوگا' اسکے بارے میں یہ تصور ختم کرنا ہوگا کہ یہ ایک گندی اور پلید چیز ہے' اور اس ذہنیت کی اصلاح کرنی ہوگی جو اسے عورت کی عزت واحترام کے منافی سمجھتی ہے۔

نیز شادی کی رسوم و رواج کے خلاف ایک سماجی انقلاب برپا کرنا ہوگا جو اسے سادہ اور فطری بنائے اور غیر اسلامی تمدنوں سے آنے والے فضول رسوم و رواج کا اس سے خاتمہ کردے۔ اسلام چاہتا ہے کہ شادی سہل اور مرد وزن کے لیے ایک معمول کی چیز ہو جائے۔

یہاں ایک اہم نکتہ قابلِ ذکر ہے' اور وہ یہ ہے کہ عقدِ نکاح کے شرعی صورت میں جامۂ عمل پہننے کے لیے کسی خاص معاشرتی رسم یا دینی ادارے کی بالا دستی لازم نہیں ہے۔ اگر زوجین میں شرعی شرائط پائی جائیں' تو بس اتنا کافی ہے کہ عورت مرد سے کہے: "زوجتک نفسی بمهر قدره کذا۔ (یعنی میں مہر کی فلاں مقدار کے عوض اپنے آپ کو تمہاری زوجیت میں دیتی ہوں) اور مرد کہے: قبلت الزواج بالمهر المعلوم او الشرط المعلوم۔ (یعنی میں فلاں معلوم مہر یا فلاں معین شرط کے ساتھ تمہیں اپنی زوجیت میں قبول کرتا ہوں) اس طرح یہ دونوں شریعت کی نگاہ میں میاں بیوی ہو جاتے ہیں۔

مذہبِ شیعہ امامیہ میں نکاح کے لیے دو گواہوں کی موجودگی بھی شرط نہیں ہے' بلکہ مستحب ہے۔ کیونکہ کبھی کبھی ایسے حالات بھی پیش آتے ہیں کہ شادی ضروری ہوتی ہے لیکن دو گواہ میسر نہیں ہوتے۔ قانونی اور شرعی اداروں میں نکاح کی رجسٹریشن ہو بہو دوسرے معاہدوں اور معاملوں کی رجسٹریشن کی مانند ہے' جس کا مقصد قانونی لحاظ سے ان معاہدوں کو محکم اور معقول بنانا ہوتا ہے۔ رجسٹریشن کرانا یا نہ کرانا عقد و معاہدے کی شرعی حیثیت پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ عقدِ نکاح کا شرعی ہونا خرید و فروخت اور شراکت جیسے معاہدوں کی مانند طرفین کے باہمی قول و قرار سے تعلق رکھتا ہے' اسکے لیے کسی اور شرط کی ضرورت نہیں ہوتی۔

اگر ہم نوجوانوں کو گناہ اور گمراہی سے محفوظ رکھتے ہوئے، ان کی جنسی مشکل کا حل نکالنا چاہتے ہیں' تو ہم پر لازم ہے کہ شادی بیاہ کے مسئلے کو سہل اور آسان بنائیں اور اسے معاشرتی رسوم و رواج کے بھاری پتھروں کے بوجھ سے نجات دلائیں' جن کی وجہ سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی نظر میں شادی ایک کٹھن مشکل بن کر رہ گئی ہے۔ شادی کا اس طرح مشکل ہو جانا لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے گمراہی اور انحراف کے وسیع دروازے کھول رہا ہے۔

عشق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر

☆ جنسِ مخالف (لڑکوں اور لڑکیوں) کے درمیان دوستی اور عشق کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر کیا ہے؟ کیا آپ اسے شرعاً جائز سمجھتے ہیں؟ بالخصوص یہ علم ہوتے ہوئے بھی کہ بسا اوقات یہ عشق و محبت غیر ارادی ہوتا ہے؟

○ اسلام تمام انسانوں (مردوں اور عورتوں) میں انسان دوستی کا گوہر دیکھنا چاہتا ہے۔ اس احساس کی بدولت انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کے بارے میں مہربانی کے ایسے جذبات پیدا ہوتے ہیں کہ وہ بنی نوع انسان سے مہر و محبت کو اپنی انسانیت کا تقاضا سمجھنے

لگتا ہے۔ یہ جذبہ اسے دوسرے انسانوں کی مدد ونصرت‘ ان کی احتیاجات کی تکمیل‘ ان کی شخصیت اور عزت واحترام کے تحفظ کے لیے تیار کرتا ہے۔ رسولِ کریمؐ کی ایک حدیث ہے جس میں آپ ایمان اور محبت ودوستی کے درمیان ربط وتعلق قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

”لا یومن احدکم حتی یحب لاخیہ ما یحب لنفسہ ‘ ویکرہ لہ مایکرہ لنفسہ.“

”تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا‘ جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لیے پسند کرتا ہے‘ اور اسکے لیے بھی اسی چیز کو ناپسند کرے جسے اپنے لیے ناپسندیدہ سمجھتا ہے۔“

اس حدیث سے پتا چلتا ہے کہ اسلام انسانوں میں باہمی محبت اور ہمدردی کا احساس بخشنے والی دوستی کی اس حد تک تاکید کرتا ہے کہ ایسی دوستی کو ایمان کا مظہر قرار دیتا ہے۔ لہٰذا اگر آپ دوسرے انسانوں کو لاتعلقی اور بے لطفی کی نگاہ سے دیکھیں اور ان کے مسائل و معاملات کے حل کے لیے اہتمام نہ کریں‘ تو آپ مومن نہیں۔ اس مسئلے کی ایک اور روشن گواہ پیغمبرکی یہ معروف حدیث ہے:

”من لم یھتم بامور المسلمین فلیس بمسلم.“

”ایسا شخص جو دوسرے مسلمانوں کے امور کے بارے میں اہتمام نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔“

اہم مسئلہ یہ ہے کہ ہر انسان پر اپنے ہم نوعوں سے محبت اور حسنِ سلوک لازم ہے۔ ایک شخص نے جب امام جعفر صادقؑ سے محبت اور دوستی کے بارے میں سوال کیا‘ تو آپ نے فرمایا:

”ھل الدین الا الحب؟“

”کیا دین دوستی اور محبت کے سوا کچھ اور ہے؟“

ہماری مذکورہ گفتگو انسان دوستی کے پہلو سے تھی لیکن سوال میں جو مسئلہ اٹھایا گیا ہے اس کی نوعیت دوسری ہے۔ اور وہ انسان کی (جنسی) جبلّت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس نوع کی دوستی انسان کو اس بات پر ابھارتی ہے کہ وہ دوسروں کو بالکل اسی طرح دوست رکھے جس طرح کھانے اور پینے کو دوست رکھتا ہے۔ اس طرح کی دوستی میں جنسی پہلو پیشِ نظر ہوتا ہے اور ایک انسان دوسرے انسان کی جانب جنسی کشش کی بنا پر اس سے محبت کرتا ہے۔ بہت سے نوجوانوں میں یہ حالت ابتدائے شباب اور اسکے بعد وجود میں آتی ہے اور اس کا اظہار جسمانی خوبصورتی اور جنسی جبلّت کو تحریک دینے والے عناصر کی جانب ان کی رغبت کی صورت میں ہوتا ہے۔

اسلام کی نگاہ میں اس قسم کی محبت اور عشق صرف اسی صورت میں قابلِ قبول ہے جب وہ شادی کی تمہید ہو اور عقدِ نکاح پر منتج ہو۔ لہٰذا اگر کوئی مرد کسی عورت کی جانب شادی کی غرض سے مائل ہو، اس سے محبت کرے اور اسکی خوبصورتی پر شیفتہ ہو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مرد کے لیے ایسی عورت پر نگاہ ڈالنا مباح قرار دیا ہے جس سے وہ شادی کا ارادہ رکھتا ہو۔ لیکن ایسی محبت اسلام کی نظر میں شدت کے ساتھ مردود اور ناپسندیدہ ہے جس کا اصل مقصد تفریحِ طبع ہو اور جو ازدواجی زندگی کے استحکام کو محفوظ رکھنے والے قوانین کے تابع نہ ہو۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہر ایسی چیز جس کا نتیجہ جنسی گمراہی کی صورت میں برآمد ہو، خواہ اس کا تعلق دل سے ہو، آنکھوں سے ہو، زبان سے ہو، یا ہاتھ سے یا دوسرے اعضائے جسمانی سے۔ مختصر یہ کہ کوئی بھی ایسا عامل جو جنسی تحریک اور گمراہی کا موجب ہو سکتا ہو، اسلام کی نظر میں مذموم اور مردود ہے۔ کیونکہ اس وجہ سے ایسی اخلاقی مشکلات پیدا ہوتی ہیں جو انسان کو اس راہِ راست سے دور کر دیتی ہیں جس پر خدا اسے گامزن رکھنا چاہتا ہے۔

لیکن جب ہم محبت کو ایک اندرونی اور غیر اختیاری حالت کا عنوان دے کر اسکے

بارے میں گفتگو کرتے ہیں، تو اس صورت میں اسے کسی مخصوص قاعدے اور قانون کی حدود میں قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے انسان کو کسی ایسی چیز کا مکلّف نہیں کیا ہے جسکی اس میں طاقت نہیں ہے، یا جو نامعقول ہے۔ اسلام جذبات واحساسات کو بھی عقلانیت بخشنا چاہتا ہے، تاکہ اس طرح انسان کے جذبات واحساسات کی لگام عقل کے سپرد کردے اور وہ مسائل کو صرف سطحی نظر سے نہ دیکھے بلکہ ان پر گہرائی کے ساتھ غور وخوض کرے۔

اسی تربیتی اسلوب پر اسلام لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کرنا چاہتا ہے۔ اور یہ نہیں چاہتا کہ جوان لڑکے اور لڑکیاں صرف ایک اتفاقی نگاہ یا سطحی محرک کی بنا پر ایک دوسرے کی محبت میں گرفتار ہو جائیں۔ اسلام کا یہ اصول صرف رشتۂ ازدواج ہی کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ تمام انسانی تعلقات جیسے دوستی، شراکت (partnership) وغیرہ کے بارے میں بھی اسی اصول پر اسلام تاکید کرتا ہے۔

دوسری طرف اسلام نے اس قسم کی محبت اور دوستی کے لیے ضوابط وشرائط وضع کیے ہیں۔ اسلام لڑکے اور لڑکی کے تنہائی میں ملنے جلنے کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا۔ نیز انہیں اس دوستی کو ایسے کسی بھی عمل تک بڑھانے کی اجازت نہیں دیتا جو ان کی جنسی تحریک کا موجب ہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ انہیں اپنے مخلصانہ جذبات کی ترجمان پاکیزہ گفتگو سے نہیں روکتا، ایسے جذبات جوان کے درمیان شرعی تعلق کے قیام کا راستہ ہموار کرتے ہیں۔

پاکیزہ محبت اور نفسانی محبت

☆ کیا آپ اس قسم کی محبت کے بارے میں کچھ فرمائیں گے جسے ''پاکیزہ محبت'' کا نام دیا جاتا ہے؟

○ جب ہم محبت کو ایک احساس کا عنوان دے کر اسکے بارے میں گفتگو کرتے ہیں، تو اسے پاکیزہ محبت اور نفسانی محبت کے خانوں میں تقسیم نہیں کر سکتے۔ البتہ اس بات سے انکار

نہیں کیا جا سکتا کہ جنسی جبلّت کے زیرِ اثر بھی ایک خاص حالت پیدا ہوتی ہے جسے کبھی کبھی ''محبت'' کا نام دے دیا جاتا ہے۔ حالانکہ وہاں جسمانی کشش اور جاذبیت کی بنا پر ایک دوسرے کی جانب کشش پیدا ہوتی ہے' یہ ایک انسان سے دوسرے انسان کی محبت نہیں ہوتی۔ جسموں کا ایک دوسرے کی جانب میلان اپنے مطلوب و مقصود کے حصول کے لیے ایک طرح کی جسمانی سرگرمی ہے۔ اس میں انسانی پہلو کا کوئی کردار نہیں ہوتا۔

لیکن محبت ایک ایسے انسانی احساس کا نام ہے جو کسی انسان میں کوئی نیک صفت یا اعلیٰ فکر و عمل دیکھ کر اسکے بارے میں پیدا ہوتا ہے اور محبوب کی جانب محبّ کی کشش کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا ہمیں جنسی تحریک کا سبب بننے والے احساس اور کسی انسان سے اس کی عظمت کی بنا پر پیدا ہونے والے تعلق کا موجب بننے والے جذبے کے درمیان فرق رکھنا چاہیے۔

نوجوانوں کو جنسی تعلیم کس طرح دی جائے؟

☆ جوانوں کے سامنے جنسی تعلیم کیسے پیش کی جائے؟

○ ہمیں اس مسئلے کو خاص حدود میں محصور نہیں کرنا چاہیے۔ بسا اوقات ایسی کتابیں لکھنے کی بھی ضرورت ہے جو اس مسئلے کی وضاحت پر مشتمل ہوں۔ اسی طرح جب ہم لوگوں سے احکامِ شرعی بشمول جنسی مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں' تو وہاں ان سے متعلق اصطلاحات کا استعمال ضروری ہو جاتا ہے' تاکہ لوگ اس بارے میں اپنے شرعی فریضے سے آگاہ ہو جائیں۔ خود ہمارا اپنا طرزِ عمل یہ ہے کہ جب لوگ ہم سے بعض ایسے جنسی مسائل کے بارے میں سوال کرتے ہیں' جو معاشرے کو درپیش ہیں اور جن کی تشریح معاشرے کے لیے قابلِ برداشت ہے' تو ہم صراحت کے ساتھ ان کے جواب دیتے ہیں۔ کیونکہ ہماری رائے یہ ہے کہ جنسی تعلیم بھی دوسری تعلیمات ہی کی مانند ہے' جسے ہمیں علمی انداز میں کتب و مقالات اور گھروں میں اور عمومی گفتگو کے ذریعے نوجوانوں کے اذہان تک پہنچانا چاہیے۔

اس قسم کے مسائل کا تعلق انسان کے بدن اور اسکی جبلت سے ہے۔ پس انسان کا ان معاملات سے واقفیت رکھنا طبیعی امر ہے۔

ان مسائل سے آشنائی کے بارے میں معاشرہ جو پابندیاں عائد کرتا ہے وہ فرسودہ رسوم ورواج کے دباؤ کا نتیجہ ہیں۔ لہٰذا ان رسوم و رواج کے خاتمے کے لیے ہمیں ان کا مقابلہ حکمت کے ساتھ کرنا ہوگا تاکہ اسکے الٹے نتائج برآمد نہ ہوں اور ہمارے لیے پہلے سے بڑھ کر مشکلات جنم نہ لے لیں۔

اسلام اور جنسی تعلیم کی بنیاد رکھنا

☆ اس تعلیم کی حدود اور ابواب کیا ہیں؟ کیا آپ اس تعلیم کے لیے کسی خاص عمر کے قائل ہیں؟

○ اسلام نے تمام مسلمانوں کے لیے جنسی تعلیم کے دروازے کھولے ہیں اور اس حقیقت کا مشاہدہ ہم ان قرآنی آیات میں کرتے ہیں جن میں قریب قریب واضح الفاظ میں جنسی تعلقات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ حتیٰ ازدواج کے لیے قرآنِ کریم میں استعمال ہونے والی تعبیر ''نکاح'' عقد سے زیادہ ایک جنسی مفہوم کی جانب اشارہ کرتی ہے۔

معصومینؑ کی سنتِ شریفہ کا مطالعہ کیا جائے تو ہم وہاں بھی ایسی احادیث پاتے ہیں جن میں مباشرت سے متعلق احکام، اسکے مستحبات اور دوسرے جنسی مسائل کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ حتیٰ بعض میں تو صراحت کے ساتھ جنسی اعضا کا ذکر آیا ہے۔ یہاں تک کہ ان احادیث کا مطالعہ کرنے والا انسان محسوس کرتا ہے کہ صدرِ اسلام کا اسلامی معاشرہ اس قسم کی گفتگو کو اخلاق کے منافی نہیں سمجھتا تھا۔

اسی طرح ایسی احادیث بھی موجود ہیں جو رسولِ کریمؐ اور ایسے افراد کے درمیان مکالمے پر مشتمل ہیں جو اپنے زنا کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہاں ہم دیکھتے ہیں کہ اس فرد سے

اسکے انجام دیے گئے عمل کی صورت کے بارے میں ایسا سوال کیا جاتا ہے جس کا کھل کر جواب دیتے ہوئے آج کے لوگ بھی شرم محسوس کرتے ہیں۔

نیز ایسی احادیث بھی ہیں جن میں خواتین سے متعلق مسائل جیسے حیض، نفاس و استحاضہ اور جنابت وغیرہ کے حوالے سے میاں بیوی کے روابط کے بارے میں واضح الفاظ میں گفتگو کی گئی ہے۔

جب فقہا کی کتب اور جنسی مسائل سے متعلق ابواب کا مطالعہ کرتے ہیں، تو وہاں بھی ان مفاہیم کی تشریح کرتے ہوئے مخصوص اعضا و جوارح اور جنسی عمل اور اس سے مربوط بعض چیزوں کے بارے میں واضح لفظوں میں گفتگو کی گئی ہے۔

اسی طرح ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ بعض علمائے سلف نے بھی اپنی کتب میں جنسی مسائل اور ایسے نکات و نوادر و لطائف تحریر کیے ہیں، جنہیں آج کا معاشرہ غیر مؤدبانہ شمار کرتا ہے۔ بعض قدیم کتابوں میں (جنہیں زاہد اور مقدس علما نے تالیف کیا ہے) ایسی فصول اور ابواب موجود ہیں جن میں جنسی عمل کی غیر معمولی اور غیر معروف کیفیات کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے اور ان علما کے اس کام کی بنیاد اور اساس یہ سوچ تھی کہ ان مسائل کو تحریری صورت میں پیش کر کے وہ شادی شدہ جوڑوں کو جنسی مسائل سے آگاہ کرنا چاہتے تھے، تاکہ ان مسائل سے واقفیت کے نتیجے میں وہ ایک دوسرے سے اپنی فطری ضروریات کی تسکین کریں اور انہیں ان تمایلات اور ضروریات کی تسکین کے لیے ازدواجی زندگی کی حدود سے باہر نکلنے کی ضرورت نہ رہے۔

لہٰذا اب ہم اطمینان کے ساتھ یہ بات کہہ سکتے ہیں کہ اسلام نے انسانی حیات کے اس پہلو کو بھی احکامِ شرع (واجب، حرام اور مستحب) سے مربوط کر کے ایک قسم کی جنسی تعلیم کا اہتمام کیا ہے۔ اور جب ہم اس مسئلے پر تحقیق کرتے ہیں اور اسکی بنیاد پر توجہ مرکوز کرتے ہیں، تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ جنسی تعلیم حرام اور ممنوع کے دائرے میں نہیں آتی بلکہ حلال

اور مجاز امور کے دائرے میں داخل ہے۔

البتہ کبھی کبھی معاشرے کی سماجی اور تہذیبی تبدیلیوں کی بنا پر جنسی تعلیم یا اسکی کسی خاص شکل سے کچھ منفی اثرات بھی مرتب ہوتے ہیں۔ بالخصوص جب اس تعلیم میں بچے اور نوجوان بھی شامل ہوں اور وہ بچے کو اس تعلیم کے تجربے پر ابھارنے کا سبب بن کر اسے پاکیزہ اسلامی راستے سے دور کر کے منفی نتائج کا موجب ہو۔

لہٰذا جنسی تعلیم کے لیے بہت زیادہ باریکی اور ہوشیاری کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے، اور اسکے لیے ماحول، میدانِ اثر اور مخاطب کی شخصیت سے کافی واقفیت لازم ہے۔

ایک اور چیز جسے ہم تاکیداً عرض کرنا چاہتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جنسی تعلیم کی ابتدا معاصر تبدیلیوں کے بعد نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ اسلام نے صدیوں پہلے ان تمام جزیات کے ساتھ، جن کی جانب ہم نے اشارہ کیا ہے، اس تعلیم کی بنیاد رکھ دی تھی۔

جنسی تعلیم کی تنظیم کی ضرورت

نسلِ نو کو جنسی مسائل سے آگاہ کرنے کے لیے منصوبہ بندی ضروری ہے۔ یعنی اس بارے میں طریقۂ کار کی خصوصیات، مضامین اور ماحول کے لیے ایک باضابطہ پروگرام کی تشکیل لازم ہے، تاکہ اس عمل پر علمی رنگ غالب رہے اور اس سے جنسی تحریک کے اسباب فراہم نہ ہوں۔ اس عمل کے دوران بچوں اور نوجوانوں کو یہ بات سمجھائی جائے کہ ان کے اعضائے جنسی کوئی انوکھی چیز نہیں ہیں، بلکہ اسکے برعکس مکمل طور پر فطری چیز ہیں۔ اور ان کی وجہ سے ان میں کسی قسم کی شرمندگی، عیب اور ذلت کا احساس جنم نہیں لینا چاہیے۔ البتہ ان اعضا کے بارے میں شرعی احکام موجود ہیں، جن کی رو سے ان کا پوشیدہ رہنا ضروری ہے اور جوان کی سرگرمیوں کا دائرہ صرف انہی حدود تک جائز قرار دیتے ہیں جنہیں خدا نے معین کیا ہے۔ یہ اعضا بھی دوسرے اعضائے بدن کی مانند ہیں، جن کے بارے میں ممنوعات اور

محرمات کا ذکر کیا گیا ہے' مثلاً فلاں غذا کھانا حرام ہے' فلاں مقام پر نظر ڈالنا ممنوع ہے' وغیرہ وغیرہ۔

ان مسائل کے بیان سے پہلے مناسب فضا ایجاد کرنے کی ضرورت ہے' اور ہمارا فرض ہے کہ اس فضا کو وجود میں لانے کے لیے پروگرام وضع کریں۔ کیونکہ بہت سے معاشروں میں اسے اخلاق کے منافی عمل سمجھا جاتا ہے۔ اگر ہم اس مسئلے کے بارے میں کوئی لائحۂ عمل مرتب کرلیں' تو نوجوانوں کو جنسی مسائل سے روشناس کرانے کی صلاحیت حاصل کرسکتے ہیں۔

یہ تعلیم ایک علم کی صورت میں ان تک منتقل کی جانی چاہیے۔ اس سلسلے میں ہم نومولود کی ولادت اور جنین کی پیدائش کے موضوع سے شروع کرسکتے ہیں' لیکن یہاں بیان میں صراحت کو مدِنظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ البتہ ایک منظّم طریقے سے اور لائحۂ عمل کے طے شدہ مراحل سے ہم آہنگی کے ساتھ۔

جنسی مسائل بسا اوقات کچھ بچوں کو اسکے تجربے پر بھی ابھارتے ہیں' اسی طرح' جس طرح بعض بچے ٹیلی ویژن کے کسی ڈرامے یا فلم کے کسی منظر کو نقل کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس وجہ سے کبھی کبھی اپنے لیے مشکلات بھی کھڑی کرلیتے ہیں۔ اسی طرح کچھ لوگ جنسی فلمیں دیکھنے کے بعد یا جنسی داستانیں پڑھنے کے بعد ہیجان میں مبتلا ہوکر گمراہی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اگر جنسی تعلیم کا رواج ہوتا' تو نفسیاتی اور روحانی اور معاشرتی فضا ایسی بن جاتی جس میں اس جبلّت کو صحیح رُخ دیا جاسکتا۔ اس بات پر بھی توجہ ضروری ہے کہ دورِ حاضر میں ٹیلی ویژن' اخبارات اور جرائد کی صورت میں گھر گھر داخل ہوچکنے والے ذرائع ابلاغ نے جنسی مسائل سے متعلق بھی نوجوانوں کی معلومات میں اضافہ کیا ہے۔ یہاں تک کہ ان مسائل کے بارے میں وہ اپنے والدین سے زیادہ جاننے لگے ہیں۔

لہٰذا جنسی تعلیم آج کے دور کی حقیقی اور لازمی ضرورت ہے۔ کیونکہ آج فلموں اور ارزاں قیمت کتابوں کے ذریعے (گمراہ کن) جنسی مسائل کو بغیر کسی حدود اور ضابطے کے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کے سامنے پیش کیا جاتا ہے۔ اس لئے تو سے معاشرے کی اصلاح چاہنے والے افراد پر لازم ہے کہ وہ ایک متعین لائحہ عمل کے ذریعے نسل نو کو گمراہ کن جنسی تعلیمات سے نجات دلائیں۔

گھر اور اسکول کی ذمے داری

☆ آپ کی نظر میں گھر میں جنسی تعلیم دینا بہتر ہے یا اسکول میں؟

○ ہم اس مسئلے کی حد بندی نہیں کر سکتے اور نہ ہی اسے کسی محدود دائرے میں محبوس کر سکتے ہیں۔ اگر کسی بچے کے ذہن میں نومولود کی ولادت کے بارے میں سوال پیدا ہو، یا وہ (لاشعوری طور پر) اپنے اعضائے تناسل کی طرف متوجہ ہو، یا کسی لڑکی کے ذہن میں یہ خیال اٹھے کہ وہ شکل و صورت میں اور جسمانی ساخت میں اپنے بھائی سے مختلف ہے۔ تو ایسی صورت میں ضرورت تقاضا کرتی ہے کہ جنسی مسائل کے بارے میں گھر میں بھی گفتگو ہو۔

لیکن اس سے قبل ان مسائل کے بارے میں والدین کا صحیح صحیح معلومات کا حامل ہونا ضروری ہے تاکہ وہ بچوں کے ان سوالات کے جچے تلے انداز میں درست جواب دے سکیں۔

علاوہ ازایں بیرونِ خانہ بالخصوص اسکولوں میں بھی اس تعلیم کی ضرورت ہے۔ خاص طور پر جبکہ اسکولوں کے درسی نصاب میں انسانی صحت اور حیوانات کی تولید اور ان کی دوسری خصوصیات وغیرہ سے متعلق مضامین پہلے ہی سے شامل ہیں، اور یوں طالب علم کے سامنے (خود بخود) ایسے مسائل آتے ہیں جو جنسی تعلیم سے مربوط ہیں اور اساتذہ کے لیے بھی ان کی تفہیم کے لیے انہیں وضاحت اور تفصیل سے بیان کرنا ضروری ہوتا ہے۔

جنسی ماحول

آج ہماری ایک مشکل یہ بھی ہے کہ مغربی تمدن کی تقلید میں ہمارے معاشرے پر بھی جنسی رنگ غالب آ گیا ہے اور جنس کا موضوع بھی ان موضوعات میں سے ایک ہو گیا ہے جن کے اظہار میں ہر انسان خود کو مکمل طور پر آزاد محسوس کرتا ہے۔ اگر مشرقی معاشروں میں جنس کے بارے میں پابندی اور پاس ولحاظ کا عنصر موجود نہ ہوتا' تو اب تک مغرب کی گمراہ تہذیب مشرقی ماحول کو اسلامی ماحول سے بدل کر اس شترِ بے مہار مغربی تمدن میں ڈھال چکی ہوتی جس میں اہلِ مغرب زندگی بسر کر رہے ہیں۔

اس بنیاد پر ایسے ماحول میں جنسی تعلیم دیتے ہوئے گہری احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی ضرورت ہے۔ بصورتِ دیگر ممکن ہے کہ اس عمل سے انحراف اور گمراہی کی راہ مزید ہموار ہو جائے۔

عیب کا مفہوم

جب ہم کسی کے لیے عیب کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ اُس شخص میں اخلاقی' جسمانی یا طرزِ عمل کا کوئی نقص پایا جاتا ہے۔ لہٰذا اخلاقی انحراف کو بھی عیب کہا جا سکتا ہے۔ لڑکیوں کا اپنی عزت برباد کر بیٹھنا' ان کے گھرانے کے لیے ذلت اور عیب سمجھا جاتا ہے' اسی طرح جنسی اعضا کا لوگوں کے سامنے ظاہر کرنا بھی عیب ہے۔

یہ دونوں عمل اپنی شرعی حرمت کی وجہ سے معیوب سمجھے جاتے ہیں۔ شرع ان دونوں اعمال کو دین میں ضعف اور کمزوری کی علامت قرار دیتی ہے۔ اسکے علاوہ یہ اعمال معاشرتی لحاظ سے بھی مذموم ہیں' کیونکہ معاشرتی روایات بھی انہیں مناسب نہیں سمجھتیں۔

لیکن اسلام اس بات سے اتفاق نہیں کرتا کہ ایک انسان کے عیب کا بوجھ دوسرے انسان برداشت کریں۔ لہٰذا اگر کسی کا کوئی نزدیک ترین رشتے دار بھی گمراہی میں مبتلا ہو' تو اُس کا یہ عیب صرف اسی کے لیے ہوگا' اسکے دوسرے رشتے داروں میں سرایت نہیں کرے

گا۔ کیونکہ اسلام اس اصول پر تاکید کرتا ہے کہ:

"وَ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی."

"کوئی کسی دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔"

(سورۂ انعام ۶۔ آیت ۱۶۴)

اس بات سے واضح ہوتا ہے کہ خاندان کی کسی عورت کے بے آبرو ہو جانے پر یہ کہنا کہ اسکی وجہ سے خاندان کے دامن پر دھبہ لگ گیا' ایک جاہلانہ تصور ہے۔ اس تصور سے اسلام کا کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اسلام خطا کے مرتکب شخص ہی کو خطا کا ذمے دار سمجھتا ہے۔ اور اگر اُس عمل میں ذلت وخواری کا کوئی پہلو ہوتا ہے' تو اسے اسی شخص کے لیے مخصوص قرار دیتا ہے' اُسکے تمام خاندان اور اقربا کو اس میں شامل نہیں سمجھتا۔

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ جنسی گمراہی یا جنسی انحراف جنسی تعلیم میں نقص یا غلط تعلیم کا نتیجہ نہیں ہے' بلکہ ہمارے معاشرے پر چھائی ہوئی جنسی محرومی اور گھٹن اس کی وجہ ہے۔

○ ہم یہ نہیں کہتے کہ جنسی تعلیم (میں خطا یا نقص) ہی گمراہی کا واحد سبب ہے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ جنسی تعلیم (میں خطا یا نقص) ایسے انسان کے سامنے گمراہی کا راستہ کھول سکتی ہے جسے اس بارے میں پہلے سے معلومات نہ ہوں۔

جنسی مسائل بھی دوسرے علمی مسائل کی مانند ہیں

☆ اپنے بچوں کے سامنے کس انداز میں جنسی مسائل بیان کریں؟ اور ہم ان مسائل کے بارے میں ان کی معلومات میں کس حد تک اضافہ کر سکتے ہیں؟

○ یہ مسائل ہو بہو ان دوسرے علمی مسائل کی مانند ہیں جن کا بچوں پر واضح ہونا ضروری ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ نہ ہی ضرورت تقاضا کرتی ہے اور نہ ہی ماحول ایسا سازگار ہوتا ہے کہ ان امور کو بچوں کے سامنے تفصیل کے ساتھ بیان کیا جا سکے۔ ایسے مواقع پر اگر

ولادت کے مسئلے کی وضاحت مقصود ہو' تو اس سلسلے میں زمین سے پودے کے پھوٹنے یا انڈے سے چوزے کے نکلنے جیسے مسائل سے تشبیہ دینے پر اکتفا کیا جا سکتا ہے۔

ہم گزشتہ سوالات کے جوابات میں اشارہ کر چکے ہیں کہ معاشرہ اس تعلیم کا انکار کرتا ہے' اور اسکی ضرورت سے روگرداں ہے۔ حالانکہ معاشرتی تغیرات اور میڈیا کے وسیع اثرات کے پیش نظر اس تعلیم کی ضرورت صاف محسوس کی جا سکتی ہے۔ لہٰذا ضروری نظر آتا ہے کہ اس بارے میں بھی افرادِ معاشرہ کی علمی سطح کو بلند کیا جائے اور ان معلومات کے حصول کو بھی پورے معاشرے کی ضرورت سمجھا جائے۔ اس مقصد کے لیے جنسی تعلیم دینے کے حکیمانہ طریقوں سے والدین کو روشناس کرایا جائے' تا کہ وہ ان کی مدد سے اپنے بچوں کے سوالات کے جواب دے سکیں۔

☆ جنسی تعلیم کو اسکولوں کے درسی مواد میں شامل کرنے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

O ہم اس کے حق میں ہیں۔ البتہ طبیعی بات ہے کہ ہر درسی مواد کی خصوصیات پر اس پہلو سے تحقیق کی بہر طور ضرورت ہے کہ وہ ممکنہ طور پر طالبِ علم یا معاشرے کی عمومی فضا پر کیا مثبت یا منفی اثرات مرتب کر سکتا ہے۔

جنسی فلمیں

☆ جنسی فلمیں اور ہیجان انگیز تصاویر دیکھنے کے بارے میں کیا حکم ہے؟

O وہ شرعی اور اخلاقی اصول جو دوسروں کی شرم گاہ کو دیکھنا ممنوع قرار دیتا ہے' اگر بالفرض فلموں اور تصاویر میں ان مقامات پر نگاہ پڑنے کا امکان ہو' تو انہیں بھی اس ممانعت میں شامل کر لیتا ہے۔ کیونکہ نظارے کی ان دونوں صورتوں سے ایک ہی جیسے منفی اثرات برآمد ہوتے ہیں۔ البتہ ہم اس بات کو فتوے کی بنیاد نہیں سمجھتے' لیکن یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ یہ

ایک جیسے اثرات اس حکم کے صدور کے لیے موافق فضا ہموار کرتے ہیں۔ البتہ اسکے باوجود ہمارے خیال میں اس بارے میں چند استثنا موجود ہیں۔ کیونکہ بعض ایسے انسان جو جنسی کمزوری کی حالت میں ہوں (جو مردوں میں بھی پیدا ہوسکتی ہے اور عورتوں میں بھی) ان کے لیے جنسی فلمیں دیکھنا ان کی عائلی زندگی کو تباہی سے بچانے کا موجب ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے مواقع پر وہ علاج کی غرض سے دوا کے طور پر جنسی مناظر دیکھ سکتے ہیں۔ (۱) لیکن اسکے علاوہ کسی اور صورت میں ایسی فلموں اور تصاویر کا مشاہدہ آوارگی اور اخلاق کی خرابی کا سبب بنتا ہے، اور ناظرین کے ذہن پر گہرے منفی اثرات چھوڑتا ہے، لہٰذا اسی بنا پر ان صورتوں میں اسکے حرام ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

دو مختلف نسلیں

☆ امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ نے والدین کو ہدایت کی ہے کہ اپنے بچوں کی اس طریقے سے ہٹ کر تربیت کریں جس طریقے پر خود ان (والدین) کی تربیت ہوئی تھی۔ کیونکہ یہ بچے اپنے والدین کے زمانے سے مختلف زمانے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس پس منظر میں دو سوال سامنے آتے ہیں۔ ایک یہ کہ تربیت کے سلسلے میں یہ رہنمائی کس قدر اہمیت کی حامل ہے جس میں زمانے کے فرق کو ایک اہم اصول کے طور پر پیشِ نظر رکھا گیا ہے؟ دوسرے یہ کہ نسلِ نو کی تربیت کے سلسلے میں ماضی کے تجربات کا کیا مقام ہوگا؟

○ اس کلام کو نہج البلاغہ میں یوں نقل کیا گیا ہے: **لا تخلقوا اولادکم باخلاقکم فانھم خلقوا لزمان غیر زمانکم.** (اپنے بچوں کی تربیت اپنے اخلاق و آداب کے مطابق نہ کرو، کیونکہ وہ ایک دوسرے زمانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں)۔ (۲) اس کلام کو

۱۔ البتہ شرط یہ ہے کہ کوئی مستند ماہرِ جنسیات یہ علاج تجویز کرے۔

۲۔ شرح نہج البلاغہ از ابن ابی الحدید جلد ۲۰ میں اس سے ملتی جلتی یہ حدیث نقل (بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اخلاق کے بنیادی اصولوں اور ان اخلاق و عادات کے درمیان فرق رکھیں جو انسان کے روزمرہ رویے اور طرزِ عمل سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس بارے میں مزید غور وفکر کے ذریعے پتا چلتا ہے کہ اخلاق کی دو قسمیں ہیں' ایک ثابت اور مستقل اخلاق اور دوسری غیر ثابت اور غیر مستقل اخلاق۔

ثابت اخلاق زندگی کی اصل اور بنیادی اقدار ہیں' جن کی فکری اور علمی حدود کو ملحوظ رکھنا تمام زمان و مکان' ہر دور اور ہر سرزمین میں لازم ہے۔ راستگوئی' امانتداری' پاکدامنی اور اخلاق کے ایسے ہی بڑے بڑے عناوین اس میں شامل ہیں۔ یہ بنیادی اقدار درحقیقت زندگی کے طبیعی راستے پر انسان کی پائیداری اور استقامت کی عکاس اور کائنات کے تکامل سے ہم آہنگ اسکے تکامل کی علامت ہیں۔

لیکن غیر ثابت اور متغیر اخلاق وہ اسلوب اور علمی وسائل ہیں جو اجتماعی روابط کے طریقوں اور بدلتے زمانوں میں لوگوں کے طرزِ حیات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مثلاً لوگوں کی عزت اور احترام کے اظہار کا طریقہ' لوگوں سے گفتگو کا انداز یا اجتماعی اور سیاسی روابط کی تنظیم کے طور طریقے ہر زمانے میں مختلف اور متغیر رہے ہیں۔ مثال کے طور پر لباس کو لیتے ہیں۔ اس میں کوئی فضیلت والی بات نہیں کہ ہم آج کے دور میں اسی طرح کا لباس پہنیں جو رسول اللہ' ائمہ ہدیٰ یا اصحابِ رسول زیبِ تن کیا کرتے تھے۔ ہر زمانے کا اپنا مخصوص لباس ہوتا ہے اور ہم بلا کسی رکاوٹ کے لوگوں کے نئے نئے انداز کے لباس' کھانے پینے کے جدید طریقوں اور اسی طرح کی دوسری چیزوں کی پیروی کر سکتے ہیں۔ امام جعفر صادقؑ سے

(بقیہ پچھلے صفحے کا حاشیہ) ہوئی ہے: لا تقسروا اولادکم علی آدابکم' وانھم مخلوقون لزمان غیر زمانہ. (یعنی: اپنی اولاد کو اپنے اندازِ ادب پر مجبور نہ کرو' کیونکہ وہ ایک ایسے زمانے کے لیے خلق ہوئی ہیں جو تمہارے زمانے سے مختلف زمانہ ہے)

بھی نقل ہوا ہے کہ آپ نے فرمایا ہے: خیر لباس الزمان لباس اھلہ. (ہر زمانے کا بہترین لباس وہی ہے جو اس زمانے کے لوگ پہنتے ہیں) یعنی بہتر یہ ہے کہ انسان اپنے زمانے کے لوگوں کی سی پوشاک استعمال کرے۔

ہر زمانے کا ایک خاص اخلاق ہوتا ہے

لہٰذا یہ بات واضح ہوئی کہ مذکورہ حدیث میں امام علیؑ نے جس "اخلاق" کا ذکر کیا ہے اس سے آپ کی مراد غیر ثابت، غیر مستقل اور متغیر اخلاق ہے، جس کے مظاہر کا مشاہدہ ہم زندگی کے مختلف وسائل و ذرائع، اور ہر دور کے نت نئے طور طریقوں اور نئے ظاہر ہونے والے پہلوؤں میں کر سکتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ماضی میں انسان کی زندگی میں اتنی وسعت اور پھیلاؤ نہ تھا اور لوگوں کے لیے صرف اتنی ہی بات اہم ہوا کرتی تھی کہ کچھ محدود علم حاصل کر کے چھوٹے چھوٹے مقاصد حاصل کر لیں۔ لیکن آج کا دور بہت وسعت اختیار کر چکا ہے، اور علم و دانش کا دائرہ بھی انتہائی وسیع ہو گیا ہے۔ نیز علم کی کارکردگی اور اس سے استفادے کا طریقہ مختلف ہو چکا ہے۔ لہٰذا ممکن ہے امامؑ کی مراد یہ ہو کہ تم پر لازم ہے کہ ایسے غیر ثابت اور متحرک اخلاق کے بارے میں علم حاصل کرو جو ہر دور میں گزشتہ اور آنے والے زمانے سے مختلف ہوتا ہے، تاکہ اس مستقبل کا استقبال کر سکو جس میں تمہارے بچوں نے زندگی بسر کرنی ہے اور اس آگہی کے نتیجے میں انہیں ان کے زمانے کے اخلاق کے مطابق تیار کر سکو تاکہ وہ اپنے زمانے سے اجنبی اور ناآشنا نہ رہ جائیں۔

اس مقام پر یہ وضاحت ضروری ہے کہ یہاں امامؑ کی مراد ہرگز یہ نہیں ہے کہ انسانوں کے بنائے ہوئے ایسے جدید وسائل سے استفادہ کیا جائے جن میں حدودِ الٰہی کا خیال نہ رکھا گیا ہو۔ مثلاً ہمیں آج بہت سے ایسے لباس نظر آتے ہیں جو عفت و پاکدامنی سے موافق نہیں اور کیونکہ یہ غیر ثابت اور غیر مستقل مظہر، ثابت اور مستقل اصل (پاکدامنی) کے منافی

ہے‘اس لیے ایسے لباس قابلِ قبول نہیں۔ لہٰذا بعض معاشروں میں پہنے جانے والے خواتین کے غیر اسلامی وضع قطع کے لباسوں کی تائید نہیں کی جاسکتی۔ کیونکہ ہر چند کہ لباس ہر دم بدلنے والے اور غیر مستقل اُمور میں سے ہے‘ لیکن اس وضع قطع کے لباس ایک ثابت اور مستقل اصول سے متصادم ہیں۔

امام علیؑ نے اس کلام کے ذریعے متغیر‘ متحرک اور غیر مستقل اخلاق پر زور دیا ہے‘ جو زندگی کے تنوع اور اس میں آنے والی تبدیلیوں کا تقاضا ہے۔ البتہ شرط یہ ہے کہ یہ ثابت‘ ناقابلِ تغیر اور مستقل اخلاق سے متصادم نہ ہو۔

جوان کی زندگی میں مطلوب توازن

☆ جوانی کے مرحلے میں انسان یا تو لہو ولعب اور تفریح کی جانب مائل ہوتا ہے‘ یا پھر یکسر روحانی اور عبادی ماحول میں ڈوبا ہوا ہوتا ہے۔ آپ کی نظر میں توازن اور اعتدال کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟

○ انسان زندگی کے ہر مرحلے میں توازن اور اعتدال کے حصول کے لیے ایک اندرونی طلب اور ارادے کا محتاج ہے‘ جس کی بنیاد پر وہ اپنی مادّی اور جسمانی خواہشات اور فکری اہداف کے درمیان توافق اور ہم آہنگی ایجاد کر سکے۔ لیکن انسان (عام طور پر) ان دو میں سے کسی ایک جانب جھک جاتا ہے۔ یا تو ایسا مومن ہو جاتا ہے جس پر حالتِ ایمان غالب آکر اسے معنویات میں ڈبو دیتی ہے۔ یا پھر مادّی خواہشات کے طوفان کا شکار ہو جاتا ہے اور لہو ولعب اور فضولیات کے گڑھے میں جا پڑتا ہے۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ آگاہ و بیدار دل افراد اور تربیتی امور کے ذمے دار اشخاص‘ نوجوانوں کی رہنمائی کے لیے ان کی سرگرمیوں کے دوران مادّی اور معنوی پہلو میں ہم آہنگی کی ضرورت کو خاص اہمیت دیں۔ لہٰذا اگر انسان کے روحانی پہلو کی پرورش

کرنا چاہیں، تو لازماً اس جانب متوجہ رہیں کہ انسان کے وجود میں معنویت کا عنصر
کے عنصر سے جدا نہیں، اور ''مادّہ'' بھی ایک طرح کی روح کا حامل ہے، اور اسی طر
''روح'' بھی مادّی شکلوں کے سوا کسی اور طریقے سے ظاہر نہیں ہوسکتی۔ یہ حقیقت ار
کی علامت ہے کہ مادّہ اور روح کے درمیان ہم آہنگی کا حصول ایک ایسا مسئلہ ہے،
تقاضا انسان کے وجود میں پائی جانے والی مادّی اور معنوی طبیعت کرتی ہے۔

حیات، مادّے اور روح کا مرکب

ایسے لوگ جو مادّیات میں غرق ہو جاتے ہیں، وہ بھی ایک خاص روحانی حالت ا
کیے بغیر اپنے جسم کی مادّی تسکین سے عاجز رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسان جب غذا تنا
کرنا چاہتا ہے تو اسکے لیے ایسی فضا کے انتخاب کی کوشش کرتا ہے جو اسکی روح کے۔
خوشگوار ہو۔ اور اس مقصد کے لیے سرسبز باغات، پانی کے چشموں اور وادیوں کا رُخ کر
ہے۔ کچھ لوگوں کی کوشش ہوتی ہے کہ مترنم ماحول اور خوبصورت فضا میں غذا تناول کریں
انسان کا اپنی مادّی ضروریات کی تکمیل کے موقع پر ایسی فضا کا انتخاب کرنا ایک روح
حالت ہے۔

اس گفتگو کا ماحصل یہ ہے کہ مادّی ضروریات کی تکمیل انسان کی اس حاجت کی تسک
نہیں کرتی۔ بلکہ اس پر مادّے کے علاوہ کچھ اور عناصر کا لازماً اضافہ کیا جانا چاہیے جنہ
معنوی اور روحانی پہلو کہتے ہیں۔

اس بنیاد پر انسان، حتیٰ اپنے مادّی امور میں بھی روحانیت اور معنویت سے آز
بے نیاز نہیں ہوسکتا، جس طرح کہ روحانی مسائل کے میدان میں بھی لازماً مادّی وسا
محتاج ہے۔ مثال کے طور پر جب وہ تقربِ الٰہی کی نیّت سے نماز پڑھنا چاہتا ہے، تو اس
عقل، زبان، ہاتھ، پاؤں اور دوسرے تمام اعضائے بدن کے ذریعے انجام دیتا ہے۔

اس روحانی حالت (نماز) کا ظہور مادّی ہیئت اور شکل وصورت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ پس جو کوئی معنوی اور روحانی پہلو کی طرف توجہ چاہتا ہے' اسے مادّی پہلو کی جانب بھی متوجہ ہونا چاہیے اور اسکے برعکس جو مادّے کی جانب رجحان پیدا کرنا چاہتا ہے' اسے قطعی طور پر معنوی پہلو کی جانب بھی میلان پیدا کرنا پڑے گا۔

توازن کی سمت رہنمائی

زندگی اپنے اندر روحانی طاقت چھپائے ہوئے ہے۔ جس طرح کہ روح میں بھی مادّی توانائی پنہاں ہے۔ یہ امر ان لوگوں کے لیے رہنمائی کے عمل کو ممکن بنا دیتا ہے جو توازن اور اعتدال کی سمت انسانوں کی ہدایت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اس طرح کہ مربی اور رہنما' ہدایت ورہبری کے ذریعے انسانی حیات کے مختلف اعلیٰ اور پست عناصر کے درمیان توازن ایجاد کردیتا ہے۔

وہ اُمور جو خداوندِ عالم اور جہانِ آخرت سے انسان کا رشتہ قائم کرتے ہیں' اعلیٰ عناصر کہلاتے ہیں اور وہ امور جو دنیوی حیات اور مادّی زندگی سے انسان کو جوڑتے ہیں' انہیں پست عناصر کا نام دیا گیا ہے۔ قرآنِ کریم کی درجِ ذیل آیات انہی نکات کی ترجمان ہیں:

"رَبَّنَآ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً."

"پروردگار ہمیں دنیا میں بھی نیکی عطا فرما اور آخرت میں بھی۔"

(سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۰۱)

"وَ ابْتَغِ فِیْمَآ اٰتٰکَ اللّٰهُ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ وَلَا تَنْسَ نَصِیْبَکَ مِنَ الدُّنْیَا."

"اور جو کچھ خدا نے دیا ہے اس سے آخرت کے گھر کا انتظام کرو اور دنیا میں اپنا حصہ بھول نہ جاؤ۔" (سورۂ قصص ۲۸۔ آیت ۷۷)

اسی طرح ایک حدیث میں بھی آیا ہے:

"لیس منا من ترک دنیاه لآخرته ' ولیس منا من ترک آخرته لدنیاه."

"وہ شخص ہم میں سے نہیں جو آخرت کے لیے دنیا کو ترک کردے اور وہ شخص بھی ہم میں سے نہیں جو دنیا کی طلب میں آخرت کو چھوڑ بیٹھے۔"

اس مسئلے کو ہم ایک طرف فکری آگہی اور دوسری طرف وعظ و نصیحت کے پہلوؤں سے آگے لے کے چل سکتے ہیں' تاکہ انسان کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اسکی شخصیت کے مادّی اور معنوی پہلو میں توازن پیدا ہوجائے۔ تاکہ اس طرح وہ اپنی مادّی خواہشات کی تسکین کے لیے حلال اور جائز حدود میں کوشش کرے اور اپنے معنوی اور روحانی سفر کے دوران حقیقت اور واقعیت کے دائرے کو پیشِ نظر رکھے۔

لڑکیوں کی تربیت کی خصوصیات

☆ اکثر والدین لڑکیوں کی تربیت کے دوران دشواری محسوس کرتے ہیں۔ جنابِ عالی کے نقطۂ نظر سے لڑکیوں کی تربیت کے دوران کن خصوصیات کو ملحوظ رکھنا چاہیے؟

O اس سلسلے میں سب سے پہلے تو یہ بات ذہن نشین رہے کہ لڑکی بھی لڑکے ہی کی مانند انسان ہے۔ لہٰذا اسکے انسانی پہلو کی تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اسکی شخصیت مجروح نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ایک بدنام انسان کی مانند ہمیشہ خود کو مشکوک نگاہوں کے نرغے میں محسوس کرے' اور خود کو اپنے اوقات کے ایک ایک لمحے اور اپنے ہر ہر کردار و عمل کی جوابدہ سمجھے۔

لڑکی کی تربیت کے دوران عام طور پر اس بات کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے کہ خاندان کی عزت یا ذلت لڑکی کے کردار سے وابستہ ہے' اور اسکے بارے میں جنسِ مخالف سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ لہٰذا اسے ایک تنگ چہار دیواری میں قید ہونا چاہیے' ایک

ایسے مقفل صندوق میں بند ہونا چاہیے جس کی چابی صرف اسکے باپ یا بھائی کے پاس ہو۔ جبکہ ننگ و عار' ذلت وخواری کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ وہ اسے انفرادی مسئلہ سمجھتا ہے۔لہٰذا اگر لڑکی کسی خلافِ عفت عمل کی مرتکب ہو جائے' تو اسکی ذلت بھی صرف وہی اُٹھائے گی' یہ ذلت اسکے گھرانے میں سرایت نہیں کرے گی۔

اسی طرح اگر کوئی لڑکا کسی معیوب عمل کا ارتکاب کرے' تو ذلت و بدنامی صرف اسی کی ہوگی' اس کا گھرانہ اس ذلت میں حصے دار نہ ہوگا۔

ہمارا فریضہ ہے کہ اپنی بچیوں کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ خود کو ایک ایسا صاحبِ اختیار انسان سمجھیں جس کی زندگی کی راہ وروش کا تعین اللہ رب العزت نے کیا ہے' اور انہیں روحانی' جسمانی' عقلی اور طرزِ عمل کے پہلو سے اس متعین کردہ راستے کی پابندی کرنی ہے۔لڑکوں کے بارے میں بھی تربیت کے اسی اسلوب پر عمل کرنا چاہیے۔

احساسِ مظلومیت

لڑکے اور لڑکی کے درمیان امتیاز برتنے کے نتیجے میں لڑکی میں ایک نفسیاتی اُلجھاؤ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس الجھاؤ کا مشاہدہ لڑکیوں میں پائے جانے والے احساسِ مظلومیت میں کیا جا سکتا ہے۔خاص کر ان مواقع پر جب وہ اپنے آپ کو گھرانے کی عزت و آبرو کی حفاظت کا ذمے دار سمجھتی ہیں اور لڑکوں کو اس سے بری الذمہ۔نیز جب وہ دیکھتی ہیں کہ اُن کے گھر سے باہر نکلنے' اُن کے روابط و تعلقات' غرض اُن کی ایک ایک حرکت کو مشکوک نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے' جبکہ لڑکوں پر ایسی کوئی نظر نہیں۔

ظاہر ہے کہ تربیت کا یہ انداز سراسر غلط ہے۔ کیونکہ اسلام میں لڑکے اور لڑکی دونوں کی پاک دامنی کو اہمیت دی گئی ہے۔اسی طرح عزت و شرف بھی لڑکے اور لڑکی دونوں کے لیے ایک انفرادی مسئلہ ہے۔البتہ بسا اوقات مرد کے مقابلے پر عورت کا کمزور ہونا' ہمیں اس

امر پر اُبھارتا ہے کہ لڑکیوں میں قوتِ ارادی کو تقویت پہنچائی جائے۔ تاکہ وہ اسکی مدد دوسروں کی بدنیتی کے خلاف ڈٹ سکیں' اور اپنی مضبوط شخصیت' پختہ اخلاق اور ہوشیاری ذریعے فریبی اور گمراہ عناصر کو خود سے دور کر سکیں۔

کامیاب بیوی اور اچھی ماں

ہمیں لڑکی کی تربیت اس انداز سے کرنی چاہیے کہ وہ ایک کامیاب بیوی اور اَ اچھی ماں ثابت ہو۔ اسی طرح لڑکے کی تربیت کرتے ہوئے یہ مقصد پیش نظر ہونا چاہیے ہم ایک کامیاب شوہر اور صالح باپ تیار کرنا چاہتے ہیں۔ یہاں اس بات کا ذکر منا ہوگا کہ خداوندِ متعال نے عملِ صالح کی انجام دہی اور عملِ غیر صالح کے ارتکاب کے لیے میں مرد اور عورت کے درمیان کوئی فرق نہیں رکھا ہے۔ لہٰذا زنا کار مرد اور زنا کار عورت ا چوری کے مرتکب مرد اور چوری کی مرتکب عورت کی سزا یکساں قرار دی ہے اور اسی طر سورۂ احزاب میں اسلام' ایمان اور صدق وغیرہ میں انہیں مساوی حیثیت دی ہے۔ (سو احزاب ۳۳۔ آیت ۳۵)

مذکورہ اشارات سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ خداوندِ عالم نے اخلاقی امور عورتوں کو مردوں سے زیادہ مکلّف قرار نہیں دیا ہے اور انہیں مردوں سے زیادہ تنبیہ نہیں ہے۔ لہٰذا اگر ہم اپنے بچوں کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا چاہتے ہیں' تو ہمیں شرعی پیمانوں اسلامی مفاہیم پر درست طریقے سے عمل کرنا چاہیے' جن میں مرد اور عورت کے درمیان فرق نہیں رکھا گیا۔

دُرشتی' مردانگی نہیں ہے

☆ نوجوانی کے دور میں لڑکوں کا متشدد ہونا ان کی مردانگی' اپنے آپ کو منوانے اور طا کے اظہار سے مربوط ہوتا ہے۔ ابتدائے شباب کی اس حالت کو کیسے کنٹرول کیا جائے؟

○ انحراف کی کوئی بھی حالت ہو' اسکے خاتمے کے لیے پہلے مرحلے پر ضروری ہے کہ اسکے بارے میں انسان کے اس تصور اور خیال کو بدلا جائے جو انحراف کی وجہ بنتا ہے۔ پھر اسکے بعد کوشش کی جائے کہ اس میں اس کی نعم البدل ایک ایسی دوسری حالت پیدا کردی جائے' جو منفی اثرات و نتائج کی حامل نہ ہو۔

جب ہم کسی شخص کی تشدد پسندی کی بابت غور و فکر کرتے ہیں' جو اسے اپنی مردانگی اور طاقت کے اظہار پر اکساتی ہے' تو ہمیں پتا چلتا ہے کہ اس قسم کا طرزِ فکر اسے ظلم و زیادتی اور جارحیت پر اُبھارتا ہے اور بسا اوقات ہوسکتا ہے کہ اسے دوسروں کے سامنے اپنے زورِ بازو کا مظاہرہ کرنے کی تحریک دے اور کبھی نوبت یہاں تک جا پہنچے کہ وہ اپنے سے کمزور افراد پر چڑھائی کردے۔ اس کیفیت کا مشاہدہ ہم بعض ایسے جرائم میں کرتے ہیں جن کا ارتکاب کسی فائدے یا لذت کے حصول کے لیے کیا جاتا ہے اور اسی طرح ایسے افعال میں بھی جن کے مرتکب بعض نوجوان ہوتے ہیں۔

اس سلسلے میں جو کام کیا جاسکتا ہے' وہ یہ ہے کہ جوان کو باور کرایا جائے کہ مردانگی کو تشدد' تجاوز اور مجرمانہ کاموں سے کوئی نسبت نہیں۔ بلکہ دراصل مردانگی اپنی باطنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو عروج تک پہنچانے کا نام ہے' جو اسکی قوت اور توانائی کا محور بن سکتی ہیں اور جو مردانگی کے مفہوم کو انسانی اقدار کی سرحدوں تک وسعت دیتی ہیں اور اسکے انسانی پہلو کو قوی تر اور مضبوط تر کرتی ہیں۔

اہم بات یہ نہیں ہے کہ انسان ظاہری طور پر طاقتور ہے یا نہیں۔ یعنی اسکی طاقت یا کمزوری کا مشاہدہ مختلف ظاہری شکلوں میں کیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ بلکہ اہم بات یہ ہے کہ جوان کی معنوی' سیاسی اور اجتماعی توانائیاں (جو گوناگوں پہلوؤں سے مرد کی شخصیت کو قوت بخشتی ہیں اور مختلف میدانوں میں اسکی حیثیت کو تقویت پہنچاتی ہیں) بھی اسکے جسمانی تکامل کے دوش بدوش نشو و نما پائیں۔

لہذا جوانوں کے بارے میں ایک ایسے تربیتی اسلوب کو اپنانا چاہیے جس کے نتیجے میں وہ خود کو طاقتور محسوس کریں۔ یہ اسلوب ان خلاؤں کو پُر کر سکتا ہے جو اپنے پروان چڑھنے والوں سے متعلق ہیں اور جوانوں کے مخالف سمت انحراف کی راہ روکتا ہے۔

علاوہ ازیں دینی ہدایات اور رہنمائیاں جو ان میں پائے جانے والے جھگڑالو پن اور اسکی شرارتی حالت کو کنٹرول کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ ان ہدایات کے ضمن میں مسلمان جوان کو اس حقیقت کی تعلیم دی جاتی ہے کہ کمزور لوگوں کے خلاف جسمانی طاقت کا استعمال دراصل شیطان کے مقابل اُسکے ارادے کی کمزوری کی ایک علامت ہے اور یہ عمل روز قیامت اُسکے ضعف و زبونی اور عذابِ الٰہی کے حقدار ہونے کا موجب ہوگا۔ یہ مفہوم ہمیں ان قرآنی آیات میں ملتا ہے جو صبر کو معاملات و امور میں عزم و ہمت کا عکاس قرار دیتی ہیں۔ وَ اصْبِرْ عَلٰی مَآ اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔ (اور اس راہ میں جو مصیبت پڑے اس پر صبر کرو کہ یہ بہت بڑی ہمت کا کام ہے۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۷) اسی طرح رسولِ گرامی کا ایک قول ہے لیس الشدید بالصرعة "انما الشدید الذی یملک نفسه عند الغضب. (کسی کو پچھاڑ کر فتح مند ہونے والا طاقتور نہیں ہوتا بلکہ طاقتور وہ ہے جو قہر و غضب کے موقع پر اپنے نفس کو قابو میں رکھے)

مغربی ممالک میں پناہ گزیں ہونا

☆ شرعی نقطۂ نظر سے اسلام کن حالات میں غیر اسلامی ممالک بالخصوص مغربی ممالک میں پناہ گزینی کی اجازت دیتا ہے؟

○ بنیادی طور پر تو اسلام انسان کو دنیا کے کسی بھی ملک کے سفر سے نہیں روکتا۔ بلکہ بعض حالات میں اسکے اپنے شہر سے کوچ کر جانے کو واجب قرار دیتا ہے۔ مثلاً جب کسی سرزمین پر اس کا رہنا ظالم حکومت کے سامنے اسکے گھٹنے ٹیک دینے کا موجب ہو جائے

اور یہ امر اسے فکری یا عملی انحراف کی سمت لے جائے‘ اسے اس ستمگر کا ترجمان بنا ڈالے‘ یا وہ اس ظالم کے ہاتھ میں ایک ایسا ہتھیار بن جائے جس کے ذریعے وہ لوگوں پر اپنے تسلط واقتدار کو تقویت دے اور ان پر ظلم وستم میں اضافہ کرے۔ اس صورتحال میں اس کا اس شہر میں رہنا جائز نہیں۔ خداوندِ عالم کا درج ذیل قول اسی جانب اشارہ کرتا ہے:

”اِنَّ الَّذِیۡنَ تَوَفّٰىهُمُ الۡمَلٰٓئِكَةُ ظَالِمِیۡۤ اَنۡفُسِهِمۡ قَالُوۡا فِیۡمَ كُنۡتُمۡ قَالُوۡا كُنَّا مُسۡتَضۡعَفِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ قَالُوۡۤا اَلَمۡ تَكُنۡ اَرۡضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوۡا فِیۡهَا فَاُولٰٓئِكَ مَاۡوٰىهُمۡ جَهَنَّمُ وَ سَآءَتۡ مَصِیۡرًا اِلَّا الۡمُسۡتَضۡعَفِیۡنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ النِّسَآءِ وَ الۡوِلۡدَانِ لَا یَسۡتَطِیۡعُوۡنَ حِیۡلَةً وَّ لَا یَهۡتَدُوۡنَ سَبِیۡلًا فَاُولٰٓئِكَ عَسَى اللّٰهُ اَنۡ یَّعۡفُوَ عَنۡهُمۡ وَ كَانَ اللّٰهُ عَفُوًّا غَفُوۡرًا۔“

”جن لوگوں کو فرشتوں نے اس حال میں اُٹھایا کہ وہ اپنے نفس پر ظلم کرنے والے تھے‘ اُن سے پوچھا کہ تم کس حال میں تھے؟ انہوں نے کہا: ہم زمین میں کمزور بنا دیے گئے تھے۔ فرشتوں نے کہا کہ کیا خدا کی زمین وسیع نہیں تھی کہ تم ہجرت کر جاتے؟ ان لوگوں کا ٹھکانہ جہنم ہے اور وہ بدترین منزل ہے‘ علاوہ ان کمزور مردوں‘ عورتوں اور بچوں کے جن کے اختیار میں کوئی تدبیر نہ تھی اور وہ کوئی راستہ نہ نکال سکتے تھے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو عنقریب خدا معاف کر دے گا کہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔“

(سورۂ نساء۴۔ آیت ۹۷ تا ۹۹)

محولہ بالا آیاتِ کریمہ سے پتا چلتا ہے کہ بلادِ کفر میں بسے رہنا‘ جو انسانی فکر اور روح پر بُرے اثرات کا موجب ہوتا ہے‘ حرام ہے۔ البتہ اس حرمت سے ایسے لوگ مستثنیٰ ہیں جن کے پاس کوئی چارۂ کار اور دوسرا راستہ نہ ہو۔ مثلاً وہ لوگ جو اپنے ملک سے کسی دوسرے

ملک منتقل نہ ہو سکتے ہوں۔

اس مفہوم کو پیش نظر رکھا جائے تو صورت یہ ہے کہ اسلام ہجرت کو ناجائز قرار نہیں دیتا' بلکہ بسا اوقات تو اسے مکمل طور پر جائز سمجھتا ہے۔ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا قول ہے:

''وَ مَنْ يُّهَاجِرْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يَجِدْ فِى الْاَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيْرًا وَّسَعَةً.''

''اور جو بھی راہِ خدا میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت سے ٹھکانے اور وسعت پائے گا۔'' (سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۰۰)

خداوندِ عالم اپنی راہ میں ہجرت کرنے والوں اور ان لوگوں کو بڑا اجر وثواب عطا فرمائے گا جو اپنے دین کی حفاظت کے لیے دوسری کسی مناسب سرزمین کی جانب کوچ کرتے ہیں' اور اگر اس دوران ان کی موت واقع ہو جائے تو عظیم الشان ثواب ان کا مقدر ہو گا:

''وَ مَنْ يَّخْرُجْ مِنْ بَيْتِهٖ مُهَاجِرًا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ وَقَعَ اَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ.''

''اور جو اپنے گھر سے خدا اور رسول کی طرف ہجرت کے ارادے سے نکلے گا'
اسکے بعد اسے موت بھی آ جائے گی' تو اس کا اجر اللہ کے ذمے ہے۔''

(سورۂ نساء ۴۔ آیت ۱۰۰)

اسکے معنی یہ ہیں کہ اگر انسان ایسے دشوار حالات سے دوچار ہو جائے جن میں اسکے سامنے صرف دو راستے ہوں۔ ایک یہ کہ اپنے وطن میں رہے اور گمراہی کا راستہ اختیار کرے اور دوسرا یہ کہ اپنی دینداری کی حفاظت کے لیے اپنے وطن سے کوچ کر جائے' تو ایسے حالات میں قدرتی بات ہے کہ اسے دوسرا راستہ اپنانا چاہیے۔ البتہ یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ کوچ کر کے کسی ایسی جگہ نہ جائے جہاں خود اسکے وطن ہی کی مانند گمراہی' انحراف اور اسکے دین کی تباہی کے اسباب موجود ہوں۔

حرام ہجرت

اسلام ایسی ہجرت کو ناروا اور حرام قرار دیتا ہے جو خود فرد یا اسکے اہلِ خانہ کے دین کی کمزوری کا سبب ہو۔ اسلام پسند نہیں کرتا کہ مردِ مسلمان کسی ایسے غیر مسلم ملک میں جا بسے جہاں اسلامی تربیت کے ضروری مواقع میسر نہ ہوں' بلکہ اسکے برعکس غیر اسلامی تربیت کے لیے حالات سازگار ہوں۔ ایسے ماحول میں ہجرت "تعرب بعد الھجرت" کا عنوان پیدا کر لیتی ہے' جو اسلام کی نظر میں مذموم اور ناجائز عمل ہے۔ کیونکہ اسلام یہ نہیں چاہتا کہ مسلمان ایک ایسے ماحول کو ترک کر کے جو اُن کے تمدن اور دین کے لیے قوت بخش ہو ایک ایسے مقام پر چلے جائیں جو اُن پہلوؤں میں ان کی کمزوری اور ضعف کا موجب بنے۔

لہٰذا اگر ہجرت کے نتیجے میں مردِ مسلمان ظالموں کے جال میں جا پھنسے' اجنبی اقوام کی جاسوسی' یا اطلاعاتی ایجنسیوں کا آلۂ کار بن جائے (جو دیارِ غیر میں اسکی کمزور پوزیشن سے فائدہ اٹھانے کے لیے ہر وقت تاک میں رہتی ہیں اور اسے اپنے ساتھ شامل کر لینا چاہتی ہیں اور اسے اپنے دینی بھائیوں کی جاسوسی کے کام پر لگاتی ہیں اور اسکے ذریعے اسلامی معاشروں میں اپنے استکباری اہداف کی تکمیل چاہتی ہیں) تو ایسی ہجرت قطعاً حرام ہے۔

پناہ گزینی کے مسئلے کا جائزہ

اس بنیاد پر آج جس چیز کو "سیاسی پناہ" کا نام دیا جاتا ہے اور ہمارے بہت سے مسلمان بھائی اپنے ممالک میں قائم طاغوتی حکومتوں کے ظلم و ستم سے بچنے کی خاطر اسے اختیار کرتے ہیں' اسکے بارے میں چند پہلوؤں سے تجزیہ و تحلیل کی ضرورت ہے۔

۱: سیاسی پناہ کی ابتدا یا اسکے بعض مراحل میں پناہ گزینی کے خواہشمند شخص کو ایسے اعمال انجام دینے پڑتے ہیں جو اسکی ذلت و خواری یا اسکے حرام کاموں میں مرتکب ہونے کا موجب ہوتے ہیں۔ مثلاً وہ حرام غذا کھانے' حرام مشروب پینے اور حرام تعلقات پر مجبور ہوتا ہے۔

ایسی صورت میں پناہ گزینی یکسر حرام ہے۔ کیونکہ مومن انسان کا خود کو ذلیل و رسوا کرنا حرام ہے۔ اسی طرح یہ بھی حرام ہے کہ وہ کسی ایسی جگہ کا رُخ کرے جس کے متعلق وہ پہلے ہی سے جانتا ہو کہ وہاں وہ حرام کے ارتکاب پر مجبور ہوگا' مگر یہ کہ جہاں وہ رہ رہا ہے وہاں کے حالات اس قدر سخت اور ناگوار ہو جائیں کہ اسکے پاس فرار کے سوا کوئی چارہ نہ رہے اور وہاں ٹھہرنے کی خرابی پناہ حاصل کرنے والی سرزمین میں مذکورہ بالا حالات کا شکار ہو جانے کی خرابی سے زیادہ شدید ہو۔

☆ کیا ان دشوار حالات کی تشخیص خود ہر انسان پر چھوڑ دی گئی ہے؟

O اگر انسان اس بارے میں علم و آگہی رکھتا ہو' تو اپنی اس واقفیت کے ذریعے وہ حالات کی تشخیص کر سکتا ہے۔ کیونکہ یہ مسئلہ کہ وہ ان دو حالات میں سے کسی ایک حالت کو اپنی صورتحال سے منطبق سمجھتا ہے اسکے ذاتی شرعی فریضے سے متعلق ہے۔ لیکن اگر وہ اس بارے میں کافی علم و آگہی کا حامل نہ ہو' تو اسے ایسے عالم اور بابصیرت افراد سے رجوع کرنا چاہیے جو خوبی اور خرابی کی مقدار اور ان کے حجم سے آگاہ ہوں۔

۲: اس موضوع (پناہ گزینی) سے متعلق ملحوظ رکھنے والی ایک اور بات یہ ہے کہ اگر پناہ گزینی کے نتیجے میں انسان ایک مادر پدر آزاد معاشرے میں جا بسے' جہاں اسکے لیے مکمل آزادی کے ساتھ عبادتِ الٰہی انجام دینا ممکن نہ ہو' یا جہاں کوئی ایسی پناہ گاہ میسر نہ ہو جو اسے اس پُرفریب ماحول میں غرق ہونے سے محفوظ رکھ سکے' جو کسی اخلاقی قید و بند کا قائل نہیں (جہاں زنا اور لواط جائز عمل سمجھے جاتے ہوں اور جہاں دوسرے فحشا و منکرات کو حرام نہ سمجھا جاتا ہو) تو ایسے ماحول میں پناہ گزیں ہونا حرام ہے۔

اسی طرح اگر اس کا وہاں بسنا' اسکے بچوں کی غیر اسلامی تربیت کا سبب بنے۔ یعنی وہ اپنے بچوں کو ایسے اسکولوں میں بھیجنے پر مجبور ہو' جو انہیں عقیدے اور عمل کے اعتبار سے گمراہ کر دیں گے۔ یا جہاں اسکے بچوں پر (ان کے بالغ ہونے سے پہلے اور بالغ ہو جانے کے

بعد) اس کا کوئی اختیار نہ ہوگا۔ بالخصوص ان ممالک میں جہاں بچے اپنے والدین کے خلاف حکومتی اداروں میں شکایت کر سکتے ہیں اور وہ ادارے ماں باپ کی سخت گیری سے نجات دلانے کے لیے بچوں کو اپنی تحویل میں لے لیتے ہیں۔

اگر کسی ملک میں مقیم ہونا اسلام و مسلمین کے خلاف سرگرمِ عمل ایجنسیوں میں شمولیت کا مقدمہ بنے' یا جہاں ضروریاتِ زندگی پورا کرنے کے لیے حرام پیشہ اپنانے' مثلاً منشیات یا اسی کی مانند چیزوں کی تجارت پر مجبور ہو' تو ایسے حالات میں بھی وہاں پناہ گزین ہونا حرام ہے۔

اگر کسی ایسی جگہ کو سیاسی پناہ کے لیے اختیار کیا جائے جہاں اسلامی ماحول فراہم ہو سکے' بچوں' نوجوانوں کو اسلامی فضا میں سانس لینے کا موقع مل سکے' جہاں ان کی اسلامی تربیت کا بندوبست ہو سکے۔ تو ایسے مقام پر پناہ گزین ہونے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں۔ بلکہ اگر پناہ حاصل کرنے والے مسلمان کا ارادہ یہ ہو کہ اس سرزمین پر حاصل آزاد فضا سے استفادہ کرتے ہوئے وہاں دعوت الی اللہ اور اسلام کی تبلیغ و ترویج کو اپنی سرگرمیوں میں سرِفہرست مقام دے گا' تو اس صورت میں وہاں پناہ گزینی مستحب اور شرعی لحاظ سے زیادہ بہتر قرار پائے گی۔

لہٰذا ایسے لوگ جو اپنے ممالک میں طاغوت کی حکمرانی یا ظالموں کے تسلط کی وجہ سے ہجرت پر مجبور ہو جائیں' ان پر واجب ہے کہ جس سرزمین کی جانب کوچ کا ارادہ رکھتے ہوں' وہاں کے بارے میں مختلف زاویوں سے تحقیق و جستجو کریں' اور اس بات کو کسی صورت ذہن سے نہ نکلنے دیں کہ اس سرزمین پر ان کی حیثیت مبلغِ اسلام کی سی ہونی چاہیے' اور وہاں ان کے فکر و عمل' اخلاق و کردار سے اسلامی تعلیمات کا اظہار ہونا چاہیے' نیز انہیں خداوندِ عالم کے اس فرمان کا بھی مثبت جواب دینا چاہیے کہ:

"یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْۤا اَنْفُسَكُمْ وَ اَهْلِیْكُمْ نَارًا وَّ قُوْدُهَا النَّاسُ

وَ الْحِجَارَةُ."

"اے ایمان والو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔" (سورۂ تحریم ۶۶۔ آیت ۶)

لہٰذا انہیں اپنے آپ کو اپنے بچوں اور اعزہ کو (عذابِ آخرت سے) محفوظ رکھنے کے لیے تدبیر کرنی چاہیے اور اپنے اور دوسرے مہاجرین کے بچوں کی دینی تربیت اور ان کے لیے مناسب اسلامی ماحول ایجاد کرنے کی خاطر اقدام کرنا چاہیے۔ تاکہ اس دینی ماحول اور تربیت کے زیرِ سایہ بچوں کی صالح نشو ونما کی ضمانت فراہم ہو سکے۔

اسی طرح ان پر یہ بھی لازم ہے کہ اپنے حسنِ سلوک سے دوسروں کو خدا کی طرف دعوت دیں اور ایسا کردار رکھیں کہ وہاں کے لوگ یہ محسوس کرنے لگیں کہ ہماری سرزمین پر ہجرت کر کے آنے والے یہ لوگ شائستہ اور سودمند نمونۂ عمل ہیں اور زندگی اور انسان سے مربوط تمام مسائل، جیسے آزادی اور عدل و انصاف وغیرہ میں واضح اور خوبصورت اسلامی مؤقف کے مالک ہونے کی بنا پر اس معاشرے کے لیے ایک مفید عنصر ثابت ہو سکتے ہیں۔ ان کا طرزِ عمل ایسا ہونا چاہیے کہ دوسرے راستی، امانت داری، پارسائی اور انسان دوستی جیسی صفات میں انہیں نمونہ اور مثال کی حیثیت سے پہچانیں اور ان کے عمدہ کردار کا مشاہدہ انہیں انسان پر اسلام کی اثر اندازی کا مجسم نمونہ دکھا دے۔

مہاجر بھائیو! اس بات سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے کہ کہیں آپ کی وجہ سے اس سرزمین کے امن و امان اور وہاں کے سماجی نظام میں خلل واقع نہ ہو۔ قدرتی بات ہے کہ وہاں کے لوگ بعض ایسے افکار و اعمال کے پابند ہوں گے جو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ نہیں۔ ایسی صورتحال میں ضروری ہے کہ آپ اپنے آپ کو اور اپنے افرادِ خانہ کو ان چیزوں سے دور رکھیں۔ لیکن اس سلسلے میں کوئی ایسا طریقہ اختیار نہ کریں جس سے رائے عامہ آپ کے خلاف ہو جائے۔ کیونکہ اس صورت میں لوگ آپ کو اپنے سماجی نظام میں خلل ڈالنے والا سمجھیں گے

اور پھر وہاں کے اربابِ اختیار آپ کو وہاں سے نکالنے کا فیصلہ کریں گے اور یوں آپ کے لیے ایک نئی مشکل جنم لے گی۔

اس مقام پر میں امام جعفر صادقؑ کا یہ قول راہِ خدا میں ہجرت کرنے والے اپنے بھائیوں کے گوش گزار کروں گا جس میں آپؑ نے فرمایا: کونوا لنا دعاة بغير السنتكم. (لوگوں کو اپنی زبان کے بغیر کردار سے دعوت دو) وہ تمہارے صدق، نیکوکاری اور تقویٰ کو دیکھیں۔

میں آپ دوستوں سے انتہائی محبت کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ آپ، جنہوں نے اپنے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے ظلم، گمراہی اور طاغوتی حکمرانوں سے فرار اختیار کی ہے۔ اب وہاں (اپنے نئے ملک میں) اسی گوہرِ گراں قیمت کو فراموش نہ کر دیجیے گا، اسے یوں ہی اپنے حال پر نہ چھوڑ دیجیے گا، بلکہ اپنے دین کو اپنی شخصیت، عزت اور ہستی کا باعث سمجھئے اور یہ جان لیجیے کہ دنیا و آخرت کی نجات اسکے استحکام سے وابستہ ہے۔ علاوہ ازایں ہم آپ سے یہ بھی توقع رکھتے ہیں کہ آپ اسلام کی طرف دعوت دینے والے بنیں گے اور اسکے لیے نئے مواقع اور جدید افق کھولیں گے۔

☆ پہلے سوال کے جواب میں آپ نے فرمایا تھا کہ مسلمان پناہ گزیں کو چاہیے کہ وہ خود کو ذلیل و خوار نہ کرے۔ اس سلسلے میں بعض پناہ گزیں افراد کہتے ہیں کہ جس ملک میں انہوں نے پناہ حاصل کی ہے وہاں وہ اپنے اسلامی وطن سے زیادہ عزت و احترام پاتے ہیں۔

O ان لوگوں کو پناہ گزینی کے ابتدائی مرحلے ہی میں ذلت و تحقیر کا نشانہ بننا پڑتا ہے اور وہ اس طرح کہ پناہ کے خواہشمند لوگوں کو ایک معین جگہ پر ٹھہرایا جاتا ہے اور ان سے نہایت حقارت آمیز سلوک کیا جاتا ہے۔ اگر وہ اپنے ملک میں بھی ذلت و خواری کا شکار ہوں، تو انہیں ان دونوں ذلتوں کے درمیان موازنہ کرنا چاہیے اور پھر شرعی نقطۂ نظر کا حامل مناسب فیصلہ کرنا چاہیے۔

اب جبکہ آپ نے ذلت و خواری کی بات چھیڑی ہے، تو میں بتاتا چلوں کہ ذلت کے

بارے میں ہماری گفتگو اندرونی اور حسی لحاظ سے نہ تھی بلکہ واقعی اور عینی (خارجی) پہلو سے تھی
کبھی کبھی انسان کسی ایسی چیز سے ذلت محسوس کرنے لگتا ہے جس میں سرے سے کوئی ذلت کی بات ہوتی ہی نہیں اور کبھی بعد کے مراحل پیش نظر ہونے اور ان سے واقفیت کی بنا پر انتہائی ذلیل چیز کو ذلت نہیں سمجھتا۔ یہاں اس نکتے کی یاد دہانی غیر مفید نہیں کہ کسی مسلمان کا کسی کافر کے سامنے ذلیل ہونا' اسکے کسی مسلمان کے سامنے ذلیل ہونے سے بالکل مختلف ہے۔

پولیس کی سرپرستی

☆ مغربی ممالک میں اگر بچے باپ کے خلاف شکایت کریں' تو پولیس بچوں کو باپ کی سرپرستی سے نکال کے اپنی سرپرستی میں لے لیتی ہے۔ اس سرپرستی کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

O جب ہم انسانی پہلو سے اس مسئلے کا جائزہ لیتے ہیں' تو اس قانون کو جائز پاتے ہیں جو اس وقت بچے کی حمایت کرتا ہے جب باپ اپنی سرپرستی کا ناجائز فائدہ اٹھاتا ہے۔

ہماری رائے ہے کہ ہم اسلامی ممالک میں بھی اس طرح کے قوانین وضع کر سکتے ہیں جو ایسے حالات میں بچوں کے مددگار ہوں۔ کیونکہ والدین پر واجب ہے کہ وہ بچوں کی نگہداشت اور سرپرستی کے دوران ان سے حسنِ سلوک اور عدالت کا طرزِ عمل اپنائیں۔ لیکن اگر یہ سرپرستی بچے پر ظلم و ستم میں بدل جائے اور والدین اپنے فریضے سے عہدہ برآ نہ ہوں' تو ولیٔ امر کو چاہیے کہ ایسے والدین سے بچے کو لے کر کسی لائق اور مناسب فرد کے سپرد کر دے۔
لیکن ہمارے مفروضہ مسئلے میں صورت یہ ہے کہ مغرب جن اقدار و روایات کا پابند ہے اور جن کی بنیاد پر وہ بچوں پر سختی کرتا یا انہیں ڈھیل دیتا ہے' وہ ہماری اقدار و روایات سے مختلف ہیں۔
یہاں' ان سے ہمارا اختلاف ان جگہوں پر ہے جن کے بارے میں ان کا خیال۔

کہ یہ بچوں سے والدین کی ایسی بدسلوکی ہے جس کی بنیاد پر حکومت کو بچے اپنی تحویل میں لینے کا حق حاصل ہے۔ مثلاً ہم کہتے ہیں کہ بعض مواقع پر باپ بچے کو تادیب کر سکتا ہے۔ حتیٰ اس حد تک سخت گیری کو بھی روا سمجھتے ہیں جس میں بچے کی شخصیت مجروح نہ ہو اور جو اسکی سلامتی کے لیے نقصان دہ نہ ہو۔ لیکن مغرب اس سے اتفاق نہیں کرتا۔

لہٰذا ہم مغرب میں زندگی بسر کرنے والے اپنے بھائیوں کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو ایسی صورتحال کا شکار ہونے سے بچائیں۔ ہمارے خیال میں مناسب راستہ یہ ہے کہ اپنے بچوں کی تادیب کے لیے سختی اور دباؤ سے کام نہ لیں' بلکہ ایسے دوسرے طریقوں سے ان کی تربیت کریں کہ وہ شکایت کے لیے حکومت کا دروازہ نہ کھٹکھٹائیں' کیونکہ اگر حکومت نے آپ کے بچے کو اپنی تحویل میں لے لیا' تو اس کا نتیجہ اسکی دینی اور اخلاقی تباہی کی صورت میں برآمد ہوگا۔

مشکل' بچوں اور بڑوں' دونوں ہی کے لیے ہے

☆ جب ہم پناہ گزینی کی مشکلات کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں' تو ہماری تمام تر توجہ بچوں اور نوجوانوں کی گمراہی اور تباہی کے مسئلے پر ہوتی ہے۔ گویا ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ بڑی عمر کے افراد اس پہلو سے امان میں ہیں۔ آپ کا اس بارے میں کیا خیال ہے؟

O ہماری گفتگو چھوٹوں یا بڑوں کے بارے میں نہیں ہے' بلکہ ہم عملی (نہ کہ شرعی طور پر لازم) سرپرستی کے بارے میں بات کر رہے ہیں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ باپ کو اپنے بچوں کی سرپرستی ونگہداشت سے محروم کر دیا جائے۔ مغرب میں زندگی بسر کرنے والے مسلمان اور پابندِ شرع گھرانوں کی ایک مشکل یہ بھی ہے کہ وہ انحراف اور گمراہی کی راہ پر قدم رکھنے والے اپنے بچوں یا بچیوں پر دباؤ نہیں ڈال سکتے۔ کیونکہ وہاں کا قانون انہیں اس سے منع کرتا ہے۔ اور وہاں باپ کو اس بات کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنے

بچوں اور اہلِ خانہ کی ہدایت و رہنمائی کے لیے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرے۔

یہ چیز مغرب میں سکونت اختیار کرنے کے سلسلے میں ایک بڑی مشکل ہے (خواہ یہ سکونت پناہ گزینی کی صورت میں اختیار کی جائے یا کسی اور وجہ سے) جبکہ اگر مشرق میں بچے انحراف اور گمراہی کی راہ اختیار کرلیں، تو باپ انہیں اس سے نجات دلانے کے لیے چارہ جوئی کرسکتا ہے، لیکن افسوس کہ مغرب میں اسکے لیے یہ ممکن نہیں ہے۔ پس اگر مغرب میں اقامت، بچوں کی گمراہی پر منتج ہو، تو یہ اقامت حرام ہے۔

جوان پناہ گزینوں کی دورُخی شخصیت

☆ اب، مغرب میں پناہ لینے والے جوانوں کی شخصیت کے دورخے پن کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ بالخصوص دین کے پابند گھرانوں میں یہ دورخی زیادہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان گھرانوں میں والدین بچوں کو دین کی پابندی کی ہدایت کرتے ہیں، لیکن گھر سے باہر کا ماحول انہیں دوسری طرف کھینچتا ہے۔ اگر جنابِ عالی کا اس بارے میں کوئی خاص نقطۂ نظر ہے تو بیان فرمایئے؟

○ جہاں کہیں بھی گھریلو اقدار و روایات اور معاشرتی رسوم و رواج کے درمیان فرق ہوگا، وہاں قدرتی طور پر یہ دورخہ پن نظر آئے گا۔ معاشرتی اور گھریلو رسم و رواج کے درمیان پایا جانے والا اختلاف جوان لڑکے اور لڑکیوں کے روحانی اضطراب اور ان کی شخصیت کے دورخہ ہو جانے کا موجب ہوتا ہے۔ کیونکہ جوانوں کے پاس کوئی ایسی گہری فکری بنیاد نہیں ہوتی جوان کے کردار و عمل میں توازن اور اعتدال پیدا کرسکے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ ایک ایسی فضا میں زندگی بسر کرتے ہیں کہ اگر خود کو وہاں کے معاشرتی رنگ ڈھنگ، رسوم و رواج سے ہم آہنگ کرنا چاہیں، تو گھر کی طرف سے ان پر دباؤ پڑتا ہے اور اگر گھریلو اقدار و روایات سے مطابقت پیدا کرنا چاہیں، تو معاشرے کے دباؤ کا سامنا کرتے ہیں۔

یہ صورتحال ان میں اندرونی کشمکش اور داخلی جنگ کی وجہ بن جاتی ہے۔ جب وہ اس مشکل کے حل سے عاجز رہتے ہیں، تو نتیجے کے طور پر جب کبھی معاشرے اور نفسانی خواہش کا دباؤ ان پر غالب آ جاتا ہے، تو وہ گھر والوں سے جھوٹ بولتے ہیں اور اگر خاندانی رسم و رواج اور ماحول کے سامنے مجبور ہوکر اسے اپنا لیتے ہیں، تو پھر سخت معاشرتی دباؤ میں رہ کر زندگی بسر کرتے ہیں۔

لہٰذا جب ایسے حالات ہوں تو والدین پر لازم ہے کہ جوان (لڑکوں اور لڑکیوں) کے اندر پائے جانے والے اس کمزور نکتے کو پہچانیں۔ تاکہ اسے اس اضطراب اور پریشانی سے نجات دلا سکیں۔ (یاد رہے کہ) مغربی رسوم و رواج کے لیے دروازے کھلے ہونے کی وجہ سے ہم مشرق میں زندگی بسر کرنے والے لوگوں کو بھی شاید اسی مشکل کا سامنا ہو جو وہاں مغرب میں رہنے والوں کو درپیش ہے۔

بچے اور ماحول کا اثر

☆ بعض پناہ گزین والدین کہتے ہیں کہ ہمارے بچے ابھی چھوٹے ہیں، مثلاً ان کی عمر ابھی دو تین سال ہے، لہٰذا ان کے بڑے ہونے تک ہم یہاں رہ سکتے ہیں۔ ان لوگوں کا خیال ہے کہ چھوٹے بچے ماحول کے منفی اثرات قبول نہیں کرتے۔ آپ اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

O ہم ان کے خیال سے اتفاق نہیں کرتے۔ کیونکہ کسی بھی فضا میں بڑا ہونے والا بچہ اس ماحول کو اپنے لاشعور میں محفوظ کر لیتا ہے۔ اس طرح یہ احساسات اور مفاہیم اسکی شخصیت کے اندر گھر کر لیتے ہیں اور چاہے وہ نقل مکانی کر کے کہیں اور جا بسے، تب بھی ان کے اثرات اس میں باقی رہتے ہیں۔ خود ہم بھی اپنے بچپنے کی پیچیدگیوں اور مسائل کو (اب کبرسنی کے باوجود) اپنے اندر محسوس کرتے ہیں۔

جی ہاں، بچہ جس طرح دینی ماحول کی پاک و پاکیزہ ہوا کو جذب کرتا ہے، اسی طرح کفر کی آلودگی کو بھی جذب کرتا ہے، جس طرح خیر سے اپنے مشامِ جاں کو معطر کرتا ہے، اسی طرح شر کی ناگوار بو بھی اپنے سینے میں اتارتا ہے۔

المختصر، اس حوالے سے حاصل ہونے والا تجربہ مثبت اور خوش آئند نہیں، لیکن اسکے باوجود ہم مشکل کو اسکے اصل حجم سے بڑا بنا کے پیش کرنا بھی درست نہیں سمجھتے، اور ہمارے کہنے کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ماحول کے اثرات جتنے جوان پر مرتب ہوتے ہیں اتنے ہی بچے پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ البتہ اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ اثرات بسا اوقات مستقبل پر بُرے اثرات چھوڑتے ہیں اور بچے کی سمت بدلنے میں رکاوٹ بنتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ضمیمۂ احادیث (۲)

والدین اور اولاد کے بارے میں

☆ قال رسول اللہ (صلی اللّٰہ علیہ و آلہ): " اکرموا اولادکم ' واحسنوا اکرامھم. "

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: "اپنی اولاد کا احترام کرو اور ان کے احترام کو اچھی طرح انجام دو۔"

☆ وقال (ص): "ادبوا اولادکم علی ثلاث خصال: حب نبیکم ' وحب اھل بیتہ ' وقراءۃ القرآن."

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "اپنے بچوں میں تین صفات کی نشو و نما کرو: اپنے پیغمبر سے محبت ' اُن کے اہلِ بیت سے محبت اور قرآن کی قرأت۔"

☆ وقال (ص): "ما ورث والد ولدہ افضل من ادب."

آپؐ ہی نے فرمایا: "باپ جو میراث اپنے بچوں کے لیے چھوڑتا ہے اس میں سب سے

بہترین میراث ادب ہے۔"

☆ وقال الامام علی بن ابی طالب (علیه السلام): "مروااولادکم بطلب العلم".

امام علی ابن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا: "اپنے بچوں کو طلبِ علم پر ابھارو۔"

☆ وقال الامام جعفر الصادق (علیه السلام): "الغلام یلعب سبع سنین، ویتعلم الکتاب سبع سنین، ویتعلم الحلال والحرام سبع سنین."

امام جعفر صادق علیہ السلام نے فرمایا: "بچے کو سات برس تک کھیلنے کودنے دو، سات برس بعد قرآن مجید پڑھاؤ اور پھر سات برس بعد حلال وحرام سکھاؤ۔"

☆ وقال(ع): "بادروا احداثکم الحدیث قبل ان یسبقکم الیه المرجئة."

آپؑ ہی نے فرمایا: "اپنے جوانوں سے گفتگو کرو، قبل اسکے کہ مرجئہ (یعنی گمراہ فرقے) تم پر سبقت کر جائیں۔"

☆ وقال الرسول الاکرم (ص): "مروااولادکم بالصلاۃ وھم ابناء سبع سنین، واضربوھم علیھا وھم ابناء عشر سنین، وتفرقوا بینھم فی المضاجع."

رسولِ کریمؐ نے فرمایا: "جب تمہارے بچے سات برس کے ہو جائیں، تو انہیں نماز کی تلقین کرو، جب دسواں برس گزار لیں، تو اس مسئلے پر انہیں (نرم انداز میں) تنبیہ کرو اور انہیں علیحدہ علیحدہ سلاؤ۔"

☆ وقال(ص): "یلزم الوالد من الحقوق لولده، مایلزم الولد من الحقوق لوالده."

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "جو حقوق والدین پر بچے کے واجب ہیں، وہی حقوق بچے پر والدین کے واجب ہیں۔"

☆ وقال(ص): "یلزم الوالدین من عقوق الولد ما یلزم الولد لھما من

العقوق."

آپؑ ہی نے فرمایا: "جو چیز والدین کی طرف سے بچے کے عقوق کا موجب ہے، وہی بچے کی طرف سے والدین کے عقوق کا موجب ہے۔"

☆ **وقال(ص): "من حق الولد علی والده ثلاثة: یحسن اسمه، و یعلمه الکتابة، ویزوجه اذا بلغ."**

اور آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "باپ کے ذمے بچے کے تین حق ہیں: اس کا اچھا نام رکھے، اسے لکھنا سکھائے اور جب وہ بالغ ہو جائے تو اسکی شادی کرے۔"

☆ **وقال الامام الصادق (علیه السلام): "تجب للولد علی والده ثلاث خصال: اختیاره لوالدته، ویحسن اسمه، والمبالغة فی تادیبه."**

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "باپ پر واجب ہے کہ اپنے بچے کے بارے میں تین باتوں کا خیال رکھے: اسکے لیے اچھی ماں کا انتخاب کرے، اس کا اچھا نام رکھے، اسے باادب بنانے کے سلسلے میں انتہائی کوشش کرے۔"

☆ **وقال النبی العظیم محمد(ص): "من بلغ ولده النکاح وعنده ماینکحه فلم ینکحه ثم احدث حدثاً فالاثم علیه."**

نبی عظیم حضرت محمدؐ نے فرمایا: "اگر کسی کا بچہ شادی کی عمر کو پہنچ جائے اور توانائی کے باوجود وہ اسکی شادی نہ کرے، تو اس صورت میں اگر کوئی حادثہ پیش آ جائے تو اس کا گناہ باپ کے ذمے ہوگا۔"

☆ **و قال(ص): "رحم الله من اعان ولده علی بره، وهو ان یعفو عن سیئته، ویدعو له فیما بینه و بین الله."**

آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "خدا کی رحمت ہو اس شخص پر جو نیک کاموں میں اپنے بچے کا معاون ہو، اس طرح کہ اسکی خطا سے درگزر کرے اور درگاہِ الٰہی میں اسکے اور خدا کے مابین اعمال

کے لیے دعا کرے۔"

☆ و قال الامام الصادق(علیه السلام:"عقوق الوالدین من الکبائر لان الله عزو جل جعل العاق عصیا شقیا."

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا:"عقوقِ والدین (والدین کی نافرمانی) گناہانِ کبیرہ میں سے ہے اس لیے کہ خداوند عالم نے عاق کو شقی قرار دیا ہے۔"

☆ وقال(ع):"ادنی العقوق (اف) ولوعلم الله شیئا اهون منه لنهی عنه."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے:"سب سے کم نافرمانی "اف" کرنا ہے اگر اس سے بھی کمتر کوئی چیز ہوتی تو خدا اس سے بھی منع فرماتا۔"

☆ و قال(ع):"فی قوله تعالی"واخفض لهما جناح الذل من الرحمة":لا تملا عینیک من النظر الیهما الابرحمة ورقة ' ولا ترفع صوتک فوق اصواتهما ' ولا یدک فوق ایدیهما ' ولا تقدم قدامهما."

آپؑ ہی نے خداوندِ عالم کے فرمان:"اور ان کے لیے خاکساری کے ساتھ اپنے کاندھوں کو جھکا دینا۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔آیت ۲۴) کے بارے میں فرمایا:"ان دونوں کی جانب صرف اور صرف محبت اور مہربانی کی نگاہ سے دیکھنا' اپنی آواز کو ان کی آواز سے بلند نہ کرنا' اپنے ہاتھ کو ان کے ہاتھ سے اونچا نہ اٹھانا اور ان سے آگے قدم بڑھا کر نہ چلنا۔"

☆ و قال(ع):"فی قوله تعالی"و قل لهما قولا کریما." ان ضرباک فقل لهما: غفر الله لکما."

آپؑ ہی نے خداوندِ عالم کے فرمان:"اور ان سے ہمیشہ شریفانہ گفتگو کرتے رہنا۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔آیت ۲۳) کے بارے میں فرمایا:"اگر وہ تمہیں ماریں پیٹیں (تب بھی) کہنا کہ خدا آپ کی مغفرت کرے۔"

☆ و قال:"فی قوله تعالی:"اما یبلغن عندک الکبر احدهما او کلاهما."ان

اضجراک فلا تقل لھما: اف' ولا تنھرھما ان ضرباک."
آپؑ ہی نے خداوندِ عالم کے قول: "اگر ان دونوں میں سے کوئی ایک یا دونوں ہی بوڑھے ہو جائیں۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔ آیت ۲۳) کے بارے میں فرمایا: "اگر تمہیں تکلیف پہنچائیں تو اف تک نہ کرنا اور اگر تمہیں ماریں پیٹیں تو انہیں دھتکارنا نہیں۔"

☆ و قال (ع): "ان اللہ یرحم العبد لشدۃ حبہ لولدہ."
آپؑ ہی نے فرمایا: "خداوندِ عالم اپنے بندے پر بچے سے شدید محبت کرنے کی وجہ سے رحم کرتا ہے۔"

☆ و قال النبی الاکرم (ص): "من سعادۃ الرجل' الولد الصالح."
پیغمبر اکرمؐ نے فرمایا: "صالح اولاد انسان کی خوش بختی میں سے ہے۔"

☆ و قال الامام الصادق (ع): " میراث اللہ من عبدہ المومن ولد صالح یستغفر لہ."
امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "خداوندِ عالم جن چیزوں کو اپنے مومن بندے کی میراث قرار دیتا ہے ان میں ایسی صالح اولاد بھی شامل ہے جو اسکے لیے طلبِ مغفرت کرے۔"

☆ و قال (ع): "من کانت لہ ابنۃ فادبھا واحسن ادبھا وعلمھا فاحسن تعلیمھا واوسع من نعم اللہ التی اسبغ علیہ کانت لہ منفعۃ وسترا من النار."
آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "ایسی لڑکی جس کے باپ نے اس کو علم و ادب کے زیور سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی ہو اور جو نعمتیں اسے خدا نے بخشی ہیں ان سے اسے خوب فیضیاب کیا ہو' وہ اپنے باپ کے لیے فائدہ مند اور اسے آتشِ دوزخ سے محفوظ رکھنے کا باعث ہوگی۔"

☆ و قال (ع): "البنات ھن المشفقات المجھزات المبارکات."
آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "لڑکیاں مشفق و مہربان' خوش رفتار اور پر برکت ہوتی ہیں۔"

☆ و قال(ع): "من ولدت له ابنة فلم یوذها ولم یهنها ولم یوثر ولده علیها (یعنی الذکور) ادخله الله بها الجنة."

آپؑ ہی کا ارشاد ہے: "اگر کسی شخص کی اولاد میں ایسی لڑکی شامل ہو جسے اس نے اذیت نہ دی ہو' اسے ذلت نہ سمجھا ہو اور لڑکے کو اس پر فوقیت نہ دی ہو' تو خدا اس شخص کو اس لڑکی کے طفیل جنت میں داخل کرے گا۔"

☆ و قال الامام الصادق (ع): "البنات حسنات والبنون نعم' والحسنات یثاب علیها والنعم مسوول عنها."

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: "لڑکی نیکی اور لڑکا نعمت ہے' نیکی کا اجر دیا جاتا ہے اور نعمت کے بارے میں سوال کیا جاتا ہے۔"

☆ وقال الرسول الاکرم (ص): "ان الله تبارک وتعالی علی الاناث ارأف منه علی الذکور' وما من رجل یدخل فرحة علی امراة بینه وبینها حرمة الافرحه الله یوم القیامة."

رسول اکرمؐ نے فرمایا: "خداوندِ عالم عورتوں پر مردوں سے زیادہ مہربان ہے اور اگر کوئی مرد اپنی محرم خواتین میں سے کسی کا دل خوش کرے' تو خداوندِ عالم روزِ قیامت اس کا دل شاد کرے گا۔"

☆ وقال(ص): "اتقوا الله واعدلوا فی اولادکم."

آپؐ ہی نے فرمایا: "تقویٰ اختیار کرو اور اپنے بچوں سے منصفانہ برتاؤ کرو۔"

☆ وقال(ص): "ان لهم علیک من الحق ان تعدل بینهم' کما ان لک علیهم من الحق ان یبروک."

آپؐ ہی کا فرمان ہے: "تم پر ان کا حق یہ ہے کہ ان کے درمیان عدالت سے کام لو' جیسا کہ تمہارا حق ان پر یہ ہے کہ وہ تم سے نیکی سے پیش آئیں۔"

☆ وقال(ص): "اعدلوا بین اولادکم فی النحل (العطایا والھدایا) کما تحبون ان یبروکم."
آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "اپنے بچوں کو شہد (عطیہ یا تحفہ) دیتے وقت ان کے درمیان عدل برتو، جس طرح تم پسند کرتے ہو کہ وہ تمہارے ساتھ نیکی سے پیش آئیں۔"

☆ وقال(ص): "ساووا بین اولادکم فی العطیة، فلو کنت مفضلا احدالفضلت النساء."
آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "اپنے بچوں کو تحفہ دینے میں مساوات کا لحاظ رکھو، اگر کسی کو فوقیت دینا چاہو، تو لڑکیوں کو ترجیح دو۔"

☆ وقال(ص): "من سرہ ان یمدلہ فی عمرہ ویزاد فی رزقہ فلیبروالدیہ ولیصل رحمہ."
آپؐ ہی کا ارشاد ہے: "جو کوئی طولِ عمر اور رزق کی فراوانی کا خواہشمند ہے، اُسے چاہیے کہ اپنے والدین کے ساتھ نیکی کرے اور اپنے رشتے داروں کے ساتھ نیک سلوک کرے۔"

☆ وقال الامام علی(علیہ السلام): "برالوالدین من اکرم الطباع."
امام علیؑ کا ارشاد ہے: "والدین سے نیکی، عظیم ترین خصلتوں میں سے ہے۔"

☆ وقال(ع): "برالوالدین اکبر فریضة."
آپؑ ہی کا ارشاد ہے۔ "والدین سے نیکی عظیم ترین فریضہ ہے۔"

☆ وقال الصادق(ع): "بروا اباءکم یبرکم ابناوکم."
امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے: "اپنے والدین سے نیکی کرو، تاکہ اپنے بچوں کی نیکی پاؤ۔"

☆ عن ابن مسعود، قال: "سالت رسول اللہ(ص): ای ا لعمل احب الی اللہ؟ قال: الصلاة علی وقتھا. قلت: ثم ای، قال: برالوالدین."
ابن مسعود کہتے ہیں: "رسول اللہؐ سے سوال کیا گیا: خداوندِ عالم کے نزدیک سب سے زیادہ

پسندیدہ عمل کیا ہے؟ فرمایا: بروقت نماز پڑھنا' پوچھا گیا اسکے بعد؟ فرمایا: والدین کے ساتھ نیکی کرنا۔"

☆ قال رسول الله(ص): "من بر والديه طوبى له زادالله فى عمره."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "ایسا شخص جو اپنے والدین سے نیکی کرے' اسکے لیے یہ خوش آئند بات ہے کہ خداوندِ عالم اسے طولِ عمر فرماتا ہے۔"

☆ وجاء رجل الى الرسول(ص) فقال: " جئت ابا يعك على الهجرة' و تركت ابوى يبكيان' فقال الرسول(ص): ارجع اليهما فاضحكهما كما ابكيتهما."

ایک شخص پیغمبر اکرمؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: "میں اپنے والدین کو روتا چھوڑ کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں' تا کہ ہجرت کے معاملے میں آپ کی بیعت کروں۔ آنحضرتؐ نے فرمایا: تم واپس ان کے پاس چلے جاؤ اور جیسا روتا چھوڑا ہے' ویسا ہی انہیں خوش کرو۔"

☆ وعن الامام الرضا (عليه السلام) :"ان الله عزوجل امر بالشكرله وللوالدين' فمن لم يشكر والديه لم يشكر الله."

امام رضاؑ نے فرمایا: "خداوندِ عالم نے اپنی اور والدین کی شکر گزاری کا حکم دیا ہے' جو شخص والدین کا شکر گزار نہ ہو' وہ خدا کا شکر گزار نہ ہوگا۔"

☆ وعن الرسول الاكرم(ص): "رضا الله فى رضاالوالد' وسخط الله فى سخط الوالد."

رسولِ اکرمؐ نے فرمایا: "باپ کی خوشنودی میں خدا کی خوشنودی ہے اور باپ کی ناراضگی میں خدا کی ناراضگی ہے۔"

☆ وكان من دعاء الامام زين العابدين(عليه السلام) :"اللهم اجعلنى اهابهما هيبة السلطان العسوف' وابرهما بر الام الرؤوف' واجعل طاعتى

لوالدی وبری بهما اقرلعینی من رقدة الوسنان واثلج لصدری من شربة الظمآن' حتی اوثر علی هوای هواهما."

حضرت امام زین العابدینؑ کی ایک دعا ہے: "خداوندا مجھے ایسا بنادے کہ ان سے ظالم سلطان کی مانند خوف کھاؤں اور مہربان ماں کی مانند ان سے سلوک کروں۔ ماں باپ کی اطاعت اوران سے حسنِ سلوک کو میرے لیے ایسا خوشگوار بنادے جیسے خواب آلودہ شخص کے لیے ایک لمحے کی نیند اور تشنہ لب کے لیے ٹھنڈا میٹھا پانی مزیدار اور محبوب ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ اپنی خواہش پر ان کی خواہش کو ترجیح دوں۔"

☆ وقال النبی الاعظم(ص):"الجنة تحت اقدام الامهات."

اوررسولِ اعظمؐ نے فرمایا:"جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔"

تربیتِ نفس کے بارے میں

☆ عن الامام امیرالمومنین علی (ع)انه قال:" من استدام ریاضة نفسه انتفع."

امیرالمومنین امام علیؑ سے منقول ہے کہ آپؑ نے فرمایا:"جس کسی نے اپنے نفس کی تربیت کو جاری رکھا اس نے فائدہ اٹھایا۔"

☆ وانه قال(ع):"للعاقل فی کل عمل ارتیاض."

آپؑ ہی نے فرمایا:"عقل مند انسان کے لیے ہر عمل میں تربیت کا پہلو ہوتا ہے۔"

☆ وقال(ع):"وایم الله یمینا استثنی فیها بمشیة الله' لاروضن ریاضة تهش معها الـه القرص اذا قدرت علیه مطعوما'وتقتنع بالملح مادوما ' ولادعن مقلتی کعین ماء نضب معینها مستفرغة دموعها."

آپؑ ہی نے فرمایا:"بخدا اپنے نفس کو اس انداز سے سدھاؤں گا کہ اگر غذا اس کا مقدر ہو تو

ایک ہی روٹی پر قناعت کرے' سوائے نمک کے کوئی سالن نہ ہو۔ اور اپنی آنکھوں کو کھلا رکھوں گا تا کہ مسلسل اشک افشانی کریں' یہاں تک کہ ان کا پانی اس طرح ختم ہو جائے جیسے چشمہ خشک ہوتا ہے۔"

☆ وقال(ع): "انما هی نفسی اروضها بالتقوی لتاتی آمنة یوم الخوف الاکبر وتثبت علی جوانب المزلق."

آپؑ ہی نے فرمایا: "اپنے نفس کی تربیت پرہیزگاری کے ذریعے کرتا ہوں' تا کہ اس روز سکون واطمینان کے ساتھ میدانِ حشر میں قدم رکھوں جس دن سب ایک عظیم خوف میں گھرے ہوں گے اور صراط پر (جہاں ہر کسی کے قدموں میں لڑکھڑاہٹ ہوگی) ثابت قدم رہوں۔"

☆ و قال(ع): "اسهروا عیونکم و ضمروا بطونکم' وخذوا من اجسادکم' وجودوابها علی انفسکم."

آپؑ ہی نے فرمایا: "اپنی آنکھوں کو بے خوابی کا عادی بناؤ' اپنے پیٹوں کو لاغر کرو اور اپنے تن سے لے کر اپنے نفس کو بخشو۔"

☆ و قال(ع): "لا تنجع الریاضة الا فی نفس یقظة."

آپؑ ہی نے فرمایا: "ریاضت (نفس کشی) صرف بیدار دلوں کے لیے مؤثر ہوتی ہے۔"

☆ وقال الصادق (علیه السلام) :یوصی عشوان البصری:"واما اللواتی فی الریاضة' فایاک ان تاکل مالا تشتهیه' فانه یورث الحماقة والبله' ولا تاکل الا عند الجوع' واذاا کلت فکل حلالا بسم الله واذکر حدیث الرسول (صلی الله علیه و اله) ماملابنو آدم وعاء شرا من بطنه."

امام جعفر صادقؑ نے عشوان بصری کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا: "ریاضت کے دوران کسی چیز کے کھانے کی خواہش ہو تو اس سے پرہیز کرو' کہ یہ حماقت اور سبک سری کا باعث ہے بھوک ہو تب ہی غذا کھاؤ۔ حلال کھاؤ اور غذا کھانے سے پہلے بسم اللہ کہو اور پیغمبر اسلامؐ کے

اس قول کو یاد رکھو جس میں آپؐ نے فرمایا ہے: آدمی نے اپنے شکم سے بدتر کسی برتن کو پر نہیں کیا ہے۔"

☆ ومن وصایاالخضر لموسیٰ (علیہ السلام): "رض نفسک علی الصبر' تخلص من الاثم."

حضرت خضرؑ کی جناب موسیٰؑ کو ایک وصیت یہ تھی: "اپنے نفس کو صبر وشکیبائی پر آمادہ کرو' تا کہ گناہ سے دور رہو۔"

☆☆☆☆☆

(۳)

تربیت کی ذمے داری

معلم و مربی کی خصوصیات

☆ اسلامی نظر میں ایک معلم و مربی کی کیا خصوصیات ہیں؟ اور اس کی ذمے داریاں کیا کیا ہیں؟

○ پہلی چیز جس کا کسی بھی معلم میں فنی لحاظ سے پایا جانا ضروری ہے' وہ اس علم پر عبور ہے جس کی وہ دوسروں کو تعلیم دینا چاہتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ اس علم پر عبور نہ رکھتا ہوگا' تو علم کی بجائے اپنا جہل دوسروں میں منتقل کرے گا۔ اگر معلم مناسب علم و دانش کا مالک نہ ہو' تو اپنی شخصیت بچانے کے لیے اپنے جہل پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرے گا اور زیرِ بحث موضوع کو شاگردوں کے سامنے مبہم اور مشتبہ بنا کر پیش کرے گا۔

لہٰذا معلم کو اپنے درسی مواد اور اس چیز کے بارے میں کافی مہارت کا حامل ہونا چاہیے جس کی وہ دوسروں کو تعلیم دینا چاہتا ہے' اور اسے ایک علمی امانت سمجھنا چاہیے۔ یہ مفہوم ہم اس قرآنی آیت سے حاصل کرتے ہیں' جو براہِ راست تعلیم کے موضوع سے متعلق تو نہیں البتہ جدال کے موضوع سے مربوط ہے' اس آیت میں فرمانِ الٰہی ہے:

"هٰاَنۡتُمۡ هٰؤُلَاۤءِ حَاجَجۡتُمۡ فِيۡمَا لَـكُمۡ بِهٖ عِلۡمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوۡنَ فِيۡمَا

لَیۡسَ لَکُمۡ بِہٖ عِلۡمٌ۔"

"اب تک تم نے ان باتوں میں بحث کی ہے جن کا تمہیں کچھ علم تھا' تو اب اس بات میں کیوں بحث کرتے ہو جس کا تمہیں کچھ بھی علم نہیں۔"

(سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ٦٦)

اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ انسان دوسروں سے ایسی چیزوں کے بارے میں گفتگو کرے جن کے بارے میں اسے علم نہ ہو' اسی لیے مذکور بالا آیۂ کریمہ میں ان افراد کی سخت مذمت کی گئی ہے جو ایسی چیزوں کے بارے میں بحث کرتے ہیں جن سے وہ یکسر ناواقف ہیں۔ جب صورت یہ ہو' تو اسلام کیسے یہ بات قبول کرسکتا ہے کہ لوگ دوسروں کو ایسے موضوعات کی تعلیم دیں جن کے متعلق وہ خود علم نہیں رکھتے؟

ہمارا خیال ہے کہ اس اصول کا تعلق صرف تعلیم ہی سے نہیں ہے' بلکہ یہ ہر ایسی ذمے داری سے مربوط ہے جس کے بارے میں انسان خاطر خواہ علم و آگہی نہ رکھتا ہو۔

اس بنیاد پر جب ولایتِ فقیہ اور مشورت وغیرہ کی اساس پر حکم صادر کرنے والے دوسرے کسی بھی مقام و منصب کا مسئلہ سامنے آئے' تو ہمیں متوجہ رہنا چاہیے کہ قائد کے لیے کسی ایسے امر کے بارے میں فیصلہ صادر کرنا روا نہیں جس کے بارے میں وہ کافی علم اور واقفیت کا مالک نہ ہو۔ اسی طرح فقیہ کے لیے بھی جائز نہیں کہ وہ کسی اقتصادی' سیاسی' اجتماعی اور عسکری معاملے میں حکم صادر کرے' مگر یہ کہ حکم دینے سے پہلے اس نے ان موضوعات کے ماہرین سے رجوع کیا ہو اور ان کے تمام پہلوؤں کے بارے میں کافی معلومات حاصل کرلی ہوں' یہاں تک کہ اُس میں ان معاملات کے بارے میں حکم صادر کرنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی ہو۔ ہو بہو یہی چیز معلم میں بھی ہونی چاہیے۔

مربی کو ایسی اعلیٰ اخلاقی خصوصیات سے آراستہ ہونا چاہیے جو اسے اپنے زیرِ تربیت افراد کو فکر دینے کے قابل بنا دیں۔ کیونکہ اس کا ماڈل اور مثالی شخصیت کا مالک ہونا اسکے کلام

کی تاثیر کو بڑھا دیتا ہے۔ اسی بنا پر امیر المومنینؑ نے فرمایا ہے:

"من نصب نفسه للناس اماماً فليبدا بتعليم نفسه قبل تعليم غيره، وليكن تاديبه بسيرته قبل تاديبه بلسانه، ومعلم نفسه ومودبها احق بالاجلال من معلم الناس ومودبهم."

''جو خود کو لوگوں کا پیشوا بنانا چاہتا ہے، اسے دوسروں کو تعلیم دینے سے پہلے اپنے آپ کو تعلیم دینا چاہیے اور زبان سے درس دینے سے پہلے اپنی سیرت و کردار سے سبق دینا چاہیے، اور جو اپنے نفس کی تعلیم و تادیب کرلے وہ دوسروں کی تعلیم و تادیب کرنے والے سے زیادہ قابلِ احترام ہے۔''

(نہج البلاغہ۔ کلماتِ قصار ۷۳)

بہرصورت تربیت کا عمل کلام اور بیان کے دوسرے طریقوں سے زیادہ ماڈل اور نمونۂ عمل سے وابستہ ہے۔ اور درحقیقت مثالی شخصیت کی مدد ہی سے کلام انسانی نفس پر اپنے اثرات مرتب کرتا ہے۔

مختلف طریقے اپنانا

دوسری طرف معلم اور مربی حضرات پر لازم ہے کہ وہ تربیت کے مختلف اسالیب اور طریقوں سے استفادے کی قدرت رکھتے ہوں، تاکہ کسی فکر کو طالبِ علم کے ذہن میں داخل کرسکیں، یا کسی خوبی کو اپنے زیرِ تربیت انسان کی روح میں منتقل کرسکیں۔ کیونکہ جب ہم اپنے افکار و خیالات دوسروں میں منتقل کرنے کا ارادہ رکھتے ہوں، تو اس موقع پر بنیادی ترین مسئلہ جو ہمارے سامنے ہوتا ہے وہ اس مقصد کے لیے اسلوب اور طریقۂ کار کا انتخاب ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے معلم و مربی حضرات اپنے شاگردوں کی تربیت میں ناکا[م] رہتے ہیں۔ ان کی ناکامی کی وجہ وہ غلط طریقہ ہے جسے وہ دوسروں میں کسی خوبی یا علم کی منتقل[ی]

کے لیے اختیار کرتے ہیں۔ ہر چند وہ خود کافی علم و دانش کے مالک اور خوبیوں اور اخلاق سے آراستہ ہوتے ہیں، لیکن اُن کے پاس ایسا طریقہ نہیں ہوتا جس کے ذریعے وہ دوسروں کے ذہن تک رسائی حاصل کر سکیں۔ رسولِ کریمؐ سے مروی ایک حدیث میں یہی نکتہ ملتا ہے، فرماتے ہیں:

"انا معاشر الانبیاء امرنا ان نکلم الناس علی قدر عقولھم."

"ہم انبیا کو حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے ان کی عقل و فہم کے مطابق گفتگو کریں۔" (اصولِ کافی۔ ج ۱۔ ص ۲۳)

ایک داعی، معلم اور مربی پر لازم ہے کہ جن لوگوں کی وہ تعلیم و تربیت کرنا چاہتا ہے، اُن کی فہم و ادراک کے پیمانے سے واقف ہو، تاکہ اسے پتا چل سکے کہ ان کی عقل کے مطابق ان سے کس طرح کی گفتگو کی جائے اور ان سے اپنی دعوت قبول کرانے کے لیے کونسا طریقہ اپنایا جائے۔

اس مفہوم کو ہم قرآن کی اصطلاح "حکمت" سے اخذ کر سکتے ہیں۔ حکمت کے معنی ہیں ہر چیز کو اس کی موزوں جگہ پر رکھنا۔ لہٰذا حکیمانہ کلام ایسے کلام کو کہا جاتا ہے جسے اسکے مناسب مقام پر ادا کیا گیا ہو، اور حکیمانہ اسلوب و روش وہ ہے جسے اس کے مناسب مقام پر استعمال کیا جائے اور اسی طرح دوسرے امور ہیں۔ اور اسی کو بلاغۃ الکلام (گفتگو کا مقتضائے حال کے مطابق ہونا) بھی کہا جاتا ہے۔ مقتضائے حال میں مخاطب انسان کی ذہنیت سے لے کر اس کا ماحول، اسکے قلبی رجحانات اور اسکے اردگرد کے حالات تک شامل ہوتے ہیں۔

طلبا کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا

ایک اور نکتہ جس کا ذکر یہاں ضروری ہے، وہ یہ ہے معلم و مربی کو طالبِ علم اور اپنے

زیر تربیت فرد کے ساتھ مشفقانہ برتاؤ کرنا چاہیے۔ یعنی اسے یہ احساس ہونا چاہیے کہ اکی ذمے داری ہے کہ اپنے شاگردوں کے قلب و ذہن کے دروازوں کو کھولے' نیز ان کی کمزوریوں اور نقائص پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کرے' تا کہ انہیں اپنے پیش نظر بلند و بالا منزل تک پہنچا سکے۔ اسے تعلیم و تربیت کے دوران تنگ دلی اور تند مزاجی نہیں برتنی چاہیے اور نہ ہی سخت اور درشت طریقے اپنانے چاہئیں۔ جیسا کہ ہم رسولِ گرامی اسلامؐ کی دعوت کے دوران اسی صبر و بردباری کا مشاہدہ کرتے ہیں: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَ لَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَا نْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ. (یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ تم ان لوگوں کے لیے نرم ہو' ورنہ اگر تم بد مزاج اور سخت دل ہوتے' تو یہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے۔ سورۂ آلِ عمران ۳۔ آیت ۱۵۹) اور جیسا کہ ایک دوسری آیت میں ارشادِ ربانی ہے: لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ. (یقیناً تمہارے پاس وہ پیغمبر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس پر تمہاری ہر مصیبت شاق گزرتی ہے۔ وہ تمہاری ہدایت کے بارے میں حرص رکھتا ہے اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۸)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بنیادی وصف آپ کا معلم و مربی کی صفت کا حامل ہونا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم آپ کے بارے میں فرماتا ہے: هُوَ الَّذِىْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْحِكْمَةَ. (اس خدا نے اُمیوں میں ایک رسول بھیجا ہے' جو ان ہی میں سے تھا کہ ان کے سامنے آیات کی تلاوت کرے' ان کے نفوس کو پاکیزہ بنائے اور انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ سورۂ جمعہ ۶۲۔ آیت ۲)

یہی معلم و مربی کی اخلاقی خصوصیات ہیں اور مذکورہ آیت میں جس ''تزکیے'' کی بات کی گئی ہے وہ ''تربیت'' ہی ہے۔

حوزۂ علمیہ (دینی مدرسے) اور یونیورسٹی کی تعلیم کا موازنہ

☆ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ روایتی طرزِ تعلیم جو مثلاً حوزۂ علمیہ نجف اشرف یا جامعہ الازہر میں رائج ہے، بہتر ہے۔ کیونکہ ان مراکز نے بڑے بڑے علما پیدا کیے ہیں۔ جبکہ بعض دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ تعلیم کے نئے اسالیب سامنے لانے چاہئیں اور یہ لوگ یونیورسٹیوں اور اکیڈمیوں کے طرزِ تعلیم کو بہتر سمجھتے ہیں۔ ان دونوں آراء میں سے آپ کا جھکاؤ کس جانب ہے؟

O جس طرح حوزۂ علمیہ کے طرزِ تعلیم کو مطلقاً افضل قرار دینا درست نہیں، اسی طرح یونیورسٹی اور کالج کے طریقۂ تدریس کو قطعی طور پر برتر سمجھنا بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ان دونوں ہی طرزہائے تعلیم میں خوبیاں اور خامیاں موجود ہیں۔

یونیورسٹی کے طرزِ تعلیم کے مقابل حوزۂ علمیہ کے طریقۂ تعلیم میں فکر کی جنبش اور گہرا سوچ بچار زیادہ نظر آتا ہے۔ جبکہ یونیورسٹی کے طرزِ تعلیم میں حوزۂ علمیہ کے اسلوبِ تدریس سے زیادہ وضاحت، افکار کی تقسیم بندی اور توازن و وسعت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حوزوی طرزِ تعلیم بہت سے مقدسات کی نشو ونما اور ترویج کرتا ہے۔ ہماری مراد صرف دینی مقدسات ہی نہیں ہیں، بلکہ وہ علمی مقدسات بھی ہیں جن کے باعث بعض فقہا جدید علمی خیالات کے اظہار میں تامل کرتے ہیں اور اس میدان میں قدم رکھنے سے ہچکچاتے ہیں۔ اور اسکی وجہ ان کے دلوں میں علمائے سلف اور گزشتہ مشاہیر کی قدسیت ہوتی ہے۔ یہ چیز یونیورسٹیوں کے لوگوں میں نظر نہیں آتی، کیونکہ وہاں کسی چیز کو فکری تقدس کی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔

اس بنا پر ہماری تجویز یہ ہے کہ حوزے اور یونیورسٹی، دونوں کے طرز ہائے تعلیم کے مثبت نکات اور خوبیوں سے استفادہ کرتے ہوئے ایک نئے طرزِ تعلیم کی بنیاد رکھی جائے۔ تاکہ اسکے مطابق عمل کے ذریعے علم و دانش کی گہرائی اور وسعت میں اضافہ کیا جاسکے۔

البتہ یہ کہنا حوزۂ علمیہ کے طرزِ تعلیم کی برتری اور افضلیت کی دلیل نہیں کہ اس طریقۂ تدریس نے بڑے بڑے علما کو جنم دیا ہے۔ کیونکہ اسکے جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ حوزوی طرزِ تعلیم کے نتیجے میں ان علما کو بہت سخت محنت مشقت کرنی پڑی اور اگر کوئی دوسرا طرزِ تعلیم ہوتا، جو علمی تحقیق و تفتیش کے عمل کو زیادہ آسان بناتا، تو یہ لوگ اس سے بھی کم تر مدت میں ان علمی مراحل کو طے کر سکتے تھے۔

گھر اور اسکول کے درمیان تعاون

☆ گھر اور اسکول، بچے کی تربیت میں کس طرح ایک دوسرے کے مددگار ہو سکتے ہیں؟

O اسکول سے کبھی کبھی خشک اور خالی معلومات کے سوا بچے کو کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکول علمی ادارہ ہے اور ''تربیت''، یعنی طرزِ عمل اور اخلاق و آداب سے آراستگی کا زیادہ اہتمام نہیں کرتا اور اسے بنیادی اہمیت نہیں دیتا۔

اسکے علاوہ گھر اور اسکول کے ماحول میں پایا جانے والا فرق اور اساتذہ کا علمی مسائل میں مشغول رہنا، ممکن ہے بچوں کی تربیت پر مضر اثرات مرتب کرے۔ کیونکہ بچوں کا اسکول میں اپنے ایسے ساتھیوں سے بھی سروکار رہتا ہے جو ان سے مختلف ماحول، رجحانات، رسوم و آداب اور مسالک کے حامل ہوتے ہیں۔ لہٰذا اہلِ خانہ کا فرض ہے کہ وہ بچے کے طرزِ عمل کی نگرانی اور اسکول کے منفی اثرات کی روک تھام کے لیے اقدام اٹھائیں۔ اسی طرح یہ صورتحال ان پر یہ بھی لازم کرتی ہے کہ وہ بچے کی تربیت اور اسکی نگرانی کے لیے زیادہ اہتمام کریں، تاکہ اس طرح اس کے اعمال و اخلاق کو صحیح سمت دی جاسکے۔

یہ ایک پہلو تھا، دوسرا پہلو یہ ہے کہ اہلِ خانہ پر لازم ہے کہ اپنے بچے کی سرگرمیوں پر نظر رکھیں اور یہ دیکھیں کہ وہ اپنی تعلیم پر کتنی توجہ دیتا ہے۔ کیونکہ اسکول سے نکلنے کے بعد بچہ اپنی تعلیم، اسکول کی طرف سے سونپے گئے کاموں کی انجام دہی اور امتحان کی تیاری کے سلسلے

میں ذمے داری کا احساس نہیں کرتا۔

گھر کے بڑوں پر لازم ہے کہ بچے کے تعلیمی دور میں اسکی تعلیم اور اخلاقی تربیت کے سلسلے میں خود کو غیر معمولی صورتحال سے دوچار سمجھیں۔

نوجوان کی تربیت میں گھر اور اسکول کا کردار

☆ متعین طور پر بتایئے کہ نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کی تربیت کے سلسلے میں ان دونوں اداروں (گھر اور اسکول) کا کیا کردار ہے؟

O جب ہم نو بالغ انسان کی شخصیت کا مطالعہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ وہ حیران و پریشانی اور اضطراب و تشویش کے عالم میں ہوتا ہے۔ یہ حالت اسکی فکر اور روح کو بربادی کی جانب لے جاتی ہے۔ مزید یہ کہ عمر کے اس حصے میں جبلتوں کی بیداری اس میں جنسی احساس کو جنم دیتی ہے۔ اس مرحلے میں اگر اس پر مناسب توجہ نہ دی جائے اور دانائی کے ساتھ اسکی نگرانی نہ کی جائے، تو (والدین اور اساتذہ کی) یہ غفلت اسکی شخصیت کی تباہی اور اسکے مستقبل کی بربادی پر منتج ہوتی ہے۔

لہٰذا ہماری ذمے داری ہے کہ عمر کے اس مرحلے میں اپنے بچے پر توجہ دیں اور اسکے اخلاق، اعمال، روابط اور سرگرمیوں پر اس مرحلے کے منفی اثرات کو مدِ نظر رکھیں۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ہمیں ظالمانہ، درشت اور سخت طریقے نہیں اپنانے چاہئیں، بلکہ تنبیہ، توجہ، رعایت اور اسکی ہمراہی اور مدد کے ذرائع سے استفادہ کرنا چاہیے، تاکہ وہ اس مرحلے کو سلامتی کے ساتھ عبور کرلے۔

کیونکہ ہمارے معاشرے پر مردوں کا غلبہ ہے، اس لیے نوجوان لڑکیاں خاص نفسیاتی حالت کا شکار ہو جاتی ہیں۔ جس کے باعث وہ اپنی خود اعتمادی کھو بیٹھتی ہیں۔ کبھی کبھی وہ اپنی سادگی کی بنا پر بھی دوسروں کی طرف سے سوءِ استفادہ کا نشانہ بن جاتی ہیں۔ کیونکہ وہ

معاشرے کے بارے میں خاطر خواہ معلومات نہیں رکھتیں۔ جبکہ لڑکے اس بارے میں ا
سے زیادہ باخبر ہوتے ہیں۔

لہٰذا ہمیں لڑکیوں پر زیادہ اور گہری توجہ دینے کی ضرورت ہے' تا کہ ان میں ایسی خو
اعتمادی وجود میں لائیں جو انہیں دوسروں کے سوءِ استفادہ سے محفوظ رکھ سکے اور ان میں اي
شعور پیدا کریں جو راہِ راست طے کرنے میں ان کا مددگار ہو جائے۔

سزا اور جزا

☆ تنبیہ اور سزا' ادب آموزی کا ایک وسیلہ ہے۔ اسی طرح ترغیب اور انعام' حوصلہ افزائی اور اچھے کاموں پر آمادہ کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔ اسلام ان دونوں کو کس نظر سے دیکھتا ہے؟ نیز بچوں اور بچیوں کی غلطیوں کا علاج کس طرح کیا جائے؟

○ تربیت کا مقصد فکری اور اخلاقی اطمینان اور یکسوئی ایجاد کرنا' یا شخصیت پر اثرات مرتب کرنا اور انسان کو عمل پر ابھارنا ہے۔ لہٰذا اسے لازماً انسانی سرشت کی گہرائی سے متصل ہونا چاہیے۔ تاکہ افکار و احساسات کو اسلامی حقائق کی جانب جذب کر سکے۔

اس بنا پر یہ ممکن نہیں کہ انسان کے ذاتی فکری و شعوری عناصر سے جدا کوئی تربیتی اسلوب باہر سے اس پر مسلط کیا جا سکے۔ کیونکہ انسان ایک زندہ اور متحرک موجود ہے اور زندگی میں اسکے تمام افعال و اعمال کا مقصد اپنی احتیاجات اور خواہشات کی تسکین ہے۔ اسکی خوشیاں' اسکے غم' اسکی رغبتیں اور اسکے خوف سب کے سب اسی دائرے میں ہوتے ہیں۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اسکے تمام اعمال خود بخود اور قدرتی طور پر اسکے روحانی اور مادّی میلانات کی تسکین کے لیے ہیں۔ یہاں تک کہ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں ہو پاتا کہ وہ ان عناصر کے زیرِ اثر ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ فطری طور پر ان چیزوں سے گریز کرتا ہے جو اسے ناگوا

گزرتی ہیں' یا جن سے وہ خوفزدہ ہوتا ہے اور اس عمل میں بناوٹ کا شائبہ تک نظر نہیں آتا۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ رغبت اور گریز اور حب اور بغض کا مسئلہ ان مسائل میں سے ہے جو انسان کے مقام اور اسکی حرمت پر حاکمیت رکھتے ہیں۔

جب ہم انسان کی حقیقت کے بارے میں جستجو کرتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ اگرچہ انسانوں میں حب اور بغض یا اُمید اور خوف کے اظہار کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں لیکن بنیادی طور پر تمام لوگوں کو اُمید آگے بڑھاتی ہے اور خوف پیچھے کھینچتا ہے۔ (البتہ اگر اس طرح کی تعبیر درست ہو تو) اور یہی معاملہ حب اور بغض کا ہے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ تمام انسانی مکاتب' بشریت کی تنظیم کے لیے ان دو عناصر یعنی خوف اور اُمید سے استفادہ کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر خوف اور اُمید کے محرکات ایجاد کرنے کے لیے پروگرام بنائے گئے ہیں۔ یہ امر اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ثواب وعقاب ایک ایسا مسئلہ ہے جو انسان کے تکامل کے تمام مراحل میں اسکی ہستی پر اثرانداز ہوتا ہے۔

لیکن اگر ہم نوجوانوں اور بچیوں کی تربیت کے سلسلے میں تشویق وتنبیہ' اُمید وخوف سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں' تو ہم پر لازم ہے کہ ان کی ذہنیت' ان کی عمر کے مرحلے' ان کے گردوپیش کے حالات اور ان کی شخصیت کے قوی اور ضعیف عوامل سے ہم آہنگ اور متناسب عناصر اور وسائل اختیار کریں۔ کیونکہ کبھی کبھی کوئی پاداش اور جزا انسان کی شخصیت کے داخلی عناصر سے عدم موافقت کی بنا پر (جبکہ اسے کسی اور خاص جزا کی توقع ہو) منفی عنصر میں بدل جاتی ہے۔ اور بسا اوقات کوئی عقاب اور سزا مثبت عنصر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ لہٰذا اس حقیقت کا تقاضا ہے کہ جزا اور سزا کا اسلوب اپناتے ہوئے عقل وحکمت سے کام لیا جائے۔

اس بنیاد پر مربی کو سخت کلمات کہنے یا مارنے پیٹنے جیسے اقدامات کے بارے میں خوب غور وفکر کر لینا چاہیے۔ کیونکہ مثلاً ایک ایسے انسان کو مارنا جس کی ادب آموزی کے لیے سخت الفاظ ہی کافی ہیں اس میں نفسیاتی پیچیدگی پیدا ہونے کا سبب بن جاتا ہے۔ یہ عمل

اسکی عزتِ نفس کو مجروح کرتا ہے اور ممکن ہے اسکے اثرات کم نہ ہو سکیں' اور نتیجے کے طور پر وہ خود اعتمادی سے محروم ہو جائے۔' یا اپنے گرد و پیش رہنے والے افراد سے ان کے طرزِ عمل کی بنا پر اپنے دل میں کینہ و عداوت رکھنے لگے۔

شریعت کا موٗقف

اسی وجہ سے رسولِ کریمؐ نے ایسے موقع پر ادب آموزی سے منع فرمایا ہے جب انسان غصے میں ہو۔ کیونکہ غصے کی حالت میں انسان بچے کی تادیب اور ہدایت و رہنمائی کے لیے کوئی حکیمانہ روش نہیں اپنا سکتا۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام تربیت کے ہر قسم کے منفی اسلوب سے بلا ضرورت استفادے کو حرام قرار دیتا ہے۔ لہٰذا جائز نہیں کہ ہم بچوں کو سخت و سست کہیں اور انہیں بُرے اور اہانت آمیز الفاظ سے مخاطب کریں۔ کیونکہ غیر ضروری طور پر اس قسم کے الفاظ کا استعمال بچے کی شخصیت اور طرزِ عمل پر منفی اثرات کا موجب ہوتا ہے۔ بچے بھی قابلِ احترام انسان ہیں اور ہم پر واجب ہے کہ معقول حد میں ان کے افکار و خیالات' جذبات و احساسات اور شخصیت کا احترام کریں۔ صرف ان ہی مواقع پر ان چیزوں سے بے توجہی اور بے اعتنائی جائز ہوگی جب وہ بچے کے لیے ضروری ہو یا اسکی مصلحت اور مفاد کا تقاضا ہو۔

اسی طرح جب غصے سے بات کرنا اور بچے کو اسکی پسندیدہ چیز سے روک دینا ہی مسئلے کو حل کر دے' تو غیر ضروری طور پر بچے کو مارنا جائز نہیں۔ لیکن جب یہ دیکھیں کہ مارنا ہی تادیب کا واحد راستہ رہ گیا ہے' تو اتنا آہستہ سے ماریں کہ اسکی جلد (skin) سرخ نہ ہونے پائے۔ لیکن اگر مارنے سے بچے کی جلد سرخ ہو جائے' تو اسکی شرعی دیت ادا کرنا واجب ہے۔ کیونکہ خداوندِ عالم یہ نہیں چاہتا کہ بچہ ماں باپ یا اپنے معلم و استاد کے غم و غصے کی آگ یا گرم مزاجی کی بھڑاس نکالنے کا مقام بن جائے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ جزاوسزا پر موقع محل کی مناسبت سے روحانی، فکری یا مادّی صورتوں میں عمل کیا جاسکتا ہے۔

تربیت، رغبت اور خوف کا آمیزہ

تربیت کو لازماً ان دو عناصر پر استوار ہونا چاہیے۔ یعنی اپنے بچے میں ''رغبت'' دے کر آگے بڑھنے کا اور ''خوف'' پیدا کر کے دوری کا محرک ایجاد کریں، اور تربیت کے دوران جزاوسزا کے مسئلے کو ایک بنیادی مسئلہ قرار دیں۔ کیونکہ بہت مشکل ہے کہ انسان کسی عمل سے حاصل ہونے والے مثبت یا منفی نتائج واثرات پر توجہ کیے بغیر محض اپنی اندرونی خواہش پر اسے انجام دے۔ حتیٰ بعض فلسفیوں کا خیال ہے کہ انسان کی پسند اور کسی چیز کی جانب اسکے رجحان کا محرک، حبِ ذات ہے۔ وہ اس چیز کی جانب لپکتا ہے، جس میں اسکی پسندیدہ شئے پائی جاتی ہے۔ نتیجے کے طور پر کہا جاسکتا ہے کہ انسان کے محرک کا عامل خواہشات کی تسکین کے لیے اس میں پیدا ہونے والی رغبت ہے۔

معروف قول ہے کہ کچھ لوگ جزا اور ثواب کے شوق میں خدا کی عبادت کرتے ہیں اور کچھ لوگ عذاب اور سزا کے خوف سے اُسکی پرستش کرتے ہیں، اور کچھ لوگوں کا حال یہ ہے کہ اُن کی عبادت نہ تو جزا کے شوق میں ہوتی ہے اور نہ ہی سزا کے خوف سے۔

اس کلام پر غور وفکر ہمیں اس نتیجے پر پہنچاتا ہے کہ پہلی قسم کی عبادت کی بنیاد انسان کے نفس میں پائی جانے والی گہری رغبت اور شوق ہے۔ کیونکہ جب انسان دل کی گہرائی سے خدا سے محبت کرتا ہے اور اس کا یہ عمل اسے خدا کی جانب مائل کرتا ہے، تو اس طرح دراصل وہ اپنے باطن سے اُٹھنے والی پکار کا جواب دیتا ہے۔ ایسی حالت میں عبادت ایک ایسا عمل ہوجاتی ہے جو محبوب سے محبت کی عکاس ہے اور عابد کے لیے ایک پسندیدہ اور لذت وسرور کا موجب عمل ہے۔

لہٰذا شوق و رغبت' آدمی کی ذات سے علیحدہ کوئی چیز نہیں۔ بلکہ بسا اوقات جزاو پاداش کی جانب رغبت انسان کے احساس میں گھر کر لیتی ہے۔ لہٰذا بچوں اور جوانوں کو اخلاقی اصولوں' پسندیدہ آداب و روایات اور افکار و اعمال سے نزدیک کرنے کی غرض سے تربیت کے دوران اس عنصر (شوق و رغبت) سے استفادہ لازم ہے۔ تاکہ پہلے مرحلے میں وہ خود اپنے اندر ان چیزوں کی جانب جھکاؤ محسوس کریں' اسکے بعد اس جھکاؤ کے عملی نتائج ان کے وجود میں نمایاں ہوں اور آخر کار وہ اُن چیزوں پر ایمان لائیں اور ان سے محبت کریں اور اس طرح ان کے دل و جان میں ایک نئی لذت اور شوق و اشتیاق پیدا ہو۔

قرآن نے دونوں طریقوں سے کام لیا ہے

قرآنِ کریم جہاں جنت اور دوزخ کی بات کرتا ہے' جہاں کچھ کاموں کی انجام دہی پر اُکسانے والے اور کچھ کاموں سے روکنے والے عوامل کے عنوان سے انسانی مصالح و مفاسد کے بارے میں گفتگو کرتا ہے' وہاں درحقیقت ان دونوں طریقوں (خوف و رجا) سے استفادہ کرتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک طبیعی راستہ ہے جو انسان کے لیے فطری طریقے سے راہِ ہدایت کی جانب جھکاؤ کو ممکن بناتا ہے۔ حتیٰ ایمان اور کفر کا مسئلہ بھی ان دونوں (ایمان اور کفر) کے انسانی مستقبل سے مربوط ہونے اور اس پر ان کے مثبت اور منفی اثرات کی بنا پر سامنے آتا ہے اور انسان ایمان کا راستہ اس وجہ سے اختیار کرتا ہے کہ کفر کی راہ چلنے میں خطا کا امکان پایا جاتا ہے۔ آخر کار رفتہ رفتہ اس کا ایمان گہرا ہو جاتا ہے اور اس کا فکری سفر اسے اس نتیجے پر پہنچا دیتا ہے کہ اسے اپنی پہلی رغبت (کفر) سے دور ہو کر دوسری رغبت (ایمان) سے جڑ (attach) جانا چاہیے۔

بہر حال ہماری گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سزا و جزا کا مسئلہ اگرچہ بنیادی مسائل میں سے ہے' لیکن ہمیں اس سے استفادے کے اسلوب سے بخوبی واقف ہونا چاہیے' اور یہ

بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ ان دونوں اصولوں کو مکمل طور پر مادّی اور مفاد پرستانہ مسئلہ نہ سمجھیں، بلکہ اسے ایک ایسی فضا بخشیں جو انسان کے انسانی احترام و فضیلت کو بھی ملحوظ رکھے اور اسی کے ساتھ ساتھ اسکے ذاتی محرکات کو بھی مہمیز کرے۔

زدوکوب کرنا چاہیے یا نہیں؟

☆ مغرب کے تربیتی مکتب میں مار پیٹ کو منفی اور ناپسندیدہ اعمال میں سے سمجھا جاتا ہے۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

O اس مسئلے کے بارے میں وسیع تحقیقات کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ لوگوں کی اصلاح کے سلسلے میں نہ ہی لفظی تلقین و تادیب مؤثر رہتی ہے اور نہ ہی اصلاح کا کوئی دوسرا طریقہ ان کے لیے کارگر ہوتا ہے۔ سوائے زدوکوب کرنے کے ان کو سدھارنے کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا۔ البتہ مار پیٹ بھی اس طرح ہونی چاہیے جس کا ذکر ہم پہلے کرچکے ہیں۔ یعنی اس میں ایذا رسانی اور سخت گیری کا مظاہرہ نہ ہو اور نہ ہی اس قدر زور سے مارا جائے کہ جلد (skin) سرخ ہوجائے۔ ان باتوں کا خیال رکھتے ہوئے مارنا کبھی کبھی لفظی تادیب سے زیادہ کارآمد اور مؤثر ہوتا ہے۔ کیونکہ نسبتاً بہت جلد مقصد تک پہنچا دیتا ہے۔

تربیت کے سخت ذرائع کا جائزہ لینے پر ہم انسانوں کو اُن کی بعض خواہشات اور اُن کی پسندیدہ چیزوں سے روکنے والے طریقوں کے درمیان کوئی فرق نہیں پاتے۔ مثلاً کسی بچے کو پڑھائی پر توجہ دینے کی غرض سے اسکی مرغوب غذا یا دل پسند کھیل سے روکنا، یا اسے اپنی کسی عادت کی اصلاح اور سبق یاد کر لینے پر انعام دینا۔ یا اسکے برخلاف صورت میں اسے کمرے میں بند کردینا، یا اسکے ساتھ سختی سے پیش آنا۔ یہ تمام طریقے بچے کو نفسیاتی نقصان پہنچا سکتے ہیں اور ممکن ہے اس طریقے سے اسے اس کی بعض خواہشات اور پسندیدہ باتوں کی پیروی سے روکنا، اسے دوسرے طریقوں سے ممانعت سے زیادہ گراں گزرے۔

ہم مار پیٹ کو مطلقاً کوئی صحیح طریقہ قرار نہیں دے سکتے اور ان (اہلِ مغرب) سے اس نکتے کے بارے میں کوئی خاص اختلافِ نظر نہیں رکھتے کہ اگر مارنے کی وجہ سے بچے کی نفسیات پر منفی اثرات مرتب ہوں' مثلاً زدوکوب کرنا اسے نفسیاتی پیچیدگی میں مبتلا کردے' اسکی شخصیت کی بربادی کا سبب ہو اور اسے فطری اور انسانی نشو ونما کے راستے سے ہٹا دے' تو یہ عمل جائز نہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا مارنا بطورِ مطلق ایک منفی عمل ہے؟ اور کیا نرمی اور ملائمت کا طریقہ بطورِ مطلق مثبت ہے؟

بچوں اور بڑوں کے بارے میں تجربہ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بسا اوقات جرائم کی روک تھام اور معاشرتی نظم وضبط کے استحکام کے لیے سختی ضروری ہو جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں تادیب کے لیے مارنے پیٹنے' برا بھلا کہنے اور اہانت وتحقیر کرنے کی بات نہیں کی گئی ہے۔ بلکہ اسلام نے تربیت کی ضرورتوں کی بات کی ہے۔ للٰہذا ہر وہ چیز جو تربیت کے لیے ضروری ہے (اس طرح کہ اگر اس سے استفادہ نہ کیا گیا تو برعکس نتیجہ برآمد ہوگا) جائز اور پسندیدہ ہے۔

مخلوط تعلیم کے خطرات

☆ مخلوط تعلیمی اداروں کے بارے میں اسلام کی رائے کیا ہے؟

○ بنیادی طور پر اسلام عدم اختلاط کا قائل ہے۔ اسکے برخلاف اختلاط کے طرفداروں کا دعویٰ یہ ہے کہ ایسا معاشرہ جہاں مردوں اور عورتوں کے درمیان فاصلہ ہو' وہاں نفسیاتی' معاشرتی اور بسا اوقات اخلاقی نشو ونما کے اعتبار سے منفی نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ کیونکہ عدم اختلاط کی بنا پر مرد و زن ایک دوسرے سے دور رہتے ہیں اور یہ دوریاں بعض اوقات بہت سے غیر حقیقی تخیلات و افکار کے فعال ہونے کا سبب بنتی ہیں۔ جبکہ اگر ان کی زندگی

اجتماعی روابط کے لحاظ سے طبعی اور معمول کی حالت میں تبدیل ہو جائے' تو ان تخیلات کو تحریک دینے والے عوامل کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا۔

لیکن اس بارے میں ہمارا خیال یہ ہے کہ اگر چہ ممکن ہے ان کا مذکورہ بالا دعویٰ ایک حد تک درست ہو' لیکن اخلاقی مسائل کے بارے میں تجربہ اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جب کبھی مردوں اور عورتوں کے اختلاط میں اضافہ ہوا ہے' اخلاقی اصولوں کی پابندی میں کمی واقع ہوئی ہے' اور نفسیاتی مسائل پر ہیجان و اضطرار کی سی کیفیت طاری ہوئی ہے۔ کیونکہ خاص کر جوانی کے دور میں (مردوں اور عورتوں کا) اختلاط بہت زیادہ تحریک کا سبب بنتا ہے۔ کیونکہ اس دور میں نوجوان (لڑکوں اور لڑکیوں) کے اذہان پر جنسی مسئلہ بہت زیادہ غالب ہوتا ہے اور اس صورتحال کے نتیجے میں اگر وہ عملی طور پر گمراہی کا شکار نہ بھی ہوں' تب بھی یہ چیز پیچیدہ نفسیاتی مسائل پر ضرور منتج ہوتی ہے۔

شاید یہی وجہ ہے کہ سماجی علوم کے بہت سے ماہرین کہتے ہیں کہ: بہت ہی مشکل سے یقین کیا جاسکتا ہے کہ مردوں اور عورتوں کے درمیان پائی جانے والی دوستی مخلصانہ اور بے لوث ہو۔ کیونکہ جب کبھی دوستی گرمجوشی کی حالت میں بدلتی ہے' تو جنسی جبلّت کو مردوزن کی جسمانی دستیابی کے راستے کی طرف اُبھارتی ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا مشاہدہ عام طور پر کیا جاسکتا ہے۔

جب مغرب ''جنسی آزادی'' کو بھی آزادی کی ایک شاخ قرار دیتا ہے' اسے ایک طبعی حالت اور معمول کی بات کے بطور پیش کرتا ہے' تو انہیں اس میں کوئی اخلاقی کراہت نظر نہیں آتی۔ بلکہ وہ لوگ عدم اختلاط اور مردوزن کے درمیان آزادانہ میل ملاپ نہ پائے جانے کو منفی اثرات ونتائج کا سبب قرار دیتے ہیں۔ لیکن جب ہم کسی معاشرے میں ان سے مختلف اخلاقی اقدار کی اساس پر زندگی بسر کریں' تو ان اخلاقی اقدار اور اختلاط کے مسئلے کے درمیان بہت ہی مشکل سے ربط و ہم آہنگی پیدا کر سکتے ہیں۔ کیونکہ اختلاط ایسی فضا میں

زندگی بسر کرنے والے انسانوں کے لیے بکثرت مشکلات ایجاد کر دیتا ہے۔

خواتین کا مختلف میدانوں میں کام کرنا

☆ ایسے شعبے جو عورت کی طبیعت سے مطابقت نہیں رکھتے' اُن میں عورت کے کام کرنے کے بارے میں اسلام کی رائے کیا ہے؟

○ عورت' مرد کی مانند ہر حلال پیشہ اختیار کر سکتی ہے۔ شرعی لحاظ سے دونوں کا مسئلہ یکساں ہے۔ لیکن اس بارے میں کچھ تفصیلات پائی جاتی ہیں' جن کا تعلق شادی شدہ خواتین سے ہے۔ کیونکہ شادی شدہ عورت پر ازدواجی زندگی اور اپنے مادرانہ فرائض کی بنا پر کچھ پابندیاں عائد ہوتی ہیں۔ بسا اوقات یہ پابندیاں تقاضا کرتی ہیں کہ عورت اپنے شوہر کی رضامندی کے بغیر کوئی پیشہ اختیار نہ کرے۔

فکری نقطۂ نظر سے جس طرح اسلام نے مرد کو کسی بھی (حلال) کام سے نہیں روکا' اسی طرح اس نے عورت کو بھی کسی (مناسب) پیشے سے منع نہیں کیا اور جہاں اسلام عورت پر کام کرنے کے سلسلے میں کچھ اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے' وہیں مردوں پر بھی پابندیاں لگاتا ہے' اور جیسی اخلاقی فضا میں مردوں کو کام کرنے کی اجازت دیتا ہے' ایسی ہی فضا میں عورتوں کے کام کرنے کو بھی روا سمجھتا ہے۔

والدین کی جانب سے بچوں کے طرزِ عمل کی نگرانی

☆ لڑکے اور لڑکیاں' والدین کی طرف سے اپنے افعال و اعمال کی نگرانی کو اپنی ذاتی زندگی میں مداخلت سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ نگرانی کا طریقہ قدیم اور دقیانوسی طریقہ ہے' جو اس بات کا سبب بنتا ہے کہ جس انسان کی نگرانی کی جارہی ہوتی ہے' وہ خود کو گھٹن اور دباؤ کے ماحول میں محسوس کرتا ہے اور اپنے آپ کو چبھتی ہوئی اور متجسس نگاہوں کے حصار میں محصور پاتا ہے۔

اپنے جوانوں، طالب علموں اور اولاد کے معاملات سے واقفیت کے لیے ان کی نگرانی ایک ضروری امر ہے۔ لہٰذا اس نگرانی کے لیے مناسب طریقے اختیار کرنے چاہئیں، تا کہ جوان لڑکوں اور لڑکیوں میں اس سلسلے میں ایسی حساسیت جنم نہ لے جو ان میں نفسیاتی پیچیدگیوں کا سبب بن جائے۔ سوائے یہ کہ بعض حالات میں ہم خود یہ چاہتے ہوں کہ ان پر نگرانی کا دباؤ بڑھایا جائے اور ان کی طرف سے اس انداز میں چوکنا رہا جائے کہ انہیں محسوس ہو کہ وہ ہماری تیز نگاہوں کے حصار میں ہیں، تا کہ وہ گمراہی کے راستے پر قدم نہ رکھیں اور ہماری نگاہوں سے زیادہ دور نہ جاسکیں۔ کیونکہ اگر ایسا نہ کیا جائے، تو یہ چیز ان کی زندگی پر ناخوش آئند اثرات مرتب کرتی ہے۔

لیکن اگر نگرانی سے ہمارا مقصد ان کے حالات جاننا اور ان کی کمزوریوں کا علم حاصل کرنا ہو، تا کہ انہیں ان سے آگاہ کر کے ان کی اصلاح کی جائے، تو اس طرح کی نگرانی کو ایسی معقول اور متوازن صورت میں ہونا چاہیے کہ بچوں کو نفسیاتی اذیت نہ پہنچائے اور انہیں وحشت زدہ اور مضطرب نہ کرے۔ شاید نگرانی کے دوران اس پہلو کا خیال نہ رکھنے ہی کی وجہ سے ہمیں کچھ ایسے بچے نظر آتے ہیں جو اپنے والدین یا اساتذہ کو بغض و عداوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اور یہ چیز انہیں اپنے والدین اور اساتذہ کی مشفقانہ نصیحتوں سے استفادے سے محروم کر دیتی ہے۔

ہمیں اپنے بچوں اور طالب علموں کی تربیت اس طرح کرنی چاہیے کہ وہ ہمیں اپنا دوست سمجھیں اور اس مقصد کے لیے ایسے دانشمندانہ طریقے اپنانے چاہئیں جو ان کی شخصیت کو کچل کر نہ رکھ دیں۔

بچوں سے عادلانہ سلوک

☆ اسلام والدین سے اپنے بچوں کے ساتھ عادلانہ سلوک کا تقاضا کرتا ہے یا

مساویانہ سلوک کا؟

○ اسلام میں عدل کو بنیادی مقام حاصل ہے اور مساوات (برابری) عدل کے مظاہر میں سے ایک مظہر ہے۔ کبھی کبھی جذباتی مسائل میں بھی عدل کا اظہار ہوتا ہے اور ہمیں جذبات میں بھی اعتدال برتنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اس مضمون کو ہم رسولِ کریمؐ کے ایک قول میں پاتے ہیں۔ منقول ہے کہ آنحضرتؐ نے ایک باپ کو دیکھا جو اپنے دو بچوں میں سے صرف ایک کا بوسہ لے رہا تھا۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ اس دوسرے بچے کا بھی بوسہ لو تاکہ اسکے دل میں تمہارے یا اپنے بھائی کے بارے میں عداوت پیدا نہ ہو۔

لہٰذا عدالت کا مسئلہ ان بنیادی مسائل میں سے ہے جنہیں والدین کو اپنے بچوں کے ساتھ طرزِ عمل میں ملحوظ رکھنا چاہیے۔ البتہ بسا اوقات عدل کے راستے پر چلتے ہوئے مساوات سے چشم پوشی کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب ایک بچہ دینی، علمی، اخلاقی یا والدین کی فرمانبرداری و اطاعت شعاری کے اعتبار سے دوسرے بچوں سے ممتاز ہوتا ہے۔ اس موقع پر ہمیں دوسرے بچوں کو یہ شوق و رغبت دلانے کی خاطر کہ وہ بھی اپنے آپ کو اسکی مانند بنائیں، اس بچے کو دوسرے بچوں پر ترجیح دینی چاہیے۔

اس عمل کے ذریعے ہم ان کے درمیان مقابلے اور مسابقت کی فضا ایجاد کر سکتے ہیں۔ لیکن اس معاملے میں حکمت اور دانشمندی کی ضرورت ہے، تاکہ کسی بچے کے ذہن میں یہ خیال جنم نہ لے کہ میرے والد مجھ سے زیادہ میرے بھائی سے محبت کرتے ہیں۔

معصومؑ کا عمل اس عمل کے جواز کی علامت ہے، وجوب کی نہیں

☆ پیغمبرؐ اور ائمۂ معصومینؑ کی جس تأسی کا تقاضا کیا گیا ہے، کیا اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم ان کے کردار و اعمال کی ہو بہو نقل کریں۔ یا اس میں زمان و مکان، زمانے کی ترقی، اسکی تبدیلیوں اور اسکی ضروریات کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیے؟

○ جب ہم پیغمبر اکرمؐ اور ائمہ معصومینؑ کی تأسی کرنا چاہیں، تو ضروری ہے کہ ان کے عمل کے زمانی اور مکانی حالات کا بھی مطالعہ کریں۔ ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ انہوں نے جو عمل انجام دیا کیا اسکی بنیاد کوئی مطلق اصول ہے، جس کا کسی خاص زمان و مکان سے تعلق نہیں، یا کچھ خاص زمانی و مکانی حالات نے انہیں اس عمل کی انجام دہی پر آمادہ کیا ہے۔ لہٰذا جب اس سے مختلف حالات ہوں گے تو شاید اس عمل کی تأسی کا مسئلہ باقی نہیں رہے گا۔ بالکل اسی طرح جس طرح "عنوانِ اولیٰ" سے پیدا ہونے والے شرعی حکم کا معاملہ ہوتا ہے کہ جب عنوانِ ثانوی پیش آتا ہے، تو اسکی مصلحت کی وجہ سے یہ حکم بھی تبدیل ہو جاتا ہے۔

لہٰذا پیغمبر اسلامؐ یا امامؑ نے جو بھی عمل انجام دیا ہو، وہ اس عمل کے واجب ہونے پر دلالت نہیں کرتا، بلکہ یہ اس عمل کے صرف شرعی جواز کی دلیل ہے۔ کیونکہ ایک عمل کبھی واجب ہوتا ہے اور کبھی مستحب۔

لہٰذا اگر ہم کہیں پڑھیں کہ پیغمبر اسلامؐ نے فلاں عمل انجام دیا، آپ نے فلاں طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا، تو ہم پر لازم ہے کہ اس بات کا بھی جائزہ لیں کہ یہ عمل کن خاص حالات کے زیرِ اثر انجام دیا گیا تھا؟ اور یہ کہ کیا اسکی انجام دہی میں بنیادی طور پر زمانی و مکانی حالات کا دخل تھا، یا خود اس عمل میں موجود ذاتی عناصر اسکی انجام دہی کی وجہ بنے؟

تأسی کے معنی پیروی ہے، ہو بہو نقل نہیں

لہٰذا تأسی کوئی مطلق مفہوم نہیں رکھتی۔ بلکہ ضروری ہے کہ آنحضرتؐ سے صادر ہونے والے ہر عمل کا (علیحدہ علیحدہ) جائزہ لیا جائے۔

وضاحت کی غرض سے عرض ہے کہ بعض مواقع پر پیغمبرؐ دعوت و تبلیغ کے لیے خاص اسلوب اپناتے تھے اور کبھی اس سے مختلف اسلوب کی ضرورت ہوتی تھی۔ یعنی پیغمبر اکرمؐ دعوت کی ضرورت کی مناسبت اور زمانی اور مکانی حالات کے پیشِ نظر ایک خاص اسلوب

اختیار کرتے تھے اور کبھی کبھی کچھ دوسرے حالات اور متفاوت ضروریات پیش آتی تھیں جن کی بنا پر آنحضور کسی اور اسلوب سے استفادہ کرتے تھے۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ صدرِ اسلام میں اسلامی دعوت کے کام کے لیے کسی منظم تحریک کی ضرورت نہ تھی، لیکن بعد میں پیش آنے والے حالات نے اس ضرورت کا تقاضا کیا۔ کیونکہ اغیار کی صف آرائی کے نتیجے میں پیدا ہونے والے بڑے بڑے چیلنجوں نے ہمیں اسلامی اصولوں کی بنیاد پر ایسی تحریک منظّم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔

اس گفتگو کا مطلب یہ نہیں کہ گزشتہ تاریخ میں جس چیز کا ذکر نہ ملے وہ بدعت کے عنوان سے حرام ہے، یا اسکے برخلاف جس چیز کو بھی گزشتہ تاریخ میں پائیں اسے بغیر کسی قیدو شرط کے مطلقاً قبول کر لیا جائے۔ بلکہ ہم پر لازم ہے کہ جدید مسائل کا اسلام کے فکری و عملی خطوط سے ہم آہنگی یا ناہم آہنگی کے لحاظ سے مطالعہ کریں۔ نیز اس بات کی بھی تحقیق کریں کہ جو کچھ گزشتہ زمانے میں تھا وہ زمانی و مکانی حالات یا دوسری شرائط کے تابع تھا، یا ایک ایسا قانون تھا جس کا زمان و مکان کی تبدیلی سے کوئی تعلق نہیں اور ہر زمان و مکان میں یکساں طور پر لاگو ہوگا۔

مغربی تمدن سے مرعوب ہو جانا

☆ مغربی تمدن کی ترقی اور صنعت و ٹیکنالوجی کے میدانوں میں ان کی پیشرفت کی وجہ سے پیدا ہونے والی مرعوبیت نے ہماری معاشرتی زندگی پر بہت سے اثرات مرتب کیے ہیں، جن میں کسی شک و تردید کی گنجائش نہیں۔ جنابِ عالی کی نگاہ میں یہ مثبت و منفی آثار کون کون سے ہیں؟

O مغرب کی مادّی ترقی اپنی مختلف شکلوں، رنگوں اور نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی چمک دمک سے دوسروں کو مرعوب کر دیتی ہے، بالخصوص ایسے ضعیف النفس افراد کو جو خود کو ضعیف د

ناتواں سمجھتے ہیں، جنہیں اپنی قدرت و طاقت کا ادراک ہی نہیں، بلکہ ہمیشہ اپنے کمزور نکات ان کے پیشِ نظر ہوتے ہیں۔ یہ مرعوبیت اور ضعف کا احساس انہیں طاقتوروں اور مستکبروں کے سامنے عاجزی اور سرنگونی پر آمادہ کردیتا ہے۔

لہٰذا یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم قرآنی اسلوب و روش سے استفادہ کریں، جو ہم سے کہتا ہے کہ طاقتوروں کی کمزوریوں اور مستکبروں کی شخصیت میں موجود منفی عناصر کی جانب اپنی توجہ مبذول کریں۔ اس اسلوب کے مطابق ہمیں چاہیے کہ مغربی تمدن میں موجود تمام کمزوریوں اور اس تہذیب کے تمام انحراف آمیز نکات کو نظر میں رکھتے ہوئے ان کا موازنہ اسلامی تمدن کے قوی عناصر اور اسلامی تہذیب کے مثبت نکات سے کریں، تاکہ نسلِ جواں اور تمام دوسرے انسانوں کو مرعوبیت سے نجات دلاسکیں۔ بالخصوص ایسے حال میں جبکہ مغربی تمدن نے کمزور اقوام اور اسلامی معاشروں پر جارحانہ یلغار کی ہوئی ہے۔

مغربی تمدن سے مرعوبیت اور اسکے مقابل عاجزی اور سرنگونی کی حالت کے خاتمے کے لیے ہم سیاسی مسائل سے بھی استفادہ کرسکتے ہیں اور مغرب کے وحشیانہ اور غیر انسانی طرزِ عمل کی جانب متوجہ کرا کے مغربی تمدن کے دوسرے رُخ سے پردہ اٹھا کر اس مرعوبیت سے انسانوں کو نجات دلا سکتے ہیں جو ان کے خوشنما بہروپ کو دیکھ کر جنم لیتی ہے۔

شاید مذکورہ معنی کو ہم امیر المومنینؑ کے اس کلام سے اخذ کرسکیں جس میں آپ نے دنیا کے بارے میں فرمایا ہے: **ومن ابصربها بصرته ، و من ابصر الیها اعمته.** (جو کوئی اسے نگاہِ بصیرت سے دیکھے اسے بینا بنادیتی ہے اور جو اسے منظورِ نظر بنالے اسے اندھا کردیتی ہے۔ نہج البلاغہ۔ خطبہ۔ ۸۰)

لہٰذا ایسا شخص جو دنیا کی ظاہری شکل و صورت پر نظر رکھتا ہے، دنیا اُسے اندھا کردیتی

ہے اور جو کوئی اُسے عبرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور دنیا کے ظواہر کو عبور کر کے اسکے باطن اور اسکی حقیقت تک پہنچ جاتا ہے' اسکے سامنے دنیا کی خرابیاں آشکارا ہو جاتی ہیں۔

اس اسلوب کو اپنا کر ہم مغربی تمدن کی حقیقت اور اسکے منفی نکات کو سمجھ سکتے ہیں۔

تقلید اور نقالی

☆ دوسروں کی تقلید اور نقالی جوانوں کی زندگی پر بہت زیادہ اثر انداز ہونے والی چیز ہے۔ بہت سے جوان بڑے لوگوں' کھلاڑیوں' فلمی ستاروں اور مشاہیر کی تقلید کرتے ہیں۔ آپ تقلید کے اس عمل کو کس حد تک مثبت یا منفی سمجھتے ہیں؟

○ کبھی کبھی تقلید ایک منفی بات ہو جاتی ہے۔ کیونکہ ایسے مواقع پر تقلید کسی فکری بنیاد پر استوار نہیں ہوتی جو اس عمل یا مؤقف پر انسان کے یقین کا سبب بنتی ہے جس کی وہ تقلید کر رہا ہے۔ یہ چیز انسان کو دوسروں کی نقالی کرنے والا بنا دیتی ہے اور وہ اپنی ذات اور اپنی فکر کا مالک نہیں رہتا۔ یہ بات انسان کی فکری' ذہنی اور علمی نشوونما اور اسکے مستقبل پر اثر انداز ہوتی ہے۔ کیونکہ ایسا شخص اپنے افکار و عقائد (جو اسے فکری اور عملی بنیاد عطا کرتے ہیں) سے غذا لینے کی بجائے دوسروں پر نظریں گاڑے رہتا ہے' یہاں تک کہ خود اپنی حیثیت سے بیگانہ ہو جاتا ہے۔

اپنے آباؤاجداد کی تقلید کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے اسلام اسی بات کی جانب متوجہ کرتا ہے' کیونکہ اخلاف کا اپنے اسلاف سے جذباتی تعلق ان سے اعتمادِ نفس اور فکری استقلال سلب کر لیتا ہے اور وہ اپنے آباؤ اجداد سے ملنے والی فکری' شعوری اور جذباتی روایات کے سوا کوئی بھی دوسری بات قبول کرنے سے کتراتے ہیں۔

اس صورتحال کے نتیجے میں ان کا فہم و شعور' ان کے آباؤاجداد کی سوجھ بوجھ تک ہی ٹھہر کر رہ جاتا ہے اور آنے والی نسلیں محض ان کی فکر کی تعظیم و تقدیس کیا کرتی ہیں اور خود

اپنے آپ کواور دوسروں کواس بات کی اجازت نہیں دیتیں کہ وہ ان کے اسلاف کے افکار و آراء کوشک وشبہ کی نگاہ سے دیکھیں اوران کے بارے میں کسی قسم کے تردد کو بھی روا سمجھیں، چہ جائیکہ انہیں مسترد کردیں۔

فنکاروں کی تقلید

آج ہم نسلِ نو میں ایک اور قسم کی تقلید کا مشاہدہ بھی کررہے ہیں، یہ تقلید مرد وزن فنکاروں، گلوکاروں، گلوکاراؤں اور ایسے افراد کی تقلید ہے جو اس نسل کے احساسات اور جذبات کو اپنی طرف جذب کرنے کی صلاحیت کے مالک ہیں۔ حد یہ ہے کہ آج کے جوان محض ان کی تقلید اور نقالی کی خاطر اپنی معاشرتی اور اخلاقی اقدار وروایات سے سرکشی کرتے ہیں۔ انہیں اس بات کی یکسر پروا نہیں کہ یہ تقلید ان کی زندگی پر کیا مثبت یا منفی اثرات ڈالے گی۔ ان کی نگاہ میں مناسب وموافق اور متضاد ومخالف اقدار وروایات کے درمیان کوئی فرق نہیں، بلکہ ان کی نظر میں اہم چیز اپنے محبوب فنکار (Star) کے انداز و اطوار ہیں۔

لہٰذا ہم دیکھتے ہیں کہ وہ لوگ جو نسلِ نو کو گمراہی کے راستوں پر ڈالنے کے لیے نت نئے پروگرام بنانے کے کام پر مامور ہیں، وہ اس طریقے سے جوانوں کی ایک کثیر تعداد کو اپنی مطلوبہ راہوں کی جانب مائل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جوان اپنی ان فکری بنیادوں سے محروم ہو جاتے ہیں جو انہیں ان کی تہذیب وتمدن کی جڑوں سے مربوط کرتی اور ان کے سامنے جدید آفاق کے دروازے کھولتی ہیں۔

اسوۂ حسنہ

بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ تقلید مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔ اور یہ اس وقت ہوتا ہے جب لائق و شائستہ افراد اور اخلاقی، روحانی، سیاسی اور جہادی میدانوں کی نمایاں

شخصیات کی تقلید کی جائے۔ اس صورت میں مقلدین کا اپنی ماڈل ہستی سے ارتباط (اُن کی تعظیم و تقدیس کے سبب) انہیں اس بات پر آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس شخصیت کے مسلک اور راستے پر قدم رکھیں، اور جن کمالات کو اس نے کسب کیا ہے انہیں یہ بھی حاصل کریں، اور جن اقدار کی وہ پابند ہے، یہ بھی انہیں اپنائیں۔ دوسرے مرحلے میں ان کے اندر ان اقدار کی بنیاد بننے والی فکر کی تقویت انہیں ان افکار کا دفاع کرنے پر ابھارتی ہے۔

یہ وہی چیز ہے جس کا ذکر اسوۂ حسنہ اور نمونۂ عمل کے عنوان سے آیا ہے اور کلامِ الٰہی ہے: لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُوْلِ اللهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ. (تمہارے لیے رسول کی زندگی میں بہترین نمونۂ عمل ہے۔ سورۂ احزاب ۳۳ آیت ۔ ۲۱)

کیونکہ انسان پسندیدہ کردار کا مجذوب ہو جاتا ہے، اسے نمونۂ عمل قرار دیتا ہے اور اسکے بعد اس کردار کو اپنی شخصیت میں رچا بسا لیتا ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے:

فتشبهوا ان لم تكونوا مثلهم
ان التشبه بالكرام فلاح

"تم ان کی مانند نہ بھی ہو تب بھی ان کی سی شباہت اختیار کرو۔ کیونکہ بزرگوں کی مشابہت کامیابی کا موجب ہے۔"

امام علیؑ کی ایک حدیث میں بھی پڑھتے ہیں:

"ان لم تكن حليما فتحلم. فانه قل من تشبه بقوم الا اوشك ان يكون منهم."

"اگر تم بردبار نہ بھی ہو، تب بھی بردباری کا مظاہرہ کرو، کیونکہ بہت کم ایسا ہوتا ہے کہ کوئی کسی قوم کی شباہت اختیار کرے اور اس جیسا نہ ہو جائے۔"
(نہج البلاغہ۔ کلماتِ قصار ۲۰۷)

مثبت تقلید حتیٰ اگر کسی محکم فکری بنیاد پر استوار نہ بھی ہو، تب بھی آہستہ آہستہ انسا

شخصیت میں ایک طبیعی حالت میں تبدیل ہو جاتی ہے' جیسے کہ کہا جا تا ہے: الطبع قد یغلب التطبع فی بعض الاحیان. (کبھی کبھی اکتسابی عادات واطوار افراد کی طبیعت پر غالب آجاتے ہیں)

البتہ یہاں اہم مسئلہ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس بات کا عادی بنائے کہ دوسروں کی جو منفی یا مثبت باتیں وہ اپنائے ان کا سرچشمہ اسکی فکر اور شعور ہو' ایسا نہ ہو کہ وہ محض دوسروں کی نقالی میں ان کی باتیں اختیار کرے۔

مختصر یہ کہ نمونۂ عمل اور مثالی ہستی اور ماڈل کے مثبت ہونے کی صورت میں تقلید و پیروی و تأسی لوگوں کو ایسے مطلوبہ اور پسندیدہ فضائل سے مربوط کرنے کا ایک قابلِ اعتماد اسلوب ہے جن سے وہ اس سے قبل کوئی ارتباط نہ رکھتے ہوں' اور قابلِ تقلید نمونہ پیش کرنے کے ذریعے ان کا ان اقدار سے ارتباط قائم کیا جا سکتا ہے۔ ان نمونوں اور ماڈلز کے ذریعے لوگوں کو منفی اقدار اور روایات' عادات واطوار سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے اور اسکے بعد اعلیٰ انسانی اقدار کو فکری اور روحانی پہلوؤں سے ان کی شخصیت میں مستحکم کیا جا سکتا ہے۔

تاثیر قبول کرنے اور فریفتہ ہو جانے کی بنیادیں

لیکن اگر منفی مسائل میں تقلید کی جا رہی ہو' تو ہمیں چاہیے کہ جوانوں کو اس تقلید کے منفی آثار اور ناخوش آئند نتائج کی جانب متوجہ کر کے انہیں اس سے نجات دلائیں۔ اور اگر وہ کسی اسوۂ حسنہ کے مقلد ہوں' تو ہمیں چاہیے کہ پہلے مرحلے میں اس تقلید پر ان کی حوصلہ افزائی کریں اور دوسرے مرحلے میں جب اس تقلید کے نتیجے میں وہ مثبت نکات ان کی شخصیت میں بسنے کی جگہ پالیں' تو انہیں گہرائی دینے کی کوشش کریں اور ان سے ان کے محاسن اور منافع کے بارے میں گفتگو کریں اور انہیں یہ بتائیں کہ انہیں اپنانے والے لوگ ہی تعریف و تحسین کے لائق ہیں اور جن لوگوں نے ان خوبیوں کو نہیں اپنایا وہ ملامت و

مذمت کے مستحق ہیں۔

تربیت کے لیے بکثرت تجربات کے نچوڑ کی ضرورت ہے' تاکہ جوان کو پسندیدہ اور زندہ نمونوں سے مربوط کیا جائے اور اسکے بعد اعلیٰ اقدار و فضائل کو اُسکے باطن کی گہرائیوں میں بٹھا دیا جائے۔ تاکہ اس میں عقائد' افکار اور اعلیٰ اقدار و فضائل کی حامل ایک شخصیت وجود میں آجائے۔

جب یہ اقدار و فضائل اسکی روح میں گھر کر لیں' تو اسے سمجھائیں کہ فلاں مثالی شخصیت میں موجود پسندیدہ صفات اور فضائل و کمالات اسکی فضیلت اور اسے حاصل مقام و منزلت کا سبب ہیں' نہ کہ پسندیدہ صفات اور فضائل و کمالات اس بنا پر قدر و قیمت کے حامل ہیں کہ یہ صاحبِ فضیلت شخصیت اُن کی حامل ہے۔ اور اس طرح شخصیات کی عظمت اور اُن کے مقام کی بلندی کو اُن کے اعلیٰ اقدار و فضائل سے آراستہ ہونے سے وابستہ کریں' نہ کہ اعلیٰ اقدار اور فضیلتوں کی اہمیت اور قدر و قیمت کو ان کے حامل اشخاص کی عظمت اور مقام سے وابستہ قرار دیں۔

لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ نوجوانوں میں پسندیدہ اور زندہ نمونہ ہائے عمل کی تقلید و تاسی کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ یہ تربیت کے مختلف طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے جس کے ذریعے کثیر وقت اور محنت کو بچایا جاسکتا ہے۔ البتہ اس اسلوب اور طریقے سے استفادے کے دوران نہایت توجہ اور احتیاط لازم ہے' تاکہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ یہ تمام اہتمام مطلق تقلید کی حوصلہ افزائی اور اسکی جانب ترغیب کے لیے ہے۔ اور یہ بات واضح رہے کہ تقلید سے مراد ہر قسم کی تقلید نہیں' بلکہ صرف معین اور مثبت تقلید پیش نظر ہے' اور وہ بھی ایسے لوگوں کے لیے جو تقلید کے راستے پر قدم رکھے بغیر ابتدا ہی سے مسئلے کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔

تقلید کے خلاف فکری یلغار

☆ آج کے معاشرے میں ہم مشاہدہ کر رہے ہیں کہ جوانوں کو تقلید کی ترغیب دینا چنداں طبیعی اور کامیاب طریقہ نہیں رہا ہے' کیونکہ دشمن (فلموں' کلب اور کھیل کود کے مقابلوں جیسے) بکثرت وسائل وامکانات کا مالک ہے اور ان کے ذریعے اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کوشاں ہے۔ ان پُرکشش وسائل وذرائع کے مقابل کیا ہمارے پاس ایسے متبادل موجود ہیں جن سے اسلامی تحریک کے اراکین اور مصلحین استفادہ کر کے درست اور صحیح تقلید کی طرف جوانوں کی رہنمائی کر سکیں؟

O ہماری ذمے داری ہے کہ تقلید کی اساس اور اسکے مختلف اسالیب اور طریقوں کے خلاف فکری یلغار کریں۔ اس عمل میں نسلِ جواں کو اندھی تقلید کے منفی اثرات ونتائج کی جانب متوجہ کرنا بھی شامل ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ ایسے مناسب حالات بھی پیدا کریں جو نوجوانوں کو مثبت اور زندگی ساز مسائل کے بارے میں اہتمام کی جانب مائل کریں اور اگر تقلید ان کے لیے ناگزیر ہو جائے' تو پسندیدہ اور شائستہ ماڈلز کی تقلید وتاسی کی جانب ان کی رہنمائی کریں۔

تربیت کے بہت سے طریقوں اور ذرائع کا نقص یہ ہے کہ وہ ناپسندیدہ چیزوں کی رد اور مذمت پر اکتفا کرتے ہیں اور ان کے لیے کوئی متبادل وضع نہیں کرتے۔ لہٰذا اگر ہم جدید فیشن کے کسی حیا سوز لباس کے استعمال سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو باز رکھنا چاہتے ہیں' تو ہمیں جدید فیشن کے لباس پہننے کی مذمت نہیں کرنی چاہیے' بلکہ کوشش کرنی چاہیے کہ اس نامناسب لباس کی جگہ ایسے لباس کے استعمال کی ترغیب دیں جو اسلامی اقدار اور اخلاقی اصولوں سے ہم آہنگ ہونے کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کے جدید فیشن کی جانب رجحان کے جذبے کی تسکین بھی کرے۔

اور اگر غیر اخلاقی فلموں سے نوجوانوں کو دور کرنا چاہتے ہیں، تو فلم سازی کے دروازے بند کرنے کی بجائے ہماری ذمے داری ہے کہ اخلاقی، سماجی اور سیاسی موضوعات پر فلمیں تیار کریں، جو فنی لحاظ سے اس پائے کی ہوں کہ جوانوں کو اپنی طرف مائل کر سکیں۔ ان فلموں کو فنی اعتبار سے دوسری فلموں سے پیچھے نہیں ہونا چاہیے۔ ان اقدامات کے دوران یہ بات ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ہمارے جوان اس پہلو میں خلا سے دوچار نہ ہوں۔

☆ کیا مغرب کی تقلید کسی بھی حالت میں درست اور مناسب نہیں؟

O طبیعی بات ہے کہ دوسروں کے علمی، عملی، اور فکری تجربات کا مطالعہ کرتے وقت ہمیں انہیں اسلامی اصولوں کے پیمانے پر جانچنا چاہیے۔ اب اگر مغرب میں کوئی ایسی چیز نظر آتی ہے جو اسلامی اصولوں سے ہم آہنگ ہو، (جن کا مقصد انسان کو زیادہ سے زیادہ ترقی اور تکامل کی ترغیب دینا ہے) تو اس چیز سے استفادہ بجا ہے۔ اس اعتبار سے کہ یہ چیز ایک ایسی مثبت روایت ہے جس پر ہمارے اسلاف کاربند تھے۔ اگرچہ آج ہمارا معاشرہ اس سے بے بہرہ ہے اور ہمارے معاشرے میں اسکے ظہور کے حالات ابھی ناپید ہیں۔

اسکے برخلاف اگر ہمیں مغرب کی کوئی چیز اسلام کی بنیادی اقدار اور تعلیمات سے متصادم نظر آئے۔ جیسے وہاں کی بے لگام آزادی اور اسی کی مانند دوسری چیزیں، تو ہمیں اسلامی اقدار و روایات اور مغربی اقدار و روایات کی سرحدوں کو جدا جدا کر کے ان کی حدِ فاصل کو معین کرنا چاہیے۔

اس گفتگو سے واضح ہے کہ ہم مغرب کو کلی طور پر اور یکسر مسترد نہیں کرتے اور خواہ مخواہ پوری دنیا کے مخالف نہیں ہیں۔

ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جنہیں ہم سیکھ سکتے ہیں اور ہمارے پاس بھی ایسی بکثرت چیزیں موجود ہیں جنہیں دنیا کو ہم سے سیکھنا چاہیے۔ بیرونی دنیا سے ہمارا ربط و تعلق ہمارے لیے فائدہ مند ہے اسی طرح غیروں کا ہم سے ربط و ضبط قائم کرنا ان

کے مفاد اور مصلحت میں ہے۔ ہم اسلام کی راہ پر کاربند ہیں، جو ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ جس کسی کے پاس پسندیدہ اور اچھی چیز پاؤ، اسے سیکھ لو: اطلبوا العلم ولو فی الصین. (علم حاصل کرو چاہے وہ چین میں ہو) اسی طرح حدیث ہے: الحکمة ضالة المومن. (حکمت مومن کی گمشدہ متاع ہے)

البتہ یہ بات ملحوظ رہے کہ جس چیز کو ہم سیکھنا چاہتے ہیں اس کا انتخاب چھان پھٹک کے بعد کریں، یعنی وہ ایسی چیز نہ ہو جو ہمیں اپنے ایمان اور عقیدے سے دور کردے۔

☆☆☆☆☆

ضمیمۂ احادیث (۳)

تعلیم وتربیت کے بارے میں

☆ قال رسول الله(صلی الله علیه وآله): "النظر فی وجه العالم حباله عبادة."
رسول اللہؐ نے فرمایا: "عالم کو محبت بھری نظر سے دیکھنا عبادت ہے۔"

☆ وقال(ص): "مجالسة اهل الدین شرف الدنیا والآخرة."
آپؐ ہی نے فرمایا: "اہلِ دین کے ساتھ نشست و برخاست، دنیا اور آخرت کے شرف و منزلت کا باعث ہے۔"

☆ "عن ابی عبدالله (ع) قال. قال رسول الله(ص): "یجیء الرجل یوم القیامة، وله من الحسنات کالحساب الرکام اوکالجبال الرواسی، فیقول: یا رب انی لی هذا ولم اعملها؟ فیقول: هذا علمک الذی علمته الناس، یعمل به من بعدک."

ابا عبداللہؑ نے فرمایا: "روزِ قیامت ایک انسان گہرے بادلوں اور جمے ہوئے پہاڑوں کی

مانند اپنے نیک اعمال کے ساتھ ظاہر ہوگا اور کہے گا: پروردگار یہ اتنے اعمال تو میں نے انجام نہیں دیئے ہیں یہ کس طرح میرے ہوئے؟ جواب آئے گا: یہ وہ علم و دانش ہے جو تم نے لوگوں کو سکھایا تھا اور لوگوں نے تمہارے بعد اس پر عمل کیا تھا۔"

☆ "عن ابی جعفر (علیه السلام) قال: " من علم باب هدی فله مثل اجر من عمل به 'ولاینقص اولئک من اجورهم شیئا' ومن علم باب ضلال کان علیه مثل اوزار من عمل به ولا ینقص من اوزارهم شیئا۔"

ابی جعفر نے فرمایا: "جو کوئی کسی دوسرے کے سامنے ہدایت کا ایک دروازہ کھولے گا' اسے اس علم پر عمل کرنے والے شخص کے برابر اجر ملے گا' اور اس عمل کرنے والے کے ثواب میں ذرّہ برابر کمی نہ کی جائے گی۔ اور جو کوئی کسی کو گمراہی کا راستہ دکھائے گا' تو اس کا گناہ اس شخص کے گناہ کی مانند ہوگا جو گمراہی پر گامزن ہوا ہوگا اور اسکے گناہ میں سے بھی کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔"

☆ "یقول الامام زین العابدین (علیه السلام): "فی حقوق الاسا تذه المربین: وحق سایسک بالعلم: التعظیم له' والتوقیر لمجلسه' وحسن الا ستماع الیه' والاقبال علیه' وان لا ترفع علیه صوتک' ولا تجیب احدا یساله عن شیء' حتی یکون هو الذی یجیب' ولا تحدث فی مجلسه احدا' ولا تغتاب عنده احدا' وان تدفع عنه اذا ذکر بسوء' وان تستر عیوبه' وتظهر مناقبه' ولا تجالس له عدوا' ولا تعادله ولیا فاذا فعلت ذلک' شهدلک ملائکة الله بانک قصدته' وتعلمت علمه لله جل اسمه' لاللناس "

امام زین العابدینؑ نے اساتذہ اور مربی حضرات کے حقوق کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے فرمایا: "متعلم اور شاگرد کے ذمے معلم اور مربی کا حق یہ ہے کہ: اسکی تعظیم کرے، مجلس میں اس کا احترام کرے' اسکی گفتگو کان لگا کر سنے' اس کی موجودگی میں اسکی جانب متوجہ رہے'

اپنی آواز اسکی آواز سے بلند نہ کرے، جب کوئی اس سے سوال کرے، تو خاموش رہے، تاکہ وہ خود جواب دے، اسکی موجودگی میں کسی دوسرے سے بات چیت نہ کرے، کسی سے اسکی غیبت نہ کرے، اگر کسی جگہ اسکی برائی کی جا رہی ہو، تو اس کا دفاع کرے، اسکے نقائص کی پردہ پوشی کرے، اسکی اچھائیوں کو نمایاں کرے، اسکے دشمن سے میل جول نہ رکھے، اسکے دوستوں سے دشمنی نہ کرے۔ اگر کسی نے ایسا کیا، تو اسکے بارے میں فرشتے گواہی دیں گے کہ اس شخص نے محض خوشنودیٔ خدا کے لیے علم حاصل کیا تھا۔"

☆ وعن حقوق الطلبة و المتعلمين، يقول (ع): "و اما حق رعيتک بالعلم، فان تعلم ان الله عزوجل انما جعلک قيما لهم فيما اتاک من العلم، وفتح لک من خزائنه، فان احسنت في تعليم الناس ولم تخرق بهم، ولم تضجر منهم، زادک الله من فضله، وان انت منعت الناس علمک اوخرقت بهم عند طلبهم العلم منک، كان حقا على الله عزوجل ان يسلبک العلم وبهاءه، ويسقط من القلوب محلک."

آپؑ ہی نے طلبا اور دانش آموزوں کے حقوق کے بارے میں فرمایا: "تمہارے شاگرد کا تمہارے ذمے پر یہ حق ہے کہ تمہارے علم میں ہونا چاہیے کہ خداوندِ عالم نے جس علم سے تمہیں نوازا ہے اور اپنے جن خزانوں کے دروازے تم پر کھولے ہیں، اُن میں تمہیں ان کا سرپرست بنایا ہے۔ تو اگر تم نے ان لوگوں کو اچھی طرح تعلیم دی، نرمی سے کام لیا اور ان سے سختی سے پیش نہ آئے، تو خدا اپنے فضل سے تمہارے علم میں اضافہ فرمائے گا۔ اور اگر تم نے لوگوں کو اپنے علم سے فیضیاب کرنے میں کوتاہی کی اور تعلیم دینے کے دوران ان سے سختی سے پیش آئے، تو خداوندِ عالم کو حق ہے کہ تم سے تمہارا علم اور اس کی قدر و قیمت سلب کر لے اور لوگوں کے دلوں سے تمہاری قدر و منزلت ختم کر دے۔"

سعادت و نیک بختی کے بارے میں

☆ قال رسول اللہ(ص): "السعید من اختار باقیۃ یدوم نعیمھا" علی فانیۃ لاینفد عذابھا."

رسول اللہ نے فرمایا: "وہ شخص نیک بخت افراد میں سے ہے جو بے پایاں نعمتوں کے حامل سرائے باقی (آخرت) کو اس دارِ فانی (دنیا) پر ترجیح دے جس کا عذاب باقی رہنے والا ہے۔"

☆ وقال(ص): "اربع من سعادۃ المرء: الخلطاء الصالحون" و الولد البار" والمراۃ المواتیۃ" وان تکون معیشتہ فی بلدہ."

آپ ہی نے فرمایا: "انسان کی خوش بختی میں سے ہے کہ اس کا میل جول صالح لوگوں سے ہو نیک کردار اولاد اور ہم دل وہم ساز بیوی ہو اور اس کا پیشہ اور ذریعہ معاش اسکے اپنے شہر میں ہو۔"

☆ وقال الامام علی(ع): "السعادۃ ما افضت الی الفوز."

امام علی نے فرمایا: "حقیقی نیک بختی وہ ہے جو کامیابی سے ہم کنار کرے۔"

☆ وقال(ع): "السعید من وعظ بغیرہ."

آپ ہی نے فرمایا: "نیک بخت وہ ہے جو دوسروں سے نصیحت حاصل کرے۔"

☆ وقال(ع): "انما السعید من خاف العقاب فامن' ورجا الثواب فاحسن' واشتاق الی الجنۃ فادلج."

آپ ہی نے فرمایا: "خوش بخت انسان تو بس وہی ہے جو عذاب سے ڈرے اور ایمان لے آئے' ثواب کی امید میں نیک اعمال بجالائے اور جنت کے اشتیاق میں راتیں جاگ کر بسر کرے۔"

☆ وقال: "السعيدمن اخلص الطاعة."

آپؑ ہی نے فرمایا: "خوش بخت وہ ہے جو اخلاص کے ساتھ اطاعت کرے۔"

☆وقال(ع): "اعلموا بالعلم تسعدوا."

آپؑ ہی نے فرمایا: "علم پر عمل خوش بختی کا موجب ہے۔"

☆ وقال(ع): "من حاسب نفسه سعد."

آپؑ ہی نے فرمایا: "محاسبۂ نفس کرنے والا خوش بخت ہے۔"

☆ وقال(ع): "دوام العبادة برهان الظفر بالسعادة."

آپؑ ہی نے فرمایا: "خدا کی عبادت میں پائیدار رہنا نیک بختی کی علامت ہے۔"

☆ وقال(ع): "من السعادة التوفيق لصالح الاعمال."

آپؑ ہی نے فرمایا: "سعادت وخوش بختی میں سے یہ بھی ہے کہ انسان اعمالِ صالحہ انج
دینے کی توفیق پیدا کرے۔"

☆ وقال(ع): "ان حقيقة السعادة ان يختم المرء عمله بالسعادة' و
حقيقة الشقاوة ان يختم المرء عمله بالشقاء."

آپؑ ہی نے فرمایا: "حقیقی سعادت اور خوش بختی یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا انج
سعادت پر ہو اور حقیقی بدبختی یہ ہے کہ انسان کے اعمال کا انجام بدی اور بدبختی پر ہو۔"

☆ وقال(ع): "سعادة المرء القناعة والرضا."

آپؑ ہی نے فرمایا: "انسان کی سعادت' قناعت اور راضی برضا رہنے میں ہے۔"

سماعت کے بارے میں

☆ قال الامام علی(ع): "اذا لم تكن عالما ناطقا ' فكن مستمعا واعيا."

امام علیؑ نے فرمایا: "اگر تم گفتگو کرنے والے عالم نہیں ہو' تو ایک اچھے سامع بنو۔"

☆وقال(ع): "وقر قلب لم یکن له اذن واعیة."
آپؑ ہی نے فرمایا: "ایسا شخص جو سننے والے (اور ہدایت قبول کرنے والے) کان نہ رکھتا ہو' سنگدل ہو جاتا ہے۔"

☆وقال(ع): "جعل لکم اسماعا لتعی ماعناها ' وابصار التجلو عن عشاها."
آپؑ ہی نے فرمایا: "خداوندِ عالم نے سماعت کو اس لیے بنایا ہے' تاکہ انسان اپنے سے متعلق بات کو سنے اور آنکھوں کو اس لیے بنایا ہے' تاکہ راستے اور گڑھے میں فرق کر سکے۔"

☆وقال(ع): "رحم اللہ امرء سمع حکما فوعی' ودعی الی رشادفدنا ' واخذ بحجزة هاد فنجی."
آپؑ ہی نے فرمایا: "خدا ایسے شخص پر رحم فرمائے جو حکمت پر مبنی کلام سنے' تو اسے قبول کرے اور جب راہِ ہدایت کی طرف بلایا جائے' تو اسے اختیار کرے' اور ہدایت دینے والوں کے امر و نہی کو سنے اور نجات پائے۔"

☆وقال الامام الحسن (ع): "ان ابصر الابصار مانفذ فی الخیر مذهبه ' واسمع الاسماع ماوعی التذکیر وانتفع به."
امام حسنؑ نے فرمایا: بیناترین آنکھ وہ ہے جو نیکی اور نیکوکاری کا راستہ اختیار کرے' اور شنوا ترین گوش وہ ہے جو سنے اور اس سے استفادہ کرے۔

☆☆☆☆☆

(۴)

جوان اور سیاسی و تنظیمی سرگرمیاں

سیاست کے بارے میں منفی موقف

☆ مشہور قول ''ہماری سیاست عین دیانت ہے اور ہماری دیانت عین سیاست'' کے برعکس بہت سے جوان ایسے ہیں جو سیاست کو بُری نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس بارے میں جنابِ عالی کیا فرماتے ہیں؟

O نہیں جناب، بعض جوان سیاست سے گریز نہیں کرتے، بلکہ ایک خاص قسم کی سیاست، پیچیدہ سیاسی حالات یا ان سیاسی رہنماؤں سے گریزاں رہتے ہیں جو ان کی خواہشات اور اہداف و مقاصد کے حصول کے لیے کوئی ٹھوس لائحۂ عمل نہیں رکھتے۔ اسی طرح سیاسی جماعتوں کا طرزِ عمل اور سیاسی تنظیموں کی داخلی پیچیدگیاں بھی ان جماعتوں میں نوجوانوں کی عدم شمولیت اور سیاست سے دوری کے عوامل میں سے ہیں۔

ہمیں بعض ایسے نوجوان بھی ملتے ہیں جو سیاست کے بارے میں منفی تصور رکھنے کی وجہ سے سیاسی اداروں میں شمولیت سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ منفی تصور یہ لوگ یا تو اپنے گرد وپیش کے ماحول سے اخذ کرتے ہیں، یا اپنے مطالعے سے، یا معاشرے میں سیاست کو بُری نگاہ سے دیکھے جانے سے، جیسے یہ مقولہ کہ سیاست دھوکا، فریب، جھوٹ اور نفاق کا نام ہے،

لہٰذا انسان کو لازماً اس سے دور رہنا چاہیے‘ وغیرہ وغیرہ۔

بسا اوقات جوانوں میں سیاست سے گریز کا ایک اور سبب سیاست میں پیش آنے والی دشواریوں سے ان کا خوف اور ان کا اندرونی طور پر کمزور ہونا ہے۔

لہٰذا ہمارے خیال میں مذکورہ بالا عناصر میں سے کم از کم کوئی ایک عنصر سیاست کے بارے میں جوانوں کے منفی طرزِ عمل کی بنیاد ہوتا ہے۔ اس بنا پر دعوت و سیاست کے میدان میں سرگرمِ عمل افراد کا فرض ہے کہ ایک تو وہ اُمتِ اسلامی کی سیاست سے تعلق والے نمایاں خطوط نوجوانوں کے سامنے روشن کریں اور دوسرے یہ کہ انہیں جہاد‘ راہِ خدا میں ایثار و فدا کاری اور تقربِ الٰہی کے درخشاں نتائج سے آگاہ کریں‘ تاکہ اس راہ کی مشکلات اور خطرات اُن کے پائے ثبات میں لغزش کا سبب نہ بنیں۔

شاید سیاست کے بارے میں منفی مؤقف کی بنیادی وجہ مکر و فریب‘ جھوٹ اور خیانت پر مبنی وہ رائج سیاست ہے جس نے سیاست کو ایک ایسے عمل کے طور پر متعارف کرایا ہے جس کا اخلاق سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اور اب یہ مقاصد کے حصول کے لیے ایک ایسے طریقۂ کار کا روپ دھار چکی ہے جس میں کسی اخلاقی اصول اور ضابطے کی پابندی ضروری نہیں۔ جبکہ دین کا مفہوم عظیم معنوی اقدار سے جنم لیتا ہے‘ جس میں للّٰہیت اور ان اخلاقی‘ سماجی اور معنوی اقدار کی راہ میں جدوجہد پنہاں ہے جو آسمانی شریعتوں میں سے کسی شریعت سے ہم آہنگ ہوں۔ اور یہی امر دینی اور لادینی سیاست کو ایک دوسرے سے جدا کرتا ہے۔

لیکن دین اور سیاست کا باہمی تعلق‘ سیاست اور دین کے معاشرے میں رائج مفہوم سے مطابقت نہیں رکھتا۔ رائج مفہوم میں دین صرف عبادات کے تنگ دائرے میں منحصر ہے اور اسے زندگی کی حقیقتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ حالانکہ زندگی کی حقیقتوں کو انسان کے داخلی پہلو سے جدا نہیں کیا جاسکتا ہے اور وہ لامحالہ انسان کے خارجی پہلو میں اور اسکے انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل میں منعکس ہوتا ہے۔ عوامی طرزِ فکر کے مطابق‘ دین کے اثرات کا دائرہ

انسان کے انفرادی پہلو تک محدود ہے اور زندگی کے اجتماعی مسائل یا دورانِ حیات سامنے آنے والے طرح طرح کے چیلنجوں میں دین کا کوئی کردار نہیں۔

دین کا راستہ عدل کا راستہ ہے

دین اور عدل کی ہمراہی کو دیکھتے ہوئے' یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ عدل پورے دین کا نچوڑ ہے۔ لہٰذا لازم ہے کہ ہم خود اپنی ذات کے ساتھ عدالت کو ملحوظ رکھیں' خود اپنے اوپر ظلم کے مرتکب نہ ہوں' تاکہ دنیا و آخرت کی تباہی سے محفوظ رہیں۔

لہٰذا ایک ایسا انسان جو پروردگار پر ایمان کی دولت سے مالا مال ہو' اس کا مطیع و فرمانبردار ہو اور جس کی حیات الٰہی تعلیمات کے مطابق بسر ہو' اس نے اپنے نفس کے ساتھ عادلانہ سلوک کیا ہے۔ کیونکہ اس نے خود کو دنیا اور آخرت کی کامرانی و کامیابی کا موجب بننے والے راستے پر لگایا ہے۔

اسی طرح انسان کا اپنے رب سے تعلق عدل کے محور پر استوار ہے۔ کیونکہ ایک ایسا انسان جو اس بات پر ایمان رکھتا ہو کہ اللہ رب العزت' پروردگارِ عالم' خالقِ کل اور منعِ نعمت ہے اور وہی ہے جس نے اسکے لیے تمام چیزوں کو مہیا کیا ہے اور پوری کائنات پر اسی کا تسلط اور اقتدار ہے' تو وہ (ایسا انسان) اس خدا کے بارے میں عادلانہ رویہ اپناتا ہے۔ اس مقام پر عدل کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اسی کی پرستش کی جائے' کسی کو اس کا شریک قرار نہ دیا جائے' اسی کی اطاعت کی جائے' اسکی نافرمانی نہ کی جائے' خدا کی مشیت اور ارادے کے ساتھ خود کو ہم آہنگ کیا جائے' اسکے برخلاف عمل سے اجتناب کیا جائے' رضائے الٰہی کے لیے کوشاں رہا جائے اور اسکے قہر و غضب کا موجب بننے والے کاموں سے پرہیز کیا جائے۔

کیونکہ خدا کا اپنے بندوں پر حق یہ ہے کہ بندہ (عبادت کے لفظ میں پوشیدہ) تمام معنی میں خدا کا عبدِ خالص ہو اور اپنی بندگی اور خدا کی ربوبیت کے مقام کو پہچانے اور اسے

ملحوظ رکھے۔ اس بات کو قرآنِ کریم ان الفاظ میں پیش کرتا ہے:

"وَ مَا کَانَ لِمُؤْمِنٍ وَّ لَا مُؤْمِنَةٍ اِذَا قَضَی اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗٓ اَمْرًا اَنْ یَّکُوْنَ لَهُمُ الْخِیَرَةُ مِنْ اَمْرِهِمْ."

"اور کسی مومن مرد یا مومن عورت کو اختیار نہیں ہے کہ جب خدا اور اس کا رسول کسی امر کے بارے میں فیصلہ کر دیں، تو وہ اپنے امر کے بارے میں صاحبِ اختیار رہے۔" (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۶)

لہٰذا خدا اس بات کا بھی مستحق ہے کہ اس کا بندہ ہر معاملے میں اس کا مطیع و فرمانبردار رہے۔ اگر وہ کفر، شرک یا معصیت کے باعث خدا کی اطاعت سے روگرداں ہوا، تو اس نے خدا پر ظلم کیا ہے۔ اس مفہوم کو ہم ان نصائح میں پاتے ہیں جو حضرت لقمانؑ نے اپنے فرزند کو کیں۔ آپؑ نے فرمایا: یٰبُنَیَّ لَا تُشْرِکْ بِاللّٰهِ اِنَّ الشِّرْکَ لَظُلْمٌ عَظِیْمٌ. (بیٹا! خبردار کسی کو خدا کا شریک نہ بنانا، کہ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۱۳)

اسی طرح ایک انسان کا دوسرے انسان سے تعلق بھی عادلانہ تعلق ہونا چاہیے۔ کیونکہ خداوندِ عالم نے ہر انسان کے ذمے دوسرے انسانوں کا حق قرار دیا ہے اور زندگی دراصل لوگوں کے درمیان حقوق کے تبادلے کا میدان ہے۔ لہٰذا یہاں کسی کو بھی، حتیٰ انبیا کو بھی صرف حق ہی حق حاصل نہیں ہے، بلکہ انبیا کا لوگوں پر حق یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں، ان کی دعوت پر لبیک کہیں، ان کی مدد و نصرت کریں۔ جبکہ لوگوں کا بھی انبیا پر حق ہے اور وہ یہ کہ انبیا انہیں حق کی دعوت دیں، ان کی رہنمائی کریں، ان کا تزکیہ کریں، انہیں تعلیم دیں، وغیرہ وغیرہ۔

یہی وجہ ہے خداوندِ عالم اپنے رسولؐ سے تقاضا کرتا ہے کہ امت کو تبلیغ کا حق ادا کریں۔ اس بات کو ہم اللہ تعالیٰ کے اس قول میں پاتے ہیں:

"یٰٓاَیُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ وَ اِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا

بَلَّغتَ رِسَالَتَہُ."

''اے رسول! آپ اس حکم کو پہنچا دیں جو آپ کے پروردگار کی طرف سے نازل کیا گیا ہے اور اگر آپ نے یہ نہ کیا' تو گویا اسکے پیغام کو نہیں پہنچایا۔''

(سورۂ مائدہ ۵۔آیت ٦٧)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''تبلیغ'' دراصل پیغمبر کی ایک ذمے داری ہے اور اس حق کی علامت ہے جو لوگ ہدایت و رہنمائی اور تعلیم و تربیت وغیرہ کے سلسلے میں انبیا اور اسی طرح ائمہ' اولیا اور علما پر رکھتے ہیں۔

اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خداوندِ تعالیٰ جسے تمام لوگوں پر مطلق حق حاصل ہے اور کسی بندے کا اس پر کوئی حق نہیں ہے' اسکے باوجود وہ اپنے بندوں پر فضل کرتے ہوئے ان کے لیے اپنے اوپر ایک حق قرار دیتا ہے اور فرماتا ہے:

''اَوفُوا بِعَهدِیٓ اُوفِ بِعَهدِکُم."

''اور ہمارے عہد کو پورا کرو' ہم تمہارے عہد کو پورا کریں گے۔''

(سورۂ بقرہ ٢۔آیت ٤٠)

اس بنیاد پر جس کسی انسان نے دوسرے کا حق ادا کیا' تو اس نے اسکے ساتھ عدل کیا' اور جو کوئی بھی دوسرے کا حق ادا نہ کرے' وہ ظلم کا مرتکب ہوگا۔ اس بات کو آگے بڑھائیں تو نظر آتا ہے کہ حقوق کا مسئلہ ہمیشہ عدل اور ظلم سے جڑا رہا ہے۔ لہٰذا جب ہم انسان کے اردگرد کے ماحول اور اسکے اس سرزمین سے ربط و تعلق پر نگاہ ڈالتے ہیں جہاں وہ زندگی بسر کرتا ہے' تو دیکھتے ہیں کہ یا تو اس نے اس سے اچھا سلوک کیا ہے اور یا بُرا۔ اللہ تعالیٰ ماحول اور زندگی کو پھلتا پھولتا دیکھنا پسند کرتا ہے اور اس نے ان کی نشو ونما کی ذمے داری انسان کے سپرد کی ہے اور یہ چیز ماحول اور زندگی کے بارے میں انسان کو ذمے دار قرار دیتی ہے۔ جیسے کہ انسان بھی تکوینی طور پر ماحول اور زندگی پر حق رکھتا ہے۔ اس مفہوم کو ہم خداوندِ عالم

کے اس قول سے اخذ کرتے ہیں جس میں ارشاد ہوتا ہے:

"لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَ اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَ الْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ."

"بے شک ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل کے ساتھ بھیجا ہے اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان کو نازل کیا ہے تاکہ لوگ انصاف کے ساتھ قیام کریں۔" (سورۂ حدید ۵۷۔ آیت ۲۵)

اس آیت میں ہم دیکھتے ہیں کہ تمام ادیان، رسالتیں اور انبیا عدل کی راہ پر گامزن رہے ہیں۔

سیاست اور عدالت کا تعلق دین ہے

ہم یہ بات جانتے ہیں کہ عدالت مردانِ سیاست کے لیے جذب و کشش رکھتی ہے۔ کیونکہ سیاست دوسرے انسانوں اور حیاتِ اجتماعی سے انسان کے تعلق کی ایک ایسے نظام کے دائرے میں تنظیم و تدبیر کی ذمے دار ہے جس میں ان روابط و تعلقات کو معین کیا گیا ہو۔ خواہ یہ نظام ثابت ہو، جو قانون کی شکل میں انسانوں کے باہم ایک دوسرے پر عائد ہونے والے حق کو معین کرے، خواہ متغیر نظام ہو، جو حکمراں اور رعیت کی سرگرمیوں کی صورت میں روزمرہ مسائل میں ظاہر ہوتا ہے۔

یہ وضاحت ہو جانے پر ہم باآسانی یہ بات جان لیں گے کہ سیاست اور عدالت کا باہمی تعلق ایک دینی مسئلہ ہے۔ یعنی تمام دینی تعلیمات، قوانین اور اعمال میں عدل پنہاں ہے اور درحقیقت دین عین عدل ہے۔ اس بنا پر ہمارے لیے لازم ہے کہ حاکم و محکوم، قانون اور انسان، انسان اور زمین اور ماحول اور حیوانات، الغرض تمام اشیا کے باہمی تعلق میں عدل کی حدود کا خیال رکھیں۔ یوں ہم پر یہ حقیقت روشن ہوتی ہے کہ بغیر سیاست کے عدل کا قیام

ناممکن ہے۔ کیونکہ سیاست ہی عدالت کے قیام اور غلبے کی عملی راہوں کو معین کرتی اور ظہور کا سامان فراہم کرتی ہے۔

سیاست اور اخلاق

یہاں ایک اور مسئلہ پیش آتا ہے' اور وہ یہ ہے کہ بعض اوقات پیچیدہ حالات سیاست اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اخلاقی اصولوں کو نظر انداز کر دیا جائے اور ان سے اعتنائی برتی جائے۔ مثلاً دوسروں کا ناشائستہ طرزِ عمل مجبور کر دیتا ہے کہ آپ بھی ان کے غیر اخلاقی رویہ اپنائیں۔ کیونکہ آپ اخلاقی اصولوں پر کاربند رہ کر ان کا مقابلہ نہیں کر سکے حتیٰ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کا دشمن اس مقدس اصول کو آپ کے خلاف استعمال کرے جس آپ ایمان رکھتے ہوں اور وہ اسکے ذریعے آپ کو نقصان پہنچائے اور آپ کو پھنسا لے۔

ایسے مواقع پیش آ جانے کی صورت میں اسلام نے ان سے نجات کی راہ دکھائی اور ان استثنائی حالات اور ضرورتوں کے لیے حکم بیان کیا ہے۔ مثال کے طور پر بسا اوقا حالات کی سنگینی اور دشواری آپ کو مجبور کر دیتی ہے کہ آپ سچ بولنے کی بجائے جھوٹ کام لیں۔ یہ عمل اس وقت قابلِ قبول ہے جب اسلام کے ارفع مفادات' یا انسانو بھلائی دروغ گوئی کا تقاضا کرے۔ کیونکہ بعض حالات میں راست گوئی فریق مخالف لیے آپ کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھانا ممکن بنا دیتی ہے اور اگر یہ کمزوریاں ظاہر ہو جا آپ مخالف قوتوں کے دباؤ میں آ جاتے ہیں۔ اسی طرح مصلحت کا تقاضا ہو تو ممکن اوقات ''غیبت'' یا ''تجسس'' بھی ضروری ہو جائے۔

اگر اسلام کی مصلحت کا تقاضا ہو اور مسلمان یہ محسوس کریں کہ حقائق تک رسا لیے انہیں ایک اطلاعاتی نظام درکار ہے اور یہ بندوبست اس حد تک لازم ہو جائے مسلمانوں کے پاس اطلاعات کا یہ نظام نہ ہو' تو دشمن اپنی ایجنسیوں کے ذر

مسلمانوں پر غلبہ پالیں گے' وہ مسلمانوں کے تمام امور سے واقف ہوں گے جبکہ مسلمانوں کو ان کے بارے میں کچھ بھی علم نہ ہوگا' تو ایسی صورت میں ''جاسوسی'' کے لیے بندوبست فرض ہے۔ کبھی کبھی ممکن ہے ایسے ہی استثنائی حالات میں مسلمان بعض ایسے (بے گناہ) مسلمانوں کے قتل پر مجبور ہو جائیں جنہیں دشمن نے مسلمانوں پر غلبے کے حصول کے لیے اپنی ڈھال بنایا ہوا ہو۔

انتہائی اہم مسائل میں تو ہدف وسیلے کی توجیہ کرتا ہے لیکن ذاتی' انفرادی اور عام مسائل میں ہدف کو وسیلے کی توجیہ کرنے والا سمجھنا درست نہیں۔ یعنی صرف بڑے بڑے مسائل میں کسی حرام وسیلے کا حلال ہو جانا اور مباح وسیلے کا واجب ہو جانا ممکن ہے۔

لہٰذا ہم اس بات کے معتقد ہیں کہ اسلامی سیاست میں اصولاً تو صداقت' راستی اور اخلاقی روش کی پابندی کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے' لیکن اگر ایسے دشوار حالات جنم لیں' جو اس راہ کے سوا کسی اور راستے کو اسلام کی مصلحت قرار دیں' تو اس تازہ صورتحال کی پیدا کردہ مصلحتوں کے نتیجے میں ایک نیا سیاسی اخلاق وجود میں آئے گا۔

سیاست اور شریعت

اسلامی شریعت میں احکام' عنوانِ اولیہ اور عنوانِ ثانویہ کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا کبھی ایک چیز عنوانِ اوّلی کی رو سے تو حلال ہوتی ہے لیکن عنوانِ ثانوی کی رو سے حرام ہو جاتی ہے۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ اسلام اپنے بطن میں سیاست لیے ہوئے ہے۔ جس موقع پر سیاست محرماتِ اسلامی کی حدود میں رخصت کی ضرورت محسوس کرے' تو صاحبانِ امر پر لازم ہے کہ موضوع کا گہری نظر سے جائزہ لیں اور مصلحت کی تشخیص کے بعد اسکی بنیاد پر مناسب قدم اٹھائیں۔

اسلام کی نگاہ میں سیاست اخلاقی اصولوں سے جدا ایک حقیقت نہیں۔ اسی بنیاد پر ہم

کہتے ہیں کہ ہمارا دین عین سیاست ہے' کیونکہ دین زندگی میں انسانی طرزِ عمل اور راہ ورد
کا تعین کرتا ہے' اسی طرح ہماری سیاست عین دیانت ہے' کیونکہ سیاست میں اجتما
میدانوں میں انسانی سرگرمیاں پیش نظر ہوتی ہیں اور جس طرح دین میں رخصت دی گئی
اسی طرح سیاست میں بھی رخصت دی گئی ہے۔

جوان اور سیاسی وابستگی

☆ سیاسی جماعتوں' تحریکوں اور تنظیموں کا یہ عام رَد یہ ہے کہ وہ جوانوں کے جوش وخروش
اور فعالیت کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال کرتی ہیں۔ سیاسی تحریکوں سے
نوجوانوں کی وابستگی کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے اور اس بارے میں آپ کیا
ہدایات دینا پسند فرمائیں گے؟

O جوانی' حرکت اور فعالیت کا دور ہے۔ اس دور میں جوان ایک ایسے ہدف اور مقصد
کی تلاش میں ہوتا ہے جسے اپنا نصب العین قرار دے' ایک ایسے گروہ کا متلاشی ہوتا ہے' جس
سے خود کو وابستہ کرے اور ایسے وسائل و ذرائع کے کھوج میں ہوتا ہے جن کے ذریعے اپنے
عمل کا راستہ معین کرے۔ اس بنیاد پر کہا جا سکتا ہے کہ سیاست ایک اہم مسئلہ ہے اور ان
وسائل میں سے ہے جن کا تمام معاشرتی حقائق سے گہرا ربط ہے' خواہ ان کا تعلق حکومت اور
حکام سے ہو' خواہ قانون اور سیاسی روابط سے' خواہ استعمار کی معاندانہ سرگرمیوں اور استکبار کی
غاصبانہ کوششوں کے نتیجے میں سامنے آنے والے سیاسی چیلنجوں سے۔

جب امتِ مسلمہ ان تمام (مثبت اور منفی) مسائل سے دوچار ہوتی ہے' تو اس پر لازم
ہے کہ اپنی قدرت' ثبات اور استحکام کے لیے مثبت عناصر کی پرورش اور ان کی تقویت و تکا
کے لیے بھرپور جدوجہد کرے اور منفی عناصر کے اثرات کم کرنے اور ان کے پھیلاؤ اور
وسعت کو روکنے کے لیے حتیٰ الامکان کوشش کرے۔

امتِ اسلامیہ اس وقت تک یہ مقاصد حاصل نہیں کرسکتی جب تک وہ اپنے جوانوں کی قوتوں اور صلاحیتوں سے استفادہ نہ کرے۔ کیونکہ جوان اپنی طبیعت اور ابتدائے شباب کی خصوصیات کی بنا پر ان چیلنجوں کا سامنا کرنے اور ان کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

لہٰذا امتِ اسلامیہ کو بڑے بڑے مسائل میں جوانوں کی طاقت کو متحرک کرنا چاہیے۔ اگر امت یہ چاہتی ہے کہ جوان یہ کردار ادا کریں اور وہ انہیں اس کردار کی انجام دہی کے لیے تیار کرے' یا جوان از خود اس کردار کی ادائیگی کے لیے آمادہ ہوں' تو اسے چاہیے کہ ایک طرف تو ان تحریکوں اور تنظیموں کی فکری' سیاسی اور عملی کیفیت اور ماہیت کا اس لحاظ سے مطالعہ کرے کہ وہ کس حد تک بنیادی فکری اور عقیدتی اصولوں سے ہم آہنگ ہیں اور دوسری طرف یہ دیکھے کہ یہ جماعتیں اور تنظیمیں امتِ اسلامیہ کے مسائل کے حل اور اسکے مقاصد کو جامۂ عمل پہنانے کے سلسلے میں کیا منصوبہ بندی اور پروگرام رکھتی ہیں۔ اسکے علاوہ ان کی لیڈر شپ اور سیاسی محور (تنظیم' تحریک' جماعت) کے فعال اور نمایاں لوگوں کو بخوبی پہچاننا چاہیے اور ان کے حقیقی محرکات (motives) اور سرگرمیوں کا بھی گہرا مطالعہ کرنا چاہیے۔

لہٰذا جوانوں پر لازم ہے کہ وہ اپنے سیاسی محور (تنظیم' تحریک' جماعت) کی تمام پوشیدہ اور آشکارا خصوصیات کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں' یہاں تک کہ انہیں اس بات کا اطمینان ہو جائے کہ ان کی توانائیاں ضائع نہیں جائیں گی اور انہیں کسی کی ذاتی خواہشات اور رجحانات کی بھینٹ نہیں چڑھایا جائے گا' اور وہ باطل مقاصد کے لیے نعرۂ حق استعمال کرنے والوں کے آلۂ کار نہیں بنیں گے۔ اسی طرح انہیں ایسے دوسرے امور پر بھی گہری نظر رکھنی چاہیے جو لوگوں کی مخلصانہ کوششوں اور توانائیوں کے زیاں کا موجب ہوتے ہیں اور انہیں مذموم مقاصد کے لیے استعمال کرنے کا سبب بنتے ہیں۔

ہم جوانوں کو یہ نصیحت بھی کریں گے کہ تمام مسائل کا انتہائی ہوشیاری کے ساتھ جائزہ لیں اور مذکورہ بالا امور کا سبب بننے والے سیاسی حقائق کا تمام پہلوؤں سے خوب

اچھی طرح مطالعہ کریں۔ کیونکہ میدانِ سیاست میں طرح طرح کے گڑھے' کھائیاں اور وادیاں آتی ہیں' جنہیں پہچاننا نہایت ضروری ہے' تاکہ وہ حرکت اور سکوت کے دوران اپنے قدم رکھنے کے لیے مضبوط جگہ کا انتخاب کرسکیں۔

خوف کی وجہ سے شمولیت

☆ بعض جوان کچھ جماعتوں میں اپنی شمولیت کی وجہ خوف یا جہل کو قرار دیتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

O انسان فروعی اور غیر بنیادی نوعیت کے اجتماعی و انفرادی مسائل کے بارے میں تو شاید تساہل سے کام لے سکے اور ان میں اپنے ذاتی مثبت یا منفی محرکات کی بنیاد پر عمل کرسکے' لیکن تقدیر ساز مسائل میں' یعنی ایسے منصوبوں اور پروگراموں میں جو پوری امت کے مفاد سے تعلق رکھتے ہیں اور جہاں افرادِ معاشرہ کی طاقتیں مل جل کر عمل کرتی ہیں' وہاں اس پر مثبت یا منفی پہلو سے مکمل ذمے داری عائد ہوتی ہے۔ لہٰذا کسی ایک یا دوسری سیاسی جماعت سے تعلق قائم کرنے' اِس گروہ سے یا اُس گروہ سے جنگ کرنے' یا حکومت کو کوئی خاص راستہ اپنانے کے لیے متوجہ کرنے جیسے معاملات میں اسے مکمل ذمے داری کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

خداوندِ عالم' ہر انسان (اور مسلمان جوان) کا معاشرے میں رونما ہونے والی خرابیوں سے اسکے تعلق اور ان کی روک تھام کے سلسلے میں اسے حاصل طاقت وقدرت کے بقدر مواخذہ کرے گا۔ لہٰذا انہیں خدا کو اپنے ہر عمل کا نگراں سمجھنا چاہیے۔ اسی طرح ان کا یہ بھی فرض ہے کہ امت کے حال اور مستقبل کی ذمے داری اپنے کاندھوں پر اٹھائیں۔

دین وسیاست کی جدائی

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دین اور سیاست کی جدائی سے مراد یہ ہے کہ ان دونوں کا تعلق مخصوص دائروں سے ہے۔ یعنی سیاست کا دائرہ علیحدہ ہے اور دین کا دائرہ علیحدہ۔ کیا

آپ کے خیال میں یہ تقسیم صحیح ہے؟

○ دین' انسان کی دنیوی زندگی سے علیحدہ نہیں' اسی طرح سیاست بھی انسانی حیات کے کسی محدود دائرے سے مخصوص نہیں۔ لہٰذا جب دین پوری زندگی پر محیط ہے' تو ہم کس طرح اسے کسی مخصوص گوشے میں محدود کر سکتے ہیں؟ اسی طرح جب ہم یہ مانتے ہیں کہ سیاست کا دامن پوری زندگی پر پھیلا ہوا ہے' تو پھر اسے زندگی کے کسی خاص گوشے سے مخصوص کس طرح کیا جا سکتا ہے؟

کسی چیز کو اسی وقت کسی معین میدان سے مخصوص قرار دیا جا سکتا ہے جب اس میں صرف وہی محدود خصوصیات پائی جائیں جو اس معین میدان سے مخصوص ہوں۔ لیکن ایسی چیز جو صرف ان خصوصیات تک محدود نہ ہو اور زندگی کے تمام مسائل اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہو' تو اُسکے بارے میں کس طرح کہا جا سکتا ہے کہ وہ کسی خاص میدان میں منحصر ہے؟

ہاں! علمِ دین اور علمِ سیاست میں تخصیص کا پایا جانا ممکن ہے۔ البتہ علمی لحاظ سے تخصیص ایک علیحدہ چیز ہے اور کردار کی ادائیگی کے حوالے سے تخصیص ایک دوسری چیز' اور اس میں اور یہ کہنے میں بہت فرق ہے کہ دین کا کردار ایک مخصوص دائرے میں محدود ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں اور سیاست کا دائرہ بھی اس قدر تنگ ہے کہ دین کا اس سے کوئی ربط نہیں۔ کیونکہ دین پوری انسانی حیات پر اثر رکھتا ہے' جس میں سیاسی پہلو بھی شامل ہے' نیز سیاست بھی پوری انسانی زندگی میں مؤثر ہے اور دینی پہلو بھی اس میں شامل ہے۔

خواتین اور سیاسی سرگرمیاں

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلام نے سیاسی میدان میں عورت کے ساتھ ظلم کیا ہے' کیونکہ اسے قاضی ہونے' حکومت کی سربراہی اور بعض دوسری سیاسی سرگرمیوں سے روکا

ہے۔اس بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

○ ہمارے خیال میں اسلام نے سیاسی میدان میں عورت کو بہت سے حقوق عطا کیے ہیں۔ اگر شریعتِ اسلام نے عورت کو قاضی (Judge) بننے سے روکا ہے' تو اسے اس حوالے سے عورت کے حقوق کو کم کرنا نہیں سمجھنا چاہیے' بلکہ اسکی وجہ عدالت کے سلسلے میں احتیاط کو ملحوظ رکھنا ہے۔اس حکم کی بنیاد اس امکان کا پایا جانا ہے کہ عورت کے جذبات' جو اسکی جنس کا خاصّہ اور اسکی مامتا کے لیے لازم ہیں' اسکے عدالتی فیصلوں پر اثر انداز ہوں اور فیصلہ کرتے وقت اسکے کسی ایک یا دوسری طرف جھکاؤ کا سبب بن جائیں۔

لہٰذا عدل وانصاف کے سلسلے میں احتیاط کو ملحوظ رکھنے کی غرض سے عورت کو قاضی بننے سے روکا گیا ہے۔ یہ قانون عورت کی عزت واحترام کو کم نہیں کرتا۔

تاہم عورت کے سربراہِ حکومت نہ ہو سکنے کا مسئلہ بھی شاید مذکورہ بالا مسئلے کی مانند ہی قابلِ توجیہ ہو۔اس حکم کو وضع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ حکمرانی کے عمل میں کچھ خاص پیچیدگیاں اور دشواریاں پائی جاتی ہیں' جو عورت کی فطری خصوصیات سے سازگار نہیں۔

اس گفتگو سے یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان پائے جانے والے فطری فرق کی وجہ سے یہ احکام وضع کیے گئے ہیں۔

عورت کا سربراہِ حکومت ہونا

☆ واضح طور پر فرمایئے کہ کیا اسلام عورت کے لیے وزارتِ عظمیٰ یا حکومت کی سربراہی کو حرام قرار دیتا ہے؟

○ اس موضوع پر نئے سرے سے بحث وگفتگو کی ضرورت ہے۔بعض احادیث (جو ہماری نظر میں معتبر نہیں' مزید یہ کہ زیر بحث موضوع پر ان کی دلالت کے بارے میں بھی نزاع پایا جاتا ہے) کہتی ہیں: **ما افلح قوم ولتهم امرأة.** (ایسی قوم کامیابی وکامرانی نہ

پاسکے گی جس نے عورت کو اپنا حاکم اور والی قرار دیا ہو)

بالفرض اگر یہ حدیث صحیح ہو بھی، تو پچھلے زمانوں کے طرزِ حکومت کے بارے میں درست ہوگی، جس میں سربراہِ حکومت مطلق اختیارات کا مالک ہوتا تھا۔ لیکن عصرِ حاضر کے طرزِ حکومت میں بہت سے ادارے حکمراں پر نظر رکھتے ہیں اور اسکے اعمال و افعال کا محاسبہ کرتے ہیں، یہاں تک کہ حاکم ان قانونی اور واقعی خطوط سے قدم باہر نہیں نکال سکتا جنہیں ماہرین کی کونسل یا پارلیمنٹ وغیرہ مصلحت کے پیشِ نظر ضروری قرار دیتے ہیں۔

لہٰذا انسان اس قسم کی احادیث کے مفہوم کو محتاط نگاہ سے دیکھ سکتا ہے۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا ہے کہ اس بارے میں نئی تحقیق کی ضرورت ہے، تاکہ یہ پتا چل سکے کہ اس حکم کی وجہ اس خاص مقام کے لیے عورت کی نااہلی اور اس میں اس مقام کے لیے مطلوب صلاحیت کا نہ پایا جانا ہے، یا اس حکم کا تعلق طرزِ حکومت کے مطلق یا مقید ہونے سے ہے؟

ٹریڈ یونین سرگرمیاں اور معاشرے کے طبقاتی ہونے کا مسئلہ

☆ کیا ٹریڈ یونین اور پیشہ ور تنظیمیں، معاشرے کے طبقہ بند ہونے اور اس میں افتراق و انتشار کا موجب ہیں؟ کیا ان اداروں کو اس مرض سے دور رکھا جا سکتا ہے؟

O اگر ٹریڈ یونین اور پیشہ ورانہ تنظیموں کے قیام کی بنیاد ایک دوسرے کے خلاف امتیاز اور ایک دوسرے کی ضد اور مخالفت ہو، تو وہ بلند انسانی مقام سے گر کر ناپسندیدہ صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ کیونکہ جب ایک کارکن یہ محسوس کرے کہ اپنے آجر یا افسر کی نظر میں اسکی حیثیت ایک غلام کی سی ہے، تو ایسی صورت میں بظاہر تو وہ افسر اور آجر کی خدمت میں مشغول ہوتا ہے، اسکے احکامات بجالاتا ہے، لیکن دل میں اس افسر یا آجر کو ظالم، جابر، مفاد پرست اور متکبر سمجھ رہا ہوتا ہے۔

اسی طرح اگر افسر یا آجر یہ سمجھنے لگے کہ کارکن اس سے بغض و عداوت رکھتا ہے اور

اسکے منصوبے اور پروگرام کی پیشرفت میں رکاوٹ ہے' تو یہ صورتحال ایک طبقاتی ٹکراؤ کا رنگ اختیار کر لیتی ہے اور دونوں فریق ایک دوسرے کو مستقل اور لاینحل مشکل سمجھنے لگتے ہیں۔

لیکن اگر صورتحال مختلف ہو اور ہر فریق کا مقصد اور مطمح نظر اپنے باہمی تعلقات کو صحیح پیمانوں پر منظم کرنا ہو' تو پھر یہ ناپسندیدہ صورتحال جنم نہیں لیتی۔ کیونکہ اس خوشگوار ماحول میں کارکن اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاص کے ساتھ اپنے فرائض کو اس طرح انجام دے کہ اس کا ضمیر بھی مطمئن رہے اور اپنے افسر یا آجر سے خیانت کا مرتکب بھی نہ ہو۔ ان حالات میں افسر یا آجر بھی کارکن کو ایک پرزے کی مانند نہیں سمجھتا' بلکہ اسے اپنی ہی مانند کچھ ضروریات اور خواہشات رکھنے والا ایک انسان سمجھتا ہے۔ اس حوالے سے افسر اور آجر کو یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ کارکن ہی ہے جو ان کے اہداف و مقاصد کو جامۂ عمل پہناتا ہے۔

اس روح کے ہوتے ہوئے ٹریڈ یونین سرگرمیاں ضروری ہیں۔ للہذا جب کارکن ایک معاہدے کے مطابق مشترکہ ذمے داریاں اپنے کاندھوں پر لے لیں' تو پھر یہ مناسب نہیں کہ ان میں سے کوئی کارکنوں اور انتظامیہ (خواہ وہ حکومت ہو' کوئی فرد یا کمپنی) کے درمیان ہونے والے اس معاہدے کی کسی شرط کی خلاف ورزی کرے۔ البتہ کارکنوں کے لیے ایسے حالات فراہم ہونے چاہئیں جن میں وہ آزادانہ فضا میں انتظامیہ کے ساتھ معاہدہ کریں' آزادانہ فیصلہ کریں اور ان کا اور انتظامیہ دونوں کا مفاد ساتھ ساتھ پورا ہو۔

تفاوت ہے انتشار نہیں

☆ کیا پیشہ ورانہ انجمنوں کے بارے میں آپ کے یہ خیالات صرف مزدور تنظیموں سے مخصوص ہیں' دوسرے گروہوں سے نہیں؟ یا آپ ان میں جوانوں اور طلبا تنظیموں کو بھی شامل سمجھتے ہیں؟

○ جب ہم پیشہ ورانہ انجمنوں کے موضوع کا جائزہ لیتے ہیں' تو دیکھتے ہیں کہ ان انجمنوں

کے بکثرت فوائد ہیں۔ یہ انجمنیں ایسے خطوط تشکیل دیتی ہیں جن کے توسط سے انسانوں کے اکٹھے ہونے کے مراکز ترقی پاتے ہیں۔ خواہ یہ مراکز تربیتی ہوں' یا تعلیمی' یا طب وصحت کے مراکز ہوں' یا ان کا تعلق فنی مہارت وغیرہ سے ہو۔ یہ انجمنیں خود اپنے ہم پیشہ لوگوں کے درمیان قربت اور ہم آہنگی میں اضافے کے ساتھ ساتھ ایسے دوسرے گروہوں اور پیشوں کے لوگوں سے بھی تعلقات استوار کرسکتی ہیں جو ان کے ساتھ مل کر کام کرتے ہیں۔

ہمارے خیال میں منظم انجمنوں کا وجود معاشرے میں انتشار وافتراق کا سبب نہیں بنتا' کیونکہ یہ چیز معاشرے میں رنگارنگی اور گوناگونی کے پائے جانے' بالخصوص ان خدمات اور ضروریات کے طرح طرح کے ہونے کا اعتراف ہے جن کا بندوبست معاشرے کے مختلف گروہ ایک دوسرے کے لیے کرتے ہیں۔

جب یہ انجمنیں ایک ایسے مرحلے پر پہنچتی ہیں جہاں منزل کے حصول کی راہ میں ان کے درمیان مشترکہ نکات پر اتفاق اور ہم آہنگی قائم ہو جاتی ہے' اور ایک ایسے واحد مرکز کو تقویت پہنچانے کے لیے مل جل کر سرگرمِ عمل ہوتی ہیں جو ان سب کو اکٹھا کیے ہوتا ہے' تو ایک مثبت عنصر بن جاتی ہیں' منفی عنصر نہیں رہتیں۔

مختلف اور جدا جدا خصوصیات کی حامل تمام پیشہ ورانہ انجمنوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عملی پروگرام بنائیں ان پروگراموں کو اس انداز سے ترتیب دیں کہ وہ ان انجمنوں کی ترقی اور ارتقا کے ساتھ ساتھ معاشرے کے لیے بھی مثبت نتائج سامنے لائیں' اور ان پر تعصبات اور سیاسی تنازعات کی فضا غالب نہ ہو' بلکہ محض ایسی سیاسی رقابت ہو جو کسی سیاسی مقصد کے حصول کے لیے سیاسی سرگرمیوں کی خاصیت ہوتی ہے۔ ان انجمنوں کو چاہیے کہ اپنے آپ کو معاشرے کو درپیش بڑے بڑے چیلنجوں سے علیحدہ نہ رکھیں۔ پس جب معاشرے کو ضرورت ہو' تو قومی اور اسی جیسے دوسرے دائروں میں خود کو متحد کرلیں۔

مسلمان طلبا کی عالمی تحریک کی طرف

☆ گوشہ و کنار سے ایسی آوازیں بلند ہو رہی ہیں جو مسلمان طلبا اور جوانوں کی تنظیموں کو (ان کے رجحانات سے قطع نظر) اتحاد کی دعوت دے رہی ہیں۔ اس امر کے حقیقت کا روپ دھارنے کا امکان کس قدر ہے؟

○ طلبا کی غیر اسلامی تحریکوں کو سامنے رکھ کر' اسلامی طلبا تحریکوں کے بارے میں گفتگو کرتے ہوئے' ہم ایک ایسی کلی اور عام روش کا خاکہ پیش کر سکتے ہیں جو اسلامی طلبا تحریکوں کے مفاد میں ہو اور جو طلبا کی اسلامی تحریک کے' طلبا کی غیر اسلامی تحریک پر غلبے پر منتج ہو سکے۔

ایسی فضا میں ایک واحد ادارے کی صورت میں اتحاد کی خواہشمند تمام اسلامی طلبا تنظیموں کے ساتھ تعاون کیا جا سکتا ہے اور ایسے مشترک نکات تلاش کیے جا سکتے ہیں جو ان کی وحدت کی بنیاد بن سکیں۔ تاکہ مختلف سیاسی رجحانات وحدت پر منفی اثرات مرتب نہ کریں اور تنوع اور رنگا رنگی کے ساتھ ساتھ اتحاد و اتفاق بھی محفوظ رہے۔

اس مقصد کے لیے گہرے اور وسیع مطالعے اور بہت زیادہ کوششوں کی ضرورت ہے۔ اس عمل کے ذریعے بہت سے تعصبات' گروہ بندیوں اور سیاسی پسماندگیوں میں کمی کی جا سکتی ہے۔

☆ تحریکی تجربہ اور سابقہ عملی کردار' جو بے شک امتیازی اوصاف ہیں' کس حد تک ایک تحریکی کارکن کی قدر و قیمت کا پیمانہ ہو سکتے ہیں؟ اور ان اوصاف کے منفی نکات کیا ہیں؟

○ اگر سابقہ طویل تجربہ مثبت اور سودمند نتائج کا سبب ہو' تو ایک پسندیدہ عنصر شمار کیا جاتا ہے۔ ایسا تجربہ نظری اور عملی میدانوں میں فعالیت کے لیے انسان کو گرانقدر آگہی بخشتا ہے' یا خارجی حقائق کے میدان میں اسے کارآمد عملی معلومات فراہم کرتا ہے۔

اگر طویل تجربہ انسان کی ہمت گھٹا دے' اسکی کوششوں اور جدوجہد میں اضمحلال پیدا

کردے‘ اسکی توانائیوں کو پژمردہ کردے‘ تو ایسا انسان ایک تھکے ماندے اور مغلوب عنصر میں تبدیل ہوجاتا ہے‘ جو اپنی بقا اور دفاع کی طاقت بھی کھو بیٹھتا ہے اور ایسے ہی اعمال انجام دیتا ہے جو اسکے فرسودہ اور تھکن آلود مزاج کے موافق ہوں۔

بسا اوقات یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ سابقہ طویل تجربہ انسان کو تقلید اور جمود میں مبتلا کردیتا ہے‘ یہاں تک کہ انسان اپنے اختیار کردہ راستے کو اور ان حالات کو جن میں اسکی فکری اور نفسیاتی فضا تشکیل پائی ہے مستقل اور دائمی سمجھنے لگتا ہے اور ہر قسم کے ایسے جدید اور ارتقا پذیر رجحانات کی راہ میں رکاوٹ کھڑی کرتا ہے جو اسلوبِ عمل اور اہداف کی وسعت کے لحاظ سے اسے ایک نئے مرحلے میں منتقل کرسکتے ہیں۔

خود تحریک میں ڈوب کے رہ جانا

کبھی کبھی تحریکی افراد خود تحریک ہی میں جمود اور ٹھہراؤ کا شکار ہوجاتے ہیں۔ اس کا سبب کبھی تو تحریک کے ابتدائی اصولوں پر شدید اصرار ہوتا ہے اور کبھی بانیانِ تحریک اور ابتدائی قائدین سے حد سے زیادہ لگاؤ اسکی وجہ بنتا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچتی ہے کہ ایسے تحریکی لوگوں کی تمام تر سرگرمیاں ان قائدین کی شخصیت کے لیے منحصر ہوجاتی ہیں اور وہ ان کے لیے ایک بت کی صورت میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایسے موقع پر وہ کسی دوسری شخصیت کو ظاہر ہونے اور ابھرنے کا موقع نہیں دیتے‘ ماسوا اسکے کہ اس شخصیت کو ان کی نظر میں مقدس ہستی کی حمایت اور پشت پناہی حاصل ہو۔

جمود اور انحصار کی یہ حالت مستقبل کی قیادت کے سلسلے میں نئے لوگوں سے استفادے میں بھی رکاوٹ بن جاتی ہے۔

اسی طرح ایسے تحریکی لوگوں کا تحریک کے ابتدائی مراحل سے حد سے زیادہ وابستہ اور ان کے سلسلے میں جمود کا شکار ہوجانا اس بات کا سبب بنتا ہے کہ وہ اپنی تحریک کے آئندہ

مراحل کو گزشتہ مرحلے کا تسلسل قرار دیتے ہیں، نہ کہ ایک نیا قدم' اور یوں بعد کے مراحل پر تجدیدِ نظر' زمانے کے تقاضوں' بدلتے حالات اور جدید اجتہادات کا لحاظ رکھنے پر تیار نہیں ہوتے' جوان پر گزشتہ طریقہء کار کی غلطیاں واضح کر سکتے ہیں۔

ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی اسلامی تحریکیں اپنے ابتدائی مراحل کو تقدس کا درجہ دے کر ان کے بارے میں جمود کا شکار ہو گئیں (حالانکہ وہ مراحل کسی بھی لحاظ سے تقدس کے مالک نہ تھے) کیونکہ کسی شخص یا مرحلے کو اس بنا پر احترام دینا کہ اس میں قابلِ احترام (فکری یا عملی) عناصر پائے جاتے ہیں اور کسی فرد یا مقام کو اہمیت کے حامل عناصر کی غیر موجودگی کے باوجود تقدس کا درجہ دینا دو بالکل علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔

تقدس' یعنی کسی شخص یا مرحلے کی چاہت میں ایسا ڈوب جانا اور اسکے بارے میں ایسی وارفتگی سے کام لینا جو اس بات کا باعث ہو جائے کہ اس مرحلے اور مستقبل میں رونما ہونے والے جدید حالات و شرائط کا واضح ادراک حاصل نہ ہو سکے۔

لہٰذا ہم سمجھتے ہیں کہ تحریکی سابقہ (seniority) تجربات کے مسلسل جاری رہنے کی صورت میں اہمیت کا حامل ہے' لیکن اگر تجربے میں جمود کی حالت طاری ہو جائے اور اس شخص کے محدود تجربے کو مطلقاً درست اور اعتراض سے مبرہ ظاہر کیا جائے اور اسے مستقبل کے تمام مراحل پر بھی مؤثر قرار دیا جائے' تو یہ ایک منفی عامل ہو جائے گا۔

ہمارے خیال میں تحریک میں نئے عناصر کے داخلے کا راستہ کھولنے کی غرض سے بعض پرانے لوگوں کو سبکدوش ہو جانا چاہیے۔ البتہ ہم پرانے لوگوں کو تحریک سے بالکل ہی ختم کرنے کا مشورہ نہیں دے رہے۔ لیکن یہ کہتے ہیں کہ پرانے لوگوں میں کچھ ایسی باتیں رچ بس جاتی ہیں جو ایک طرف تو اسلامی تحریک کی رفتار سست کرنے کا موجب ہوتی ہیں اور دوسری طرف نئے لوگوں کے ابھرنے' ان کی نشوونما اور ان میں اضافے میں رکاوٹ بنتی ہیں۔

جب قدیم عناصر خود کو تجربہ کار سمجھنے لگتے ہیں اور ان میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ

تحریک کی قیادت نئے لوگوں کے سپرد کر دینا تحریک کو فکری اور عملی پہلو سے غیر متوقع خطرات سے دو چار کر دینے کے مترادف ہے' تو اس تصور کے نتیجے میں ایک بڑی مشکل سامنے آتی ہے اور یہ مشکل تحریک کے دوسرے اور تیسرے درجے کی صفوں کے افراد کا مایوسی اور شکست خوردگی کے احساس میں مبتلا ہو جانا ہے۔ یہ حالت سینئر تحریکی افراد کے کام جاری رکھنے میں بھی رکاوٹ بنتی ہے' کیونکہ ایک تو وہ اکیلے اتنی طاقت نہیں رکھتے کہ تحریک کو آگے جاری رکھ سکیں' نیز ان کی ذہنیت جدید حالات کو سمجھنے اور ان سے نمٹنے کی سکت نہیں رکھتی اور وہ نئے غیر متوقع مسائل کا سامنا کرنے کی اہلیت سے بھی عاری ہوتے ہیں۔ کیونکہ وہ ایسے حالات میں جینے کے لازمی طور طریقوں کے مالک ہی نہیں ہوتے۔

ایک تجویز: تدریجاً قیادت کی منتقلی

یہ مسئلہ درپیش آنے کی صورت میں سینئر اور تجربہ کار تحریکی حضرات ''تدریجاً قیادت کی منتقلی'' کا طریقہ اختیار کر کے نئے تحریکی ساتھیوں کو اپنی کارکردگی کے اظہار کا مناسب موقع فراہم کر سکتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے پہلے مرحلے پر نئے لوگوں کو بعض ذمے داریوں پر تعینات کیا جائے' یہاں تک کہ ان میں استحکام اور استقلال پیدا ہو جائے۔ اس عمل کے ذریعے وہ تحریک کو بہتر طور پر سمجھ سکیں گے اور اسے نئی حرارت' نئی قوت اور نئے عناصر فراہم کریں گے۔

بالخصوص اگر بہت سے پرانے تحریکی حضرات سخت صعوبتوں' مشکلات اور کشمکش کے دور سے گزرے ہوں' تو یہ چیز انہیں اس بات پر ابھارتی ہے کہ اپنی سیاسی سرگرمیوں کی بنیاد سخت ذہنیت اور سخت گیری پر رکھیں۔ ایسے لوگ یہ اسلوبِ عمل اختیار کر کے تحریک کو نقصان پہنچانے میں شریک ہو جاتے ہیں۔ یعنی ایسے لوگ جو یہ چاہتے ہیں کہ تحریک اپنے اندر موجود سخت گیر اور مشکل آفریں قوتوں کی اسیر رہے' وہ اپنی تحریک کا گلا گھونٹنے میں دوسروں

کے حصے دار بن جاتے ہیں اور انہیں اسکی خبر بھی نہیں ہوتی۔

یہ تو تھا ایک پہلو' دوسرا پہلو یہ ہے کہ تحریک کی ابتدائی قیادت کے ہر فکری اور سیاسی موقف کو تقدس کا درجہ دینا اور اسے بڑھا چڑھا کر پیش کرنا لاشعوری طور پر یہ پیغام دیتا ہے کہ اس حد تک پہنچے ہوئے ارتقا اور پیشرفت کے بعد کسی مزید ارتقا اور پیشرفت کی گنجائش نہیں۔ ایسی صورت میں ہر نئی فکر کے خلاف ایک قسم کی نفسیاتی جنگ شروع ہو جاتی ہے اور اس کا استدلال اور بنیاد یہ ہوتی ہے کہ یہ فکر اس مقدس قیادت' یا مقدس مرحلے کی فکر سے مختلف ہے۔

یہ بات ذہن نشین رکھنے کی ضرورت ہے کہ تحریک کے ابتدائی قائدین کو احترام کی نظر سے دیکھنا' اور اُن کے مطلق تقدس کا قائل ہونا دو علیحدہ علیحدہ باتیں ہیں۔ کیونکہ مطلق تقدس بعد میں آنے والوں کو بت پرست بنا دیتا ہے' جبکہ اُن قائدین کا احترام انہیں ایک ایسا انسان بناتا ہے جس کے سامنے مستقبل کے لیے نئی قوتوں کی تربیت کے لیے عناصرِ قدرت واضح ہوتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ضمیمۂ احادیث (۴)

تجربے کے بارے میں

☆یقول الامام علی (علیه السلام): "الامور بالتجربة ' والاعمال بالخبرة."

امام علیؑ نے فرمایا: "ہر معاملے کے لیے تجربہ اور ہر عمل کے لیے علم درکار ہے۔"

☆ ویقول(ع): "التجارب علم مستفاد."

آپؑ ہی نے فرمایا: "تجربہ سودمند علم ہے۔"

☆ ویقول(ع): "من قلت تجربته خدع ' ومن کثرت تجربته قلت غرته."

آپؑ ہی نے فرمایا: "کم تجربہ کار انسان (جلد) فریب کھا جاتا ہے اور تجربے کی زیادتی انسان کی غفلت اور دھوکا کھانے میں کمی لاتی ہے۔"

☆ ویقول(ع): " کفی بالتجارب مودبا."

آپؑ ہی نے فرمایا: "تجربہ بہترین سبق ہے۔"

☆ ویقول(ع): "فی کل تجربة موعظة."

آپؑ ہی نے فرمایا: "ہر تجربے میں ایک نصیحت پوشیدہ ہے۔"

☆ ویقول(ع):"حفظ التجارب راس العقل."
آپؑ ہی نے فرمایا: "تجربات کو سامنے رکھنا عقل مندی کی اساس ہے۔"

جماعت کے بارے میں

☆ یقول الامام علی(ع): فی آخر وصیة لہ: "اوصیکم بتقوی اللہ ونظم امرکم."
امام علیؑ نے اپنی آخری وصیت میں فرمایا: "میں تمہیں پرہیزگاری اور امور ومعاملات میں نظم وتدبیر کی وصیت کرتا ہوں۔"

☆ ویقول(ع): "علیکم بالتمسک بحبل اللہ وعروتہ' وکونوا من حزب اللہ ورسولہ' الزموا عہداللہ ومیثاقہ علیکم فان الاسلام بداغریبا وسیعود غریبا."
آپؑ ہی نے فرمایا: "خدا کی رسی تھام لو' خدا اور رسول کی جماعت نہ چھوڑو' خدا سے کیا ہوا عہد و پیمان وفا کرو کہ اسلام جس طرح آغاز میں غریب تھا اسی طرح پھر سے غریب ہو جائے گا۔"

☆ وقال(ع): "ایسرک ان تکون من حزب اللہ الغالبین؟ اتق اللہ سبحانہ فی کل امرک فان اللہ مع الذین اتقوا والذین ھم محسنون."
آپؑ ہی نے فرمایا: "کیا تمہیں پسند ہے کہ تم بھی خدا کی غالب جماعت کے رکن بنو؟ پس تمام معاملات میں تقوائے الٰہی اختیار کرو کہ خدا متقی اور پرہیزگار لوگوں کا ناصر ومددگار ہے۔"

سیاست کے بارے میں

☆ عن الامام الصادق(علیہ السلام). عن الرسول (صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم): "صنفان من امتی اذا صلحا صلحت امتی' واذا فسدا فسدت.

قیل:یارسول الله ومن هما؟ قال :الفقهاء والامراء."

امام جعفر صادقؑ نے رسول اللہؐ سے منقول ایک حدیث میں فرمایا: ''اگر میری امت کے دو گروہ خیر پر رہیں گے، تو میری امت خوبی و بھلائی پر رہے گی اور اگر یہ دو گروہ فاسد ہو جائیں گے، تو اس کا نتیجہ امت کی تباہی کی صورت میں برآمد ہوگا۔ سوال ہوا: یہ دو گروہ کونسے ہیں؟ فرمایا فقہا اور حکمران۔''

☆ **وعن الصادق(ع):"العالم بزمانه لا تهجم عليه اللوابس."**

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے: ''جو شخص اپنے زمانے کے حالات سے باخبر ہو، وہ فتنوں کی یلغار کا شکار نہیں ہوگا۔''

☆ **وعن الرسول(ص):" من اصبح ولم يهتم باموالمسلمين فليس بمسلم."**

رسول اللہؐ سے منقول ہے: ''جو کوئی صبح کرے اور مسلمانوں کے معاملات کے بارے میں غور و فکر نہ کرے وہ مسلمان نہیں۔''

☆ **وقال الامام امير الومنين(ع):"آفة الزعماء ضعف السياسة."**

امیرالمومنین امام علیؑ نے فرمایا: ''حکمرانی کی آفت' کمزور سیاست ہے۔''

☆ **وقال(ع):"الملک سياسة."**

آپؑ ہی نے فرمایا: ''حکمرانی سیاست اور تدبیر کے بغیر نہیں ہوسکتی۔''

☆ **وقال(ع):"من قصر في السياسة صغرفي الرياسة."**

آپؑ ہی نے فرمایا: ''جو شخص سیاست اور تدبیر میں کوتاہی کرتا ہے' اسکی حکمرانی کمزور پڑ جاتی ہے۔''

☆ **وقال(ع):"ادل شی ء علی غزارة العقل حسن التدبير."**

آپؑ ہی نے فرمایا: ''عقلمندی کی بہترین علامت حسنِ تدبیر ہے۔''

☆ **وقال(ع):"العدل افضل السياستين."**

آپؑ ہی نے فرمایا: ''عدل و انصاف بہترین سیاستوں میں سے ہے۔''

☆ وقال(ع): "خیر السیاسات العدل."
آپؑ ہی نے فرمایا: "بہترین سیاست عدل ہے۔"

☆ وقال(ع): "بئس السیاسة الجور."
آپؑ ہی نے فرمایا: "ظلم و جور بُری سیاست ہے۔"

☆ وقال(ع): "ملاک السیاسة العدل."
آپؑ ہی نے فرمایا: "سیاست کی کسوٹی عدل ہے۔"

☆ وقال(ع): "سیاسة العدل فی ثلاث: لین فی حزم' واستقصاء فی عدل' وافضال فی قصد."
آپؑ ہی نے فرمایا: "عادلانہ سیاست تین چیزیں ہیں: احتیاط کے ساتھ نرم خوئی' توازن کے ساتھ تحقیق و تفتیش اور اعتدال میں رہتے ہوئے جود و بخشش۔"

☆ وقال(ع): "راس السیاسة استعمال الرفق."
آپؑ ہی نے فرمایا: "سیاست کی اساس نرمی اور ملاطفت سے کام لینا ہے۔"

☆ وقال(ع): "الرفق یفل حدالمخالفة."
آپؑ ہی نے فرمایا: "مہربانی اور نرمی مخالف کی دھار کند کر دیتی ہے۔"

☆ وقال(ع): "اذا ملکت فارفق."
آپؑ ہی نے فرمایا: "حکمرانی کے دوران نرمی اور مہربانی کو ملحوظ رکھو۔"

☆ وقال(ع): "الاحتمال زین السیاسة."
آپؑ ہی نے فرمایا: "بردباری سیاست کی زینت ہے۔"

☆ وقال(ع): "سیاسة النفس افضل سیاسة 'وریاسة العلم اشرف ریاسة."
آپؑ ہی نے فرمایا: "تدبیرِ نفس افضل ترین سیاست اور ریاستِ علم اشرف ترین ریاست ہے۔"

☆☆☆☆☆

۵

شرعی نقطۂ نظر

کھیل کود اور تفریح کی حقیقی مقدار

☆ ان جوانوں کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ جوانی کو کھیل کود، شب نشینی اور آوارگی جیسی چیزوں میں بسر کرنا چاہیے؟

O ہم جوانوں سے چاہتے ہیں کہ وہ ان مفاہیم کی حقیقت کو اچھی طرح درک کریں اور یہ سمجھیں کہ لہو (تفریح) کیا ہے؟ فضولیت کسے کہتے ہیں؟ لذت کس چیز کا نام ہے؟ خواہ وہ جنسی لذت ہو، کھانے پینے کی لذت ہو یا اور دوسری لذتیں جن کا تعلق انسانی جبلّتوں سے ہے۔

ہم جوانوں کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ لذتوں کے بارے میں غور و فکر کریں اور ان لذتوں کی مقدار کے متعلق سوال کریں؟

وقت سے تعلق رکھنے والی لذتوں کی مقدار صرف اسی لحظے تک محدود ہوتی ہے جس میں انسان ان سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ جنسی لذت صرف انہی لمحات میں منحصر ہوتی ہے جب اس کا احساس کیا جاتا ہے۔ کھانے کی لذت اتنی ہی دیر باقی رہتی ہے جتنی دیر لقمہ منھ میں رہتا ہے اور یہی صورت مشروبات وغیرہ کی لذتوں کی بھی ہے۔

عام طور پر جب تک انسان کو یہ لذتیں حاصل نہیں ہوتیں اس وقت تک وہ ان کے بارے میں سہانے خواب دیکھتا ہے۔ لیکن ان کے حصول کے بعد اپنے آپ کو ایک بند گلی میں کھڑا محسوس کرتا ہے۔ کیونکہ یہ لذتیں اگر چہ اسکی ضرورت ہیں لیکن اس کی منزلِ مقصود نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ حد سے زیادہ جنسی لذت میں غرق ہو جانے پر انسان ملال اور اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس حالت کی تکرار سے اسے سستی اور اضطراب محسوس ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح کھانے پینے کی حد سے زیادہ زیادتی اسے معدے کی تکلیف اور گھٹن میں مبتلا کر دیتی ہے۔

اس وضاحت کے ذریعے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ ان میں سے کوئی بھی چیز' جوان کی منزلِ مقصود نہیں' بلکہ یہ چیزیں صرف ایک مختصر مدت کے لیے لذت اور فرحت کا احساس دیتی ہیں اور یہ مختصر مدت گزر جانے اور فراغت کے بعد اسے ان لذتوں کی حقیقت کا ادراک ہوتا ہے۔

لٰہذا ہم جوانوں سے کہتے ہیں کہ آپ کی جوانی کا یہ دور' قوتِ حیات' میدانِ ہستی میں ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانے کی صلاحیتوں سے بھرپور مرحلے اور انسانی سرمایوں میں سے ایک سرمایہ ہے۔ ہم آپ سے یہ نہیں کہتے کہ اپنی احتیاجات کی تسکین کی کوشش نہ کیجیے لیکن یہ درخواست ضرور کرتے ہیں کہ اپنی ضروریات کی تسکین اس حد تک کیجیے کہ بغیر کسی نقصان کے آپ جسمانی طور پر صحیح وسالم رہیں۔

اپنی جسمانی ضروریات پوری کرنے کے ساتھ ساتھ یہ جاننا بھی آپ کے لیے لازم ہے کہ زندگی میں جوانی اور جوانی میں زندگی کا مسئلہ ان تمام مادّی امور سے زیادہ وسیع' ارفع اور احساسِ ذمے داری پیدا کرنے والا ہے جن میں آپ ڈوبے ہوتے ہیں اور جو آپ کے لیے سوائے ملال' بے مقصدی اور خالی پن کے احساس کے کوئی اور نتیجہ سامنے نہیں لاتے۔

لٰہذا' زندگی صرف جسم اور مادہ نہیں' جس کا کوئی ارفع اور بلند مقصد نہ ہو اور جو تازگی

اور حرارت سے عاری ہو۔ کیونکہ ''اللہ'' نام کی ایک مطلق ہستی پورے عالم میں ہر جگہ موجود ہے' اور پھر جب انسان اسکے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہے اور اسکے ارادے اور رضا کی بنیاد پر اپنی زندگی کی تنظیم کرتا ہے' تو اسے احساس ہوتا ہے کہ اب اسکے ارتقا اور کمال کی راہ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں اور وہی وہ واحد حقیقت ہے جس کی کوئی انتہا نہیں۔

لہٰذا ہم جوانوں سے کہتے ہیں کہ دل و جان سے خدا کے ہو جایئے' جس نے آپ کو خلق کیا ہے' جس نے آپ کو جوانی کی نعمت عطا کی ہے اور اسے حرکت' تازگی اور معنویت بخشی ہے اور یہ بات سمجھ لیجیے کہ یہ عاشقانہ سپردگی آپ کی روح' جسم نیز تمام تر رعنائیوں' جمال اور عمدہ آثار و ثمرات کے ساتھ آپ کی دینی زندگی کے لیے بھی باعثِ سعادت ہوگی۔

کھیل کود' جوانوں کی پسندیدہ سرگرمی

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ کچھ قسم کے کھیل انسان کا وقت ضائع کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی نظر میں صرف تیر اندازی' گھڑ سواری اور تیراکی ہی کھیل ہیں۔ نوجوانوں کی دلچسپیوں اور بہت زیادہ توجہات کے مرکز اس مسئلے کے بارے میں جنابِ عالی کیا فرماتے ہیں؟

○ کچھ لوگ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعض ایسی احادیث کے بارے میں جمود کا شکار ہیں جن کا تعلق اس خاص دور میں پیش آنے والے امور میں تربیت اور تیاری کے سلسلے سے ہے' جیسے آنحضرت کی یہ حدیث کہ: **لاسبق الا فی خف او نصل او حافر.** (سوائے تیر اندازی' گھڑ سواری اور اونٹ سواری کے کسی اور چیز میں مقابلہ اور شرط بازی جائز نہیں) اس حدیث میں تیر اندازی' گھڑ سواری اور اونٹ سواری جیسی چیزوں کی مشق کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے۔ اسی طرح بعض احادیث میں گھڑ سواری اور تیر اندازی کے ساتھ ساتھ تیراکی کے بارے میں بھی تاکید کی گئی ہے۔

مذکورہ نمونوں اور اس دور کی ضروریات کے بارے میں تحقیق اور تفتیش کے ذریعے ہم

اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ چیزیں (یعنی تیراندازی، گھڑسواری اور اونٹ سواری وغیرہ) اس دور کی جنگی ضروریات ہوا کرتی تھیں، اور حدیث میں ان کے تذکرے کا مقصد ان چیزوں کی اہمیت کی جانب اشارہ تھا جن کی اس دور کے لوگوں کو ضرورت تھی۔ اب ہمارے لیے یہ بات واضح ہے کہ اس دور میں مستعمل جنگی وسائل نے ترقی کر لی ہے اور اب تیر کی جگہ بندوق، توپ اور ٹینک نے لے لی ہے اور جانوروں (گھوڑے اور اونٹ) کی سواری کی جگہ بکتر بند گاڑیاں، ٹینک اور ہوائی جہاز لے چکے ہیں۔

پس دورِ حاضر میں تیراندازی اور گھڑسواری کے نعم البدل اختیار کیے جاسکتے ہیں اور ان میں ایسی چیزوں کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جو جسمانی طاقت اور روحانی راحت کا موجب ہوں، اور نوجوانوں کے اوقاتِ فراغت پُر کرنے کے ساتھ ساتھ مثبت اور مفید نتائج کے حامل بھی ہوں۔

لہٰذا ہمارے خیال میں کھیل کود صرف اوقاتِ فراغت پُر کرنے کا ہی ایک ذریعہ نہیں، بلکہ یہ بدن کی نشو ونما کا بھی ایک وسیلہ ہے۔ مزید یہ کہ اگر کھیل کی فضا پر اسپورٹ مین اسپرٹ حاکم ہو، تو پھر کھیل کود کو روح کی تربیت کا ایک ذریعہ بھی کہا جاسکتا ہے، جو انسان کے نفس کو اتنا ارتقا دیتا ہے کہ وہ دوسروں سے مقابلے کے ہر میدان میں شکست اور ہزیمت کو بغیر کسی داخلی کشمکش کے سکون و اطمینان کے ساتھ قبول کرتا ہے۔

ہمیں ان امور (ورزش اور تفریح کے دوسرے وسائل) کے مثبت نکات اور زمانے کی پیشرفت کے لحاظ سے اس سلسلے میں جو ذرائع، مواقع اور ماحول ایجاد کیے جاسکتے ہیں انہیں پیش نظر رکھتے ہوئے ان کے ترقی یافتہ طریقوں پر غور وفکر کرنا چاہیے۔

کھیل کود کی سرگرمیاں

☆ بعض لوگ کھیل کود کی سرگرمیوں میں جوش وخروش کا مظاہرہ کرتے ہیں، کھیلوں کا

اہتمام کرتے ہیں اور لوگوں کو ان میں شرکت اور کھلاڑیوں کو مقابلوں کی ترغیب دیتے ہیں۔ کچھ لوگ ان کے اس عمل کو معیوب سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں جنابِ عالی کی کیا رائے ہے؟

○ ہم ان سرگرمیوں میں کوئی منفی بات محسوس نہیں کرتے' بشرطیکہ انہیں بہت زیادہ عظمت کا حامل بنا کے پیش نہ کیا جائے اور یہ ایک گرانقدر فضیلت کا روپ نہ دھارلیں۔ کیونکہ اس صورت میں ان سے نوجوانوں کے لیے ان اہداف اور مثبت نتائج کا حصول مشکل ہو جاتا ہے جن کی سماج توقع رکھتا ہے۔

لہٰذا کھیل کود کی سرگرمیوں میں اس حد تک ڈوب جانا کہ یہ جوان کی صلاحیتوں اور اسکے عزائم اور آرزوؤں پر تسلط جمالیں' اُسے سیاسی' سماجی' علمی اور تہذیبی میدانوں میں موجود بنیادی اور بڑے بڑے امور کی انجام دہی سے باز رکھتا ہے۔

ہاں' اگر کھیل کود کی جانب توجہ اور اہتمام اس حد تک نہ پہنچے' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن اگر یہ کھیل کود خود ایک قدر و قیمت اختیار کر لے اور فضیلت بن جائے' تو ہم اسکے حامی نہیں۔ کیونکہ اس طرح نوجوانوں کے پاس موجود وقت کا بڑا حصہ ان سرگرمیوں کی نذر ہو جاتا ہے اور انسانیت کی بھلائی کے سلسلے میں کوششوں کے لیے ان کے پاس کافی وقت نہیں رہتا اور ان کوششوں سے حاصل ہو سکنے والے مثبت نتائج سے معاشرہ محروم رہتا ہے۔

☆ ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سی تنظیمیں اور عالمی سازشی ادارے جوانوں کو غافل رکھ کر اپنی سیاسی بساط بچھانے کے لیے ان مقبولِ عام ذرائع سے استفادہ کرتے ہیں۔ جنابِ عالی اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

○ اس بات سے ہم بھی ہوشیار کرنا چاہتے ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کبھی کبھی امریکہ اور یورپ کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی عوام کھیلوں کے مقابلوں میں ایسے مگن ہو جاتے ہیں کہ یہ چیزیں ان کی نگاہوں میں انتہائی اہمیت اور فضیلت اختیار کر لیتی ہیں اور ان کی تمام تر توجہات انہی چیزوں کی جانب مبذول ہو کے رہ جاتی ہیں' یہاں تک کہ انتہائی اہم سیاسی

اور معاشرتی امور پر توجہ اور ان کے بارے میں اہتمام ان کے لیے ثانوی حیثیت اختیار کر جاتے ہیں۔

اسی طرح تیسری دنیا کے بہت سے ممالک میں بھی حکمراں کوشش کرتے ہیں کہ جوانوں کو اہم اور حساس مسائل سے دور رکھا جائے اور معاشرے کو غافل رکھ کر ان مسائل کے بارے میں من مانے فیصلے کیے جائیں۔ کیونکہ معاشرہ کھیل کود' میلوں ٹھیلوں میں غرق ہوتا ہے اس لیے ان تمام حقیقی مسائل اور حساس معاملات کی اسے خبر ہی نہیں ہوتی اور قدرتی طور پر وہ ان سے علیحدہ رہتا ہے۔

گھڑ دوڑ دیکھنا

☆ معروف ہے کہ گھڑ دوڑ کے مقابلوں کو جوئے اور شرط بازی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایسے مقابلوں کو صرف دیکھنے کا کیا حکم ہے؟

O ہمارے خیال میں گھڑ سواری ان کاموں میں سے ہے جن کی حوصلہ افزائی کی جانی چاہیے۔ کیونکہ یہ ورزش جنگ اور اسی کی مانند دوسرے میدانوں کی ضرورت کے لیے انسان کی قوت و توانائی میں اضافہ کرتی ہے' نیز مختلف دوسرے پہلوؤں سے بھی مثبت نتائج و آثار کی حامل ہے۔ لیکن جب گھڑ سواری کے مقابلوں کے ذریعے جوا کھیلا جانے لگے' تو یہ حرام کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں اور اسی طرح منفی اثرات و نتائج کا موجب بنتے ہیں جس طرح ہر دوسری قسم کے جوئے میں مرتب ہوتے ہیں۔

بے شک ایسی ورزشوں اور مقابلوں میں شرط باندھنا انتہائی فضول عمل ہے۔ کیونکہ اس میں مقابلہ درحقیقت اس بات پر ہوتا ہے کہ کون سا گھوڑا دوسرے گھوڑے یا گھوڑوں سے سبقت لے جائے گا۔ سچ بتایئے کیا یہ ایک بچکانہ فعل نہیں؟ کیا اسکے اندر انسانوں کے لیے پسندیدہ اور مفید مسابقت کی کوئی علامت پائی جاتی ہے؟

لہٰذا ممکن ہے کہ ایسے ماحول میں آمد و رفت اور ایسے مقابلوں کے تماشے میں انسان کو مزہ آنے لگے اور رفتہ رفتہ اس ماحول کا عادی ہو جانے کے نتیجے میں وہ گھڑ دوڑ کے مقابلوں اور اس پر جوئے کو معمول کی بات سمجھنے لگے اور آخر کار خود بھی عملاً اس میں شریک ہونے لگے۔

اس بنا پر ہم با ایمان جوانوں کو ایسی فضولیات سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہر چند وہ ان مقابلوں میں شریک نہ ہوتے ہوں اور صرف تماش بین کی حیثیت سے شرکت کرتے ہوں۔ اس سلسلے میں ہم انہیں بعض احادیث کی جانب متوجہ کرتے ہیں جن میں فرمایا گیا ہے کہ: **المحرمات حمی الله فمن حام حول الحمی اوشک ان یقع فیه** (محرماتِ الٰہی' خدا کی قرار دی ہوئی ممنوعہ حدود ہیں' جو کوئی ان ممنوعہ حدوں کے قریب جائے گا' اسکے ان میں گر پڑنے کا امکان ہے)

جدید فیشن

☆ بہت سے لوگ طرح طرح کے ملبوسات اور جدید فیشن پر اعتراض کرتے ہیں۔ شرعی لحاظ سے کسی لباس کے جائز یا ناجائز ہونے کا پیمانہ اور معیار کیا ہے؟

○ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ مختلف ملبوسات اور جدید فیشن کے بارے میں اسلامی شریعت کوئی منفی رائے نہیں رکھتی۔ مختلف معاشروں میں زندگی بسر کرنے والے انسانوں کا معمول ہے کہ وہ کسی ایک یا دوسری شکل کا لباس زیبِ تن کرتے ہیں۔ لہٰذا اسلام اس مسئلے میں سخت گیری سے کام نہیں لیتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کفار کا مشابہ لباس پہننا حرام ہے۔ لیکن جب ہم اس مسئلے کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ اس حکم کا تعلق اُس خاص زمانے سے تھا جب مسلمانوں کی تعداد قلیل اور کفار انتہائی اکثریت میں تھے اور اس حکم کا مقصد یہ تھا

کہ دونوں کا امتیاز ظاہر رہے۔ جیسا کہ ہم نہج البلاغہ میں پڑھتے ہیں کہ جب حضرت علیؑ سے سوال کیا گیا کہ رسول اللہؐ نے فرمایا ہے:

"غیروا الشیب' ولا تشبھوا بالیھود."

"بڑھاپے کو خضاب کے ذریعے بدل دو اور یہود سے مشابہت اختیار نہ کرو۔"

لہٰذا کیا ہم پر اپنے بالوں کو خضاب کرنا واجب ہے؟

تو امیر المومنینؑ نے جواب دیا:

"انما قال صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ذلک والدین قل' فاما الان وقد اتسع نطاقه' وضرب بجرانه' فامرؤ وما اختار."

"یہ اس دور کے لیے فرمایا گیا تھا جب اہلِ دین کم تھے لیکن آج جبکہ اسلام کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے اور وہ سینہ ٹیک کر جم چکا ہے تو ہر شخص کو اختیار ہے۔"

(نہج البلاغہ۔ کلماتِ قصار ۱۶)

یعنی کیونکہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافہ ہو چکا ہے' لہٰذا اب دوسروں سے ان کی علیحدہ شناخت کوئی مسئلہ نہیں رہی ہے۔

اسی طرح حدیثِ پیغمبرؐ: حفوا الشوارب واعفوا عن اللحی ولا تشبھوا بالیھود. (اپنی مونچھوں کو چھوٹا کرو اور داڑھی کو چھوڑ دو (بڑھاؤ) اور یہودیوں کی شباہت اختیار نہ کرو) کے بارے میں بعض فقہا کا کہنا ہے کہ یہ حکم ایک خاص زمانے سے مخصوص تھا اور اس کا مقصد بعض اجتماعی مصلحتوں کی بنا پر یہودیوں سے مسلمانوں کے امتیاز اور علیحدہ شناخت کو قائم رکھنا تھا۔ لہٰذا یہ فقہا اسے ایک ثابت اور دائمی حکمِ شرعی کی بنیاد نہیں سمجھتے۔

آج جبکہ مسلمان دنیا میں کثیر تعداد میں پائے جاتے ہیں' تو یہودیوں یا مجوسیوں سے ان کی شباہت کا مسئلہ موجود نہیں اور یہ مسائل عملاً خود لوگوں کے انتخاب سے متعلق ہو چکے ہیں کہ وہ ان میں سے جسے چاہیں منتخب کریں۔

خواتین کا پردہ

☆ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فی زمانہ جو بھی شرعی حجاب کے عنوان سے رائج ہے وہ کافی نہیں ان لوگوں کے بقول صرف "چادر" ہی شرعی حجاب ہے اس بارے میں جناب عالی کی رائے کیا ہے؟

○ حجاب ایک شرعی مفہوم ہے جس میں دو نکات شامل ہیں:

۱۔ بدن جس کا اجنبیوں کے سامنے ظاہر کرنا خداوند عالم نے حرام قرار دیا ہے۔

۲۔ بناؤ سنگھار اور لوگوں کی تحریک کا سبب بننے سے پرہیز۔

لہٰذا خواتین جب ایسے مقامات پر جائیں جہاں مرد و زن دونوں موجود ہوتے ہیں تو انہیں ایسا لباس استعمال کرنا چاہیے جو ان کے جسم کے کسی حصے کو ظاہر نہ ہونے دے اسی طرح لباس اس انداز کا بھی نہ ہو کہ جنسی جذبات کی تحریک کا موجب بنے اور خواتین کو غیر شریفانہ نگاہوں کا مرکز بنادے ـــــ جس کسی لباس میں بھی یہ دونوں چیزیں پائی جائیں "وہ شرعی لباس سمجھا جائے گا۔

اس بنا پر ہم چادر یا برقعہ وغیرہ پر زور نہیں دیتے کیونکہ ان چیزوں کو لوگوں نے اپنے خاص معاشرتی حالات اور اقدار و رسوم کی تقلید میں ایجاد کیا ہے۔

اس سلسلے میں اہمیت اس بات کو حاصل ہے کہ عورت وقار و متانت کے ساتھ شرع کی مقرر کردہ حدود کا خیال رکھتے ہوئے "نسوانیت" کی نمائش کرتے ہوئے نہیں بلکہ انسانیت کا مظہر بنتے ہوئے گھر سے نکلے اور مقامات پر جائے۔ اگر لباس میں ان دو شرائط کو پیش نظر رکھا گیا ہو تو پھر مختلف علاقوں کے لیے تو مختلف شکل کے لباس پہنا اس حد تک مناسب ہیں۔

فیشن کے مطابق پردہ

☆ بلاشبہ بہت سے لباس پردے کی شرائط پر پورا اترتے ہیں لیکن بعض خواتین

کی کوشش ہوتی ہے کہ حجاب اور زنانہ لباس کے نت نئے فیشن کو یکجا کر کے اختیار کریں۔ جنابِ عالی اس مسئلے کو کس نظر سے دیکھتے ہیں؟

O ان بہنوں کے اس رجحان کی بنا پر کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ان کا حجاب ان کے وقار کا عکاس ہونے کی بجائے مردوں کی تحریک کے ذریعے میں بدل جاتا ہے۔ کیونکہ زمانے کی ہواؤں کے ساتھ چلنے کا یہ رجحان' جو اس قسم کے لباسوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے' اس بات کی علامت ہے کہ یہ خاتون احساسِ کمتری کا شکار ہے۔ اور اسکے ازالے کے لیے دوسروں کی نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتی ہے' اور اس مقصد کے لیے ایسے حلیے میں گھر سے باہر نکلتی ہے جس سے نوجوانوں کی مرکزِ نگاہ بن جائے۔ یہ نفسیاتی اور ذہنی مرض لازماً اتنا بڑھ جاتا ہے کہ جس مقصد کے پیشِ نظر حجاب کی تاکید کی گئی ہے حجاب کو اس سے متضاد حالت میں تبدیل کر دیتا ہے۔

لباسِ شہرت

☆ لباسِ شہرت سے کیا مراد ہے؟ اور اسے پہننا کیوں حرام قرار دیا گیا ہے؟

O لباسِ شہرت سے مراد وہ لباس ہے جسے پہننا عام طور پر انسان کے معاشرتی مقام سے سازگار اور موافق نہ ہو۔ مثلاً کوئی مرد عورتوں جیسا لباس پہن لے' یا کوئی عورت مردوں کا سا لباس پہن لے۔ البتہ یہ لباس ایسا نہ ہو جس کا استعمال عورتوں اور مردوں میں مشترکہ طور پر رائج ہو۔ جیسے کہ آج کے دور میں پتلون کو مردوں کا مخصوص لباس نہیں سمجھا جاتا' بلکہ (دنیا کے ایک بڑے حصے میں) معمولاً زن و مرد دونوں ہی اسے پہنتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی لباس خواتین کے لیے مخصوص سمجھا جاتا ہو' یا کوئی لباس صرف مردوں سے مخصوص قرار دیا جاتا ہو' تو پھر نہ عورتوں کا ایسا لباس مردوں کو پہننا چاہیے اور نہ مردوں کا ایسا لباس عورتوں کو استعمال کرنا چاہیے۔ اس امر کی دلیل وہ حدیث ہے جس میں مردوں اور عورتوں کو ایک دوسرے کا

لباس پہننے سے منع کیا گیا ہے۔

اس حکم کا مقصد لوگوں کو نفسیاتی پیچیدگیوں کا شکار کیے بغیر معاشرے میں اعتدال و توازن کا قیام ہے۔

اسلامی پردے کی خصوصیات

☆ اسلامی حجاب (شرعی پردے) کی کیا خصوصیات ہیں؟

○ اس سلسلے میں دو عنوانات ہیں:

پہلا عنوان ستر یا پوشش ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ عورت چہرے اور کلائی تک ہاتھوں کے سوا اپنا پورا بدن ڈھانپ کر رکھے لیکن اس مسئلے میں بعض علما احتیاط کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہاتھوں اور چہرے کا چھپانا بھی واجب سمجھتے ہیں۔ البتہ ہم علما کی اکثریت کی رائے سے متفق ہیں جو عورت کے ہاتھوں اور چہرے کے کھلے رکھنے کو جائز قرار دیتے ہیں اور اپنی رائے کی سند اس آیۂ کریمہ کو قرار دیتے ہیں جس میں ارشاد الٰہی ہے: وَلَا يُبْدِينَ زِينَتَهُنَّ إِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔ (اور اپنی زینت ظاہر نہ کریں سوائے اس کے جو از خود ظاہر ہے۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۱)

لہٰذا عورت پر اپنا تمام بدن چھپانا واجب ہے۔ اسے چاہیے کہ ایسا لباس پہنے جو اس کے بدن کو اچھی طرح ڈھانپ لے اور اس کے جسم کی نمائش نہ کرے۔

دوسرا عنوان خودنمائی اور زینت کے اظہار سے پرہیز ہے۔ اس لیے کہ خداوند عالم کا فرمان ہے: وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ (اور پہلی جاہلیت کی طرح اپنی زینت ظاہر نہ کرو۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۳)

لہٰذا گھر سے باہر نکلنے والی عورت کو صرف اپنا بدن چھپانے پر اکتفا نہیں کرنا چاہیے بلکہ اگر اس نے بدن کو تو ڈھانپ لیا ہو لیکن ہاتھوں اور چہرے کا میک اپ کیا ہوا ہے تو

زیبائش وآرائش کے وسائل اور زیب وزینت کا سبب بننے والے لباس سے خود کو آراستہ کیا ہوا ہے' تو اسکے لیے مخلوط محافل اور مقامات پر جانا جائز نہیں۔ کیونکہ ان چیزوں کا شمار زیب و زینت کو ظاہر کرنے اور خود نمائی میں ہوتا ہے اور یہ عمل نقصان دہ صورت میں عورت کی نسوانیت کو نمایاں کرتا ہے' اسکی انسانیت کا طبیعی اظہار نہیں ہے۔

ہم زینت کی حدود حدود کو تفصیل کے ساتھ معین اور واضح نہیں کر سکتے۔ لیکن عرفِ عام سمجھتا ہے کہ زینت کیا ہے اور خود نمائی کے کیا معنی ہیں۔ خود نمائی ''تبرج'' عورت سے ظاہر ہونے والی ایک غیر معمولی حالت کا نام ہے' جس کے ذریعے وہ خود اپنے آپ کو اور اپنے حسن وجمال کو لوگوں کی نگاہوں کے سامنے پیش کر کے انہیں دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔

اسلام مرد اور عورت دونوں سے چاہتا ہے کہ اپنے اپنے مخصوص لباس کے ساتھ معاشرے میں ظاہر ہوں۔ تا کہ مخلوط محافل نت نئے ملبوسات' زیب وزینت کی نمائش اور جنسی تحریک کے میدان نہ بن سکیں۔

یہاں تک ہم نے شرعی حجاب کے دو بنیادی عنوانات کی وضاحت کی۔ اب یہاں ایک تیسرے پہلو کی جانب اشارہ کریں گے' جو معنی ومفہوم کے اعتبار سے تو حجاب سے مربوط ہے لیکن شکل میں شاید حجاب سے متعلق نہ ہو۔ اور یہ تیسرا پہلو ہے ''حجاب الصوت'' یعنی آواز کا پردہ (اگر یہ تعبیر درست ہو) اسلام عورت کو مردوں سے گفتگو کرنے اور ان کے سامنے خطاب کرنے سے منع نہیں کرتا' اسی طرح ان سیاسی اور اجتماعی مراسم میں جہاں اسے شرکت کی دعوت دی گئی ہو نعرے بلند کرنے اور جب عوام الناس میں جوش وخروش ابھارنا مقصود ہو تو وہاں گفتگو کرنے سے نہیں روکتا۔ لیکن اسلام اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ عورت اپنی آواز کو اس درجہ نرم و نازک بنائے کہ وہ دوسروں کے نفسانی احساسات میں ہیجان پیدا کرنے لگے۔ قرآنِ کریم میں اس بات کو اس طرح بیان کیا گیا ہے: فَلَا تَخۡضَعۡنَ بِالۡقَوۡلِ فَيَطۡمَعَ الَّذِىۡ فِىۡ قَلۡبِهٖ مَرَضٌ. (لہٰذا ایسے ناز وانداز سے گفتگو نہ کرنا

کہ جس کے دل میں مرض ہو اسے لالچ پیدا ہو جائے۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۲
کیونکہ عورت کا نرم اور شیریں زبان میں گفتگو کرنا فریبی اور فتنہ گر انداز میں صنفِ مخالف کے ہیجان میں اضافے اور اس عورت کی جانب اسکی کشش کا سبب بنتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہ فرماتے ہیں: عورت کے لیے اپنی آواز کو اس قدر خوش آہنگ، نرم و نازک اور شیریں بنانا جائز نہیں جو مردوں میں تحریک اور ہیجان کا سبب ہو۔ اسی چیز کو ہم نے ''آواز کے پردے'' کا نام دیا ہے۔

معاشرتی حجاب

اگر ہم حجاب (پردے) کے بارے میں اسلامی تعلیمات کو بہتر طور پر سمجھنا چاہتے ہیں، تو ہمیں اپنی گفتگو کا رُخ ''معاشرتی حجاب'' کے موضوع کی جانب موڑنا پڑے گا۔

اسلام عورت کے مردوں کے ساتھ ایسے حالات میں تنہا ہونے کو ناپسند کرتا ہے جہاں اسکے کردار و اخلاق اور پاک دامنی کو خطرہ ہو۔ کیونکہ اس تنہائی کے نتیجے میں کچھ ایسے خیالات، تصورات اور احساسات ابھرتے ہیں جو ان دونوں کے کردار و اخلاق کے لیے مناسب نہیں ہوتے۔

ہم جانتے ہیں کہ مرد اور عورت کا تنہائی میں ملنا (بالخصوص جب یہ ملاقاتیں دوستانہ ماحول میں ہوں) خواہ اخلاقی زوال و انحطاط کے مرحلے تک نہ پہنچے، لیکن اخلاقی خرابی کے دروازے کھول سکتا ہے۔ یہ چیز اسلام کی نظر میں مرد و زن دونوں کے لیے ناپسندیدہ ہے اور اگر اس میل ملاپ میں ایسا ماحول پیدا ہو جائے جو طبیعی طور پر ارتکابِ حرام پر منتہی ہو، تو یہ عمل (تنہائی میں میل جول) شرعاً حرام ہے۔

اب ہم دو جنسوں (مرد و زن) کے اختلاط کے موضوع پر گفتگو کی جانب آتے ہیں۔
اسلام نے مرد و زن کے میل ملاپ کو بطورِ مطلق حرام قرار نہیں دیا ہے، بلکہ اسلام

ایسے میل جول کو حرام سمجھتا ہے جس کا انجام فتنہ وفساد کی صورت میں ظاہر ہو۔ اور ایسے میل ملاپ کو کراہت اور ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے جو اخلاقی لحاظ سے ناپسندیدہ بعض امور کو ابھارنے کا سبب بنے۔ لہٰذا آج جبکہ ہم عملاً مرد وزن کے باہمی میل جول کو روکنے سے عاجز ہیں' پسندیدہ بات یہ ہے کہ مومن خواتین انحراف اور گمراہی کا موجب ہونے والے میل ملاپ اور منفی عواقب سے مبرہ مثبت نتائج کے حامل میل جول کے درمیان فرق قائم کریں۔

اس مقام پر ہم مذکورہ بالا گفتگو سے حاصل ہونے والے ایک اہم نکتے کا ذکر ضروری سمجھتے ہیں اور وہ نکتہ یہ ہے کہ عورت کو چاہیے کہ حجاب کو اپنی شخصیت میں مجسم کر لے اور وہ اس طرح کہ اپنے تصورات' جذبات اور افکار میں ایسی پختگی پیدا کر لے جو اسکے لیے اس بات کا امکان فراہم کر دے کہ وہ طبیعی طور پر زندگی کے حقائق اور جنسِ مخالف کا سامنا کر سکے' کسی بھی صورت میں گمراہ کن افکار کو اپنے ذہن پر تسلط جمانے کا موقع نہ دے' اسی طرح جیسے وہ معاشرے میں دوسرے افراد کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہوئے خود کو اخلاق کے راستے سے ہٹنے کی اجازت نہیں دیتی۔

زنا کار کی ذہنیت

بعض احادیث میں ملتا ہے کہ: "زنا العین النظر" یعنی آنکھ کا زنا (ناپاک نظر) ہے' "زنا الاذن السمع" یعنی کان کا زنا (حرام آواز) کا سننا ہے اور "زنا الید اللمس" یعنی ہاتھ کا زنا (نامحرم کے بدن) کو چھونا ہے۔

ان احادیث سے استفادہ ہوتا ہے کہ بعض انسان باوجود یہ کہ زنا کے ناپسندیدہ اور قبیح عمل کے مرتکب نہیں ہوتے' لیکن ذہنی طور پر زانی ہوتے ہیں۔ جیسے کہ وہ بہت سے افراد جو عملاً تو کسی بدعملی کے ارتکاب پر کنٹرول حاصل کر لیتے ہیں لیکن روحانی اور نفسانی لحاظ سے اس کنٹرول کے برخلاف چلتے ہیں۔ بہت سے لوگ روحانی اور نفسانی لحاظ سے

زانی ہوتے ہیں لیکن زنا کے مرتکب نہیں ہوئے ہوتے یا اندورنی طور پر خائن ہوتے
لیکن خیانت کا ارتکاب نہیں کیے ہوتے۔ کیونکہ ان افراد کی یہ تمنائیں' خواہشیں
آرزوئیں ان کے نفس کی حد تک محدود رہتی ہیں اور صرف اسی وقت جامۂ عمل پہنتی
جب خارج میں انہیں مساعد اور سازگار حالات میسّر ہوں۔ اگر انسان اندرونی طور
بُرائی کی جانب مائل ہو' تو بیرونی اور خارجی حالات کا سازگار ہونا اسے بہت جلد
ارتکاب کی جانب لے جاتا ہے۔

حجابِ ذہنی

لہٰذا مرد بھی گمراہ کن افکار و خیالات سے دور رہنے کے لیے اسی طرح ''حجابِ ذہ
کی ایک حالت کا محتاج ہے جس طرح عورت کو اسکی ضرورت ہے۔ اس مرحلے پر ہم محسو
کرتے ہیں کہ اس مقصد کے حصول کے لیے کارآمد عملی ذریعہ عورت اور مرد دونوں کو تم
ہیجان انگیز مواقع اور عناصر سے دور رکھنا اور انہیں تحریک انگیز لٹریچر کے مطالعے اور ہیجان
فلموں کو دیکھنے کی اجازت نہ دینا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام میں جنسی تحریک کا سبب بننے والی فلموں اور ہیجان خیز داستانو
اور مناظر سے احتیاط کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ کیونکہ یہ عوامل انسان کے اندر ایک خا
نفسانی حالت پیدا کرتے ہیں' اور ہر چند کہ انسان اسکے خلاف مضبوط قدم اٹھا سکتا ہوا
اسکے مقابل اسکے قدموں میں لغزش پیدا نہ ہو' لیکن اسکے باوجود یہ اسکے اندر پائی جانے وا
رکاوٹوں کو توڑ پھوڑ دیتے ہیں' یہاں تک کہ اگر خارجی حالات سازگار ہو جائیں' تو یہ اندرو
نفسانی حالت بہت تیزی کے ساتھ اسے گمراہی کی سمت لے جا سکتی ہے۔

حجاب کا اپنے معنی کھو دینا

لہٰذا مسلمان عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ حجاب کو ایک خشک' بے روح اور تقلید

نگاہ سے نہ دیکھے اور صرف اسکی ظاہری صورت سے چمٹ کر نہ رہ جائے۔ یہ وہ حالت ہے جس کا مشاہدہ ہم بکثرت پردہ دار خواتین میں کر رہے ہیں۔ جو ظاہری طور پر تو پردہ دار ہیں' اپنے جسم کو چھپا کر رکھتی ہیں' لیکن ان کا یہ پردہ حجاب کی روح اور معنویت سے خالی ہوتا ہے' وہ اس طرح کہ یہ خواتین اپنے حجاب کے لیے ایسے بھڑکیلے اور تحریک انگیز رنگوں والے کپڑے استعمال کرتی ہیں جو ان کے جسم کو ایک خاص قسم کی خوبصورتی بخشتے ہیں۔ اور اسی طرح کے دوسرے کام بھی یہ خواتین کرتی ہیں جن کے ذریعے ان کے بدن کے ڈھکے ہونے کے باوجود ان کا نسوانی حسن اس طرح ظاہر ہوتا ہے جیسے وہ بے پردہ ہوں۔

یہاں یہ تاکید کرنا ضروری ہے کہ اسلام عورت سے اسکی نسوانیت کے احساس کا خاتمہ نہیں چاہتا' کیونکہ یہ اس کا فطری احساس ہے۔ بلکہ یہ چاہتا ہے کہ عورت اس احساس کو ایک خاص دائرے میں رکھے' تاکہ اس طرح ایک طرف تو وہ اخلاقی ضوابط کے لحاظ سے اسکی نسوانیت پر منفی اثرات نہ چھوڑے اور دوسری طرف معاشرے کے اخلاق پر ناپسندیدہ اثرات مرتب نہ کرے۔

حجاب مغرب کی نگاہ میں

☆ مغرب' حجاب کے مسئلے میں اسلام پر انتہا پسندی کا الزام لگاتا ہے۔ کیونکہ اہلِ مغرب کے خیال میں اگر کوئی عورت بغیر سنگھار کیے ہوئے بے حجاب گھر سے باہر نکلے' تو مرد کی تحریک اور ہیجان خیزی کا سبب نہیں بنتی۔ اس بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

O ایک دلیل کی بنا پر اہلِ مغرب کی یہ منطق گہری اور حقیقت سے قریب منطق نہیں۔ وہ دلیل یہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں عورت اپنی زنانہ لطافت و نزاکت کی وجہ سے بغیر کسی زیب و زینت کے بھی مرد کو اپنی طرف مائل کرتی ہے' ایسے ہی جیسے مرد عورت کے لیے جاذب ہوتا ہے' کیونکہ مرد کی جبلّت (instict) اسے عورت کی طرف تمایل پر ابھارتی ہے اور جب

جبلّت اپنے اظہار اور جنسی تسکین کے نقطے پر پہنچ جاتی ہے' تو اس حالت کے لیے مطلوب بہت سے عناصر فراہم کر لیتی ہے۔

اسی طرح ہمارا خیال ہے کہ عورت کی زنانگی' یعنی نرمی اور نزاکت فطری طور پر اُسے حسن اور زیبائی بخشتی ہے' جس طرح مرد کا ٹھوس اور توانا ہونا اسے ایک خاص حسن دیتا ہے۔ لہٰذا اس قول میں گہرائی نہیں کہ حجاب یا بے حجابی سے جنسی تحریک اور ہیجان کا کوئی تعلق نہیں۔ اسی لیے ہم سمجھتے ہیں کہ وہ زیبائی جو بے حجابی کے ذریعے عورت کو ملتی ہے اس زیبائی سے مختلف ہے جو حجاب اسے دیتا ہے۔ کیونکہ مثلاً عورت کے بالوں کا ایک خاص حسن ہوتا ہے' جس کے ذریعے ممکن ہے اسکی خوبصورتی میں اور اضافہ ہو جائے۔ اسی طرح دوسرے اعضائے بدن جیسے پنڈلیوں کا مخصوص حسن ہوتا ہے' جو بدن کو ایک خاص تاثیر دیتا ہے۔ اس چیز کا مشاہدہ ہم ذرائع ابلاغ سے نشر ہونے والے اشتہارات کی پالیسی میں کرتے ہیں' جن میں عورت کے بالوں اور پنڈلیوں کی فطری خوبصورتی کے ذریعے توجہات حاصل کی جاتی ہیں۔

لہٰذا یہ طریقہ ایک طرف تو ضمیر اور وجدان کے خلاف ہے اور دوسری طرف اس لیے ناقابلِ قبول ہے کہ مغرب جن فکری قواعد اور اصولوں کی بنیاد پر زندگی بسر کرتا ہے وہ ان اصول و قواعد سے متضاد ہیں جن پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ مثلاً مغرب مطلق اور بے لگام آزادی پر یقین رکھتا ہے' جس میں مرد و زن کی جنسی آزادی بھی شامل ہے۔ لہٰذا وہاں حجاب کا کوئی مفہوم نہیں۔ کیونکہ حجاب گمراہی کا موجب بننے والے عوامل کی روک تھام اور نظم وضبط اور توازن کے لیے مساعد اور سازگار ماحول ایجاد کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ ایک ایسے معاشرے میں حجاب کو منفور اور ناپسندیدہ نگاہ ہی سے دیکھا جائے گا جہاں لوگ اس نظریے کے حامل ہوں کہ ''مرد و زن اپنے بدن کے بارے میں آزاد ہیں'' کیونکہ وہ آزادی کے بارے میں جس فکری اور فلسفی قاعدے کے قائل ہیں اس میں عریانی اور بے حجابی بغیر کسی

حرمت کے ایک معمول کی حالت ہے۔

حجاب' قاعدۂ عفت (پاک دامنی) کی اساس پر

لیکن مسلمانوں کے یہاں حجاب کی بنیاد عفت و پاک دامنی کا اصول ہے' جسے خدا نے مسلمان مرد وزن پر فرض کیا ہے' اوران سے چاہا ہے کہ وہ ان قواعد وضوابط کے دائرے میں رہیں جو انہیں اس شدید نقصان سے بچاتے ہیں جو خواہشاتِ نفس کے شعلوں کی لپیٹ میں آنے کی صورت میں انہیں لاحق ہوسکتا ہے۔

ایک اور مسئلہ جس پر گفتگو ہم ضروری سمجھتے ہیں' وہ یہ ہے کہ مشرق اور مغرب میں اخلاق کی بنیاد کیا ہے؟ کیا اس معاشرے کے اخلاقی اصول مرد وزن کو مکمل آزادی دیتے ہیں کہ وہ جس طرح چاہیں اپنے بدن کے ساتھ عمل کریں۔ یا یہ کہ اس بارے میں ان کے لیے کچھ اصول وضوابط وضع کیے گئے ہیں؟ اور یہی حجاب اور بے حجابی کی سرحد ہے۔

شاید بہت سی مشرقی خواتین کی مشکل یہ ہے کہ وہ مرد اور عورت کے تعلق میں عفت و پاک دامنی کے اصول کی قائل ہیں' لیکن اسکے باوجود' بے حجابی اور خود آرائی جیسے مسائل میں مغرب کی تقلید کرتی ہیں۔ یہ امر اُن میں دورُخہ پن پیدا کر دیتا ہے اور مرد وزن کی گمراہی کا سبب بننے والا جو ماحول انہوں نے خود اپنے ہاتھوں بنایا ہوتا ہے اسکے نتیجے میں وہ اپنی معاشرتی حیثیت کو برباد کر بیٹھتی ہیں۔ اسکے بعد اپنی عزت وشرف کی حفاظت اور اپنے دامن سے ذلت وننگ کا داغ دھونے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایسی ہی خواتین پر شاعر کے اس شعر کا اطلاق ہوتا ہے:

القاہ فی الیم مکتوفا و قال لہ
ایاک ایاک ان تبتل بالماء

''اسے ہاتھ باندھ کر دریا میں پھینکنے کے بعد کہہ رہے ہیں کہ خبردار خبردار پانی

سے گیلے نہ ہو جانا۔"

حجاب اور فطری خواہش کو کچل دینا

☆ ایک اور اعتراض جو اس بارے میں کیا جاتا ہے' وہ یہ ہے کہ حجاب مرد کی فطری خواہش کو کچل دینے والا عامل ہے' کیونکہ حجاب کے نتیجے میں مرد سادہ اور معمولی باتوں پر بھی شدید تحریک میں آ جاتا ہے۔ جنابِ عالی' اس بارے میں کیا فرماتے ہیں؟

○ اس بارے میں گفتگو کرتے ہوئے ہمارے پیش نظر یہ بات رہنی چاہیے کہ فطری خواہش کچل دینے والا عامل ''حجاب'' نہیں' بلکہ اسکی وجہ مرد کی فطری خواہشات کی تسکین نہ ہونا ہے۔

یعنی فطری خواہش کا کچل جانا ان خارجی حالات کا نتیجہ ہوتا ہے جو انسان کی نفسانی فضا اور فطری خواہش سے متضاد ہوتے ہیں ۔فطری خواہش اپنی تسکین چاہتی ہے لیکن خارجی حالات اسکی تسکین نہیں ہونے دیتے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں فطری خواہش کچلی جاتی ہے' کیونکہ عورت مرد کی فطری احتیاجات کی تسکین پر پابندی لگاتی ہے اور اسکے برعکس صورت پیش آنے پر عورت کی فطری خواہش کچلی جاتی ہے۔

یہاں ایک بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ کسی عقدے (complex) کے نتیجے میں فطری خواہش کے کچلنے اور معاشرتی حیات کی تنظیم کے نتیجے میں فطری خواہش کے کچلے جانے کے درمیان بہت فرق ہے۔ ہم معتقد ہیں کہ تمام اخلاقی' اجتماعی اور سیاسی اصول وضوابط ہر ایسے انسان کے اندر عقدہ (Complex) ایجاد کرنے کا موجب ہو سکتے ہیں جو اپنی من مانی چاہتا ہے۔ لہٰذا اگر ہم اصول وضوابط کو فطری خواہش کی سرکوبی کا سبب بننے والا منفی عامل سمجھتے ہوں' تو ہمیں معاشرتی حیات میں ہرج ومرج' بد نظمی' بے انتظامی اور لاقانونیت کو قبول کرنا چاہیے' تاکہ کسی کو بھی کسی قسم کی روک ٹوک' حدود وقیود کا سامنا نہ کرنا پڑے۔

فطری طور پر ہر معاشرہ اپنی تنظیم کے لیے خاص اخلاقیات اپناتا ہے۔ ممکن ہے ان میں کبھی جنسی اخلاق شامل نہ ہو' لیکن معاشرتی اور اقتصادی اخلاقیات سے فرار ممکن نہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ جنسی اخلاق میں مرد و زن کا یک دوسرے سے دور رہنا شامل نہ ہو' بلکہ ان کے درمیان بے روک ٹوک تعلقات کو جواز حاصل ہو۔

اگر ہم یہ کہیں کہ اسلامی حجاب فطری خواہش کی سرکوبی کا موجب ہے' تو پھر بے حجابی کے بارے میں ہمیں کیا کہنا چاہیے؟ کیا یہ فطری خواہش کی سرکوبی کا سبب نہیں ہوتی؟ کیا جوان لڑکا عورت کے مختلف نازک اعضا کا نظارہ پسند نہیں کرتا؟ کیا مرد عورت کے پورے جسم سے استفادے کا شائق نہیں ہوتا؟ یہی معاملہ عورتوں کا بھی ہے۔

اگر عریانی کے مسئلے سے قطع نظر کر لیں' تو دیکھتے ہیں کہ خود مغرب بھی یہ کہتا ہے کہ عورت پر لباس کے ذریعے اپنے جسم کا کچھ حصہ ڈھانپنا لازم ہے۔ اب وہ لوگ جو اسلامی حجاب پر عقیدہ رکھتے ہیں وہ اس میں ایک اور کپڑے کا اضافہ کر دیتے ہیں' جسے مغرب غیر ضروری سمجھتا ہے۔ لہٰذا فطری خواہش کی سرکوبی اور اسکے کچلے جانے کا معاملہ تو ہر صورت میں باقی رہتا ہے۔

ظاہر ہونے والی زینت

☆ کلامِ الٰہی "مَا ظَھَرَ مِنْھَا" (۱) سے کیا مراد ہے اور شرع میں کون سی زینت حلال ہے؟

○ مَا ظَھَرَ مِنْھَا (از خود ظاہر ہونے والی زینت) سے مراد چہرہ اور دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیاں ہیں' جن کا کھلا رہنا انسان کی اجتماعی سرگرمیوں کا تقاضا ہے۔

خداوندِ عالم عورت کو اپنا چہرہ اور دونوں ہتھیلیاں ڈھانپ کر رکھنے کا پابند نہیں کرنا

۱۔ وَلَا یُبْدِیْنَ زِیْنَتَھُنَّ اِلَّا مَا ظَھَرَ مِنْھَا (اور اپنی زینت کا اظہار نہ کریں علاوہ اسکے جو خود ظاہر ہو جائے۔ سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۱)

چاہتا۔ شاید اس بات کی محکم اور واضح دلیل یہ ہے کہ دورانِ حج حالتِ احرام میں عورت پر چہرہ چھپانا حرام قرار دیا گیا ہے' باوجود یہ کہ حج ایک عبادی حالت ہے جس میں عورت پر مکمل پردہ فرض کیا جاتا' تا کہ مرد حجاج وسوسے اور ہیجان کا شکار ہونے سے محفوظ رہیں۔

اسی طرح بعض احادیث اور روایات سے پتا چلتا ہے کہ ظاہر ہونے والی زینت (جس کا چھپانا عورت پر واجب نہیں ہے) میں ہاتھوں میں پہننے والی انگوٹھی' آنکھوں میں لگایا جانے والا باریک سرمہ اور وہ زیب و زینت شامل ہے جس کا تقاضا عورت کی عام اور معمول کی زینت کرتی ہے۔

☆ اس بنیاد پر کیا زینت سے مراد تزئین و آرائش کے وہ مخصوص وسائل ہیں جو عورتوں کے زیرِ استعمال ہوتے ہیں' یا مقصود ان کے جسم کی قدرتی خوبصورتی ہیں؟

○ زینت میں دونوں ہی شامل ہیں۔

عورت پر حرام نگاہ

☆ نگاہِ حرام کا تعین کیسے کیا جا سکتا ہے؟ تصویروں اور غیر اخلاقی فلموں میں نظر آنے والی عورت پر نگاہ ڈالنے کا کیا حکم ہے؟

○ نگاہِ حرام کے بارے میں جس قرآنی نص میں ذکر آیا ہے' اس پر غور و فکر کے ذریعے یہ استنباط کیا جا سکتا ہے کہ خداوندِ عالم چاہتا ہے کہ مومن مرد اور مومن خواتین' ایک دوسرے کے بارے میں ایسے پاک و پاکیزہ جذبات و احساسات رکھیں جن میں اخلاق سے بعید کسی بُری نیت کا گزر نہ ہو۔ اگر جذبات و احساسات میں یہ پاکیزگی نہ پائی جائے' تو صاحبِ ایمان مرد و زن نفسیاتی اضطراب کی ایک ایسی حالت میں گرفتار ہو جائیں گے جو مستقبل میں ان کی گمراہی کا میدان فراہم کر دے گی۔ خداوندِ عالم انسان سے چاہتا ہے کہ وہ اپنی ذات میں فکری پہلو سے عصمت کا مالک ہو' تا کہ یہ عصمت عملی عصمت تک اسکی رسائی کا ایک وسیلہ

بن جائے۔ کیونکہ عمل کی جڑیں فکر، شعور اور احساس میں پیوست ہوتی ہیں۔

لہٰذا جب ہم آیۂ کریمہ: قُلْ لِلْمُؤْمِنِيْنَ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ وَ يَحْفَظُوْا فُرُوْجَهُمْ ذٰلِكَ اَزْكٰى لَهُمْ اِنَّ اللهَ خَبِيْرٌ بِمَا يَصْنَعُوْنَ. (۱) کی قرأت کرتے ہیں تو "اَزْكٰى لَهُمْ" (ان کے لیے پاکیزہ تر ہے) کی تعبیر پر غور کے ذریعے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ خداوندِ عالم چاہتا ہے کہ انسان اپنے اندر ایسی باطنی طہارت پیدا کرے، جو اسکی عملی طہارت میں تبدیل ہو جائے۔ اسی طرح خواتین کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے: وَ قُلْ لِلْمُؤْمِنٰتِ يَغْضُضْنَ مِنْ اَبْصَارِهِنَّ وَ يَحْفَظْنَ فُرُوْجَهُنَّ. (۲) اور مردوں سے عورتوں کے طرزِ گفتار کے بارے میں ہدایت پر مشتمل آیت: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ. (۳) سے استفادہ ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم خواتین سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ معمول کے انداز سے گفتگو کریں، کیونکہ ان کا ناز و ادا کے ساتھ گفتگو کرنا مردوں کے ان کی جانب ناجائز تمایل کا موجب ہوگا۔

خائن نگاہیں

اس گفتگو سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ (شرعی نقطۂ نظر سے) عورت پر پڑنے والی مرد کی جائز اور مناسب نگاہ وہ ہے جو طبیعی ہو اور مشکوک اور غلط سوچ کے ہمراہ نہ ہو۔ لیکن

۱۔ اور مومنین سے کہہ دیجیے کہ اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کریں کہ یہی زیادہ پاکیزہ بات ہے اور بے شک وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ اس سے خوب باخبر ہے۔ (سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۰)

۲۔ اور مومنات سے کہہ دیجیے کہ وہ بھی اپنی نگاہوں کو نیچا رکھیں اور اپنی عفت کی حفاظت کریں۔ (سورۂ نور ۲۴۔ آیت ۳۱)

۳۔ لہٰذا کسی سے ناز و ادا سے گفتگو نہ کرنا کہ جس کے دل میں بیماری ہو اسے لالچ پیدا ہو جائے۔ (سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۲)

عورت پر پڑنے والی مرد کی ایسی نگاہ جو اس میں حرام کی جانب رغبت پیدا کردے، اسے ''خائن نگاہ'' کا نام دیا گیا ہے۔ یہ وہی تعبیر ہے جو اس آیۂ کریمہ میں استعمال کی گئی ہے:

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَ مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ. (وہ خدا' نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے چھپے ہوئے بھیدوں سے بھی باخبر ہے۔ سورۂ غافر ۴۰۔ آیت ۱۹) اور اس تعبیر کو اس دعا میں بھی پاتے ہیں: اللهم طهر قلبي من النفاق، وعملي من الرياء، ولساني من الكذب، وعيني من الخيانة. فانك تعلم خائنة الاعين وما تخفي الصدور. (بارِالٰہا! میرے دل کو نفاق سے، میرے عمل کو ریا سے، میری زبان کو جھوٹ سے اور میری آنکھ کو خیانت سے پاک فرما، کہ تو خائن نگاہوں اور دل کے چھپے بھیدوں سے خوب واقف ہے)

لٰہذا خائن نگاہ' جانتے بوجھتے اٹھنے والی وہ نگاہ ہے جس میں خیانت پوشیدہ ہو۔ اور یہاں خیانت حرام کی جانب رغبت کا کنایہ ہے۔ یہ نگاہ فعلِ حرام کی انجام دہی اور گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔

مشکوک اور قصدِ لذت سے نگاہ ڈالنا ممنوع ہے

اس طرح واضح ہوتا ہے کہ (شرع کے نقطۂ نظر سے) وہ نگاہ پسندیدہ اور مطلوب ہے جس میں حصولِ لذت کا ارادہ نہ ہو۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ مرد عورت کی خوبصورتی سے لطف و لذت اندوزی کے لیے اسے گھورنے لگے۔ یہ نگاہ چاہے دس فی صد ہی سہی لیکن بہرصورت منفی نتائج کی حامل ہوتی ہے۔

خوبصورت عورت کو لذت کی نگاہ سے دیکھنے اور قدرتی مناظر کو لطف اندوزی کی نیت سے دیکھنے کے درمیان فرق ہے۔ کیونکہ عورت کی زیبائی کی جانب لذت کی نگاہ ڈالنا جنسی احساسات کو بھڑکاتا ہے۔ جو صنفِ مخالف کی جانب کشش کا باعث ہے۔ اور یہ عمل منفی آثار

دنتائج پر منتہی ہوتا ہے۔ جبکہ لطف ولذت کی غرض سے قدرتی مناظر کا نظارہ کسی قسم کے منفی نتائج کا حامل نہیں ہوتا۔

اسی بنا پر فقہا نے شرط رکھی ہے کہ نگاہ اسی صورت میں جائز ہے جب وہ بغیر قصدِ لذت کے اور بغیر کسی بُرے ارادے کے ہو۔ اس مقام پر امیر الشعراء ''احمد شوقی'' کے اس شعر کو گواہ قرار دینا مناسب دکھائی دیتا ہے، جس میں وہ کہتے ہیں کہ:

نظرة فابتسامة فكلام

فسلام فموعد فلقاء

''نظر، مسکراہٹ، پھر کلام، سلام، پھر عہد و پیمان اور پھر ملاقات۔''

یہاں نظر سے شاعر کی مراد وہ نگاہ ہے جو بعد کے مراحل کی منصوبہ بندی کرتی ہو۔ اور اسی کو غرض آلود اور ناپاک نگاہ کہا جاتا ہے۔ شاید درجِ ذیل حدیث سے بھی یہی معنی لیے جا سکیں جس میں ارشاد ہوتا ہے: النظرة الاولی لک والثانية عليک. (پہلی نگاہ جائز ہے اور دوسری تمہارے لیے ضرر رساں ہے)

کیونکہ عام طور پر پہلی نگاہ اتفاقی اور قدرتی ہوتی ہے، لیکن اگر دوسری اور تیسری نگاہ بھی اُٹھے، تو اسکے معنی یہ ہیں کہ انسان کے نفس میں کوئی ایسی چیز پیدا ہو گئی ہے جو اسے ایک دوسرے احساس کے ساتھ پے در پے نگاہ ڈالنے پر اُکسا رہی ہے۔

اسی طرح وہ آیت جس میں عورتوں کے مردوں سے اندازِ گفتگو کے بارے میں بات ہوئی ہے، وہ بتاتی ہے کہ اسلام عورت اور مرد کے ایسے تعلقات کو ناپسند کرتا ہے، جو اُن کے اخلاق پر بُرے اثرات مرتب کریں۔ لہٰذا جس طرح عورت کو مرد سے اس انداز سے بات چیت نہیں کرنی چاہیے جو بیمار دلوں میں وسوسہ پیدا کر دے، اسی طرح مرد کو بھی عورت کو اس انداز سے نہیں دیکھنا چاہیے، جو اسکے دل میں وسوسوں کو جنم دے۔

اس گفتگو سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انسان کو چاہیے کہ اپنے دل میں مرض کو جگہ

نہ دے۔ یہاں ''مرض'' کی اصطلاح بُری نیت کا کنایہ ہے اور بے شک خدا کو یہ بات پسند نہیں کہ انسان کے دل میں بُری نیت پیدا ہو۔

اسی طرح خدا ایسے ماحول کی فراہمی کو بھی پسند نہیں کرتا جو بُری نیت کے حامل انسان کی حوصلہ افزائی کا موجب ہو۔ نتیجے کے طور پر یہ کہنا چاہیے کہ اسلام کی نظر میں ہر ایسی نگاہ حرام ہے جو فی نفسہ ''خیانت'' کا راستہ ہموار کرتی ہو۔

نظروں کا جھکا لینا' گمراہی کے خلاف ڈھال

☆ ایک ایسے ماحول میں جہاں مرد اپنی ہم جماعت یا دفتر میں ساتھ کام کرنے والی خواتین پر نظر ڈالنے پر مجبور ہو' وہاں کبھی کبھی مشکوک نگاہ ایک لاشعوری عمل بن جاتی ہے اور مسلسل میل جول اور پیہم نظر پڑنے کے نتیجے میں یہ احساس پیدا ہو جاتا ہے۔

○ مردوں اور عورتوں کے درمیان دوستانہ فضا کبھی کبھی قربت کی ایسی حالت وجود میں لے آتی ہے جس میں ایک انسان دوسرے انسان کو پہلے سے مختلف نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ کیونکہ پیشہ ورانہ امور کی انجام دہی کے دوران اور کام کی ضروریات کے تحت عورت پر معمول کے مطابق نگاہ ڈالنے اور انس والفت اور تمایل ورغبت کے احساس کی بنیاد پر اسے دیکھنے کے درمیان بہت فرق ہے۔ اس دیکھنے کو قدرتی اور طبیعی حالت نہیں کہا جا سکتا۔ بلکہ یہ حالت ایک خاص نفسانی فضا تیار کرتی ہے جو ایک معین صورت میں بدل کر ممکن ہے انسان کو گمراہی اور انحراف میں مبتلا کر دے۔

لہٰذا خداوندِ عالم مومن مردوں اور مومن عورتوں سے چاہتا ہے کہ اپنی نظریں جھکائے رکھیں تاکہ اس حالت سے بچے رہیں جو ناپسندیدہ نتائج پر منتہی ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مومن مرد اور مومن عورت پر لازم ہے کہ جب وہ ایسی صورتحال سے دوچار ہوں تو ان کا شعور ہوشیار اور چوکنا رہے۔

قدرتی طور پر یہ گفتگوان مواقع کے بارے میں ہے جن میں دیکھنا شرعاً جائز ہو لیکن ایسے مواقع پر جب نگاہ ڈالنا جائز نہ ہو وہاں اسلام نے عورت کے بعض اعضا پر نگاہ ڈالنے کی حدود مقرر کی ہیں، جس طرح عورت کے لیے مرد کے بعض اعضا پر نگاہ ڈالنے کی حدود وضع کی ہیں۔ تاکہ یہ نگاہیں صنفِ مخالف کی جانب میلان کے لیے انسان میں موجود جنسی پہلو کی تحریک کا سبب نہ بنیں۔ لہٰذا علومِ اجتماعی (social sciences) کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ عورتوں اور مردوں میں بے لوث دوستی مشکل ہی سے ہوا کرتی ہے۔

نگاہ کے جواز کی شرعی حد

☆ اس صورتحال میں اجنبی عورت پر نگاہ ڈالنے کے جواز کا فلسفہ کیا ہے؟

O اس سوال کے جواب میں جو فتویٰ سامنے آتا ہے اُسے دو فتاویٰ کی صورت میں تقسیم کیا جاسکتا ہے؟

پہلا فتویٰ ان مسلمان یا غیر مسلمان خواتین پر نگاہ ڈالنے کے جواز سے متعلق ہے جنہیں بے پردگی سے روکا گیا ہو لیکن وہ اسکی پروا نہ کرتی ہوں۔ البتہ بعض علما اس قسم کی مسلمان عورتوں کے بارے میں احتیاط کے قائل ہیں۔

اس مسئلے کی بنیاد وہ فقہی رائے ہے جو بعض ایسی احادیث سے پیدا ہوتی ہے جن کا مفہوم یہ ہے کہ عورت پر نگاہ ڈالنے کا مسئلہ اسکے احترام سے تعلق رکھتا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عورت اپنے بدن کے کسی حصے کو چھپاتی ہو تو اس پر نگاہ ڈالنا اسکی توہین اور ہتکِ حرمت کے مترادف ہے۔ کیونکہ اس کا پردہ کرنا اس بات کی علامت ہے کہ وہ بدن کے ان حصوں کو دوسروں سے پوشیدہ رکھنا چاہتی ہے اور اس بات پر راضی نہیں کہ کوئی اُن پر نگاہ ڈالے۔ اور اگر اسے پتا چل جائے کہ کوئی چوری چھپے اُسے دیکھ رہا ہے تو وہ اس پر ناراض ہوگی اور اسے اپنی تنقید اور ملامت کا ہدف قرار دے گی۔

پردے کا احترام' نظر کے احترام کا تقاضا ہے

انسان اپنی جن چیزوں کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہے' اُن کے لیے ایک حریم (حصار) قائم کرتا ہے۔ لہٰذا انسان بدن کے جن حصوں کو چھپانے کا خواہشمند ہوتا ہے ان پر نگاہ ڈالنے کا موضوع بنیادی مسائل میں سے ہے' قطعِ نظر اسکے کہ یہ نگاہ' نگاہ ڈالنے والے کو فریفتہ اور گمراہ کرے یا نہ کرے۔

اس بنیاد پر اگر کوئی عورت اپنے بدن کے لیے کوئی حریم (حصار) قرار نہ دے۔ یعنی اپنے بدن کے ایسے حصے کھلے رکھے جو فتنے کا باعث بنتے ہیں' تو اسکے بدن کے یہ حصے کسی حرمت کے حامل نہیں جس کی رعایت انسان پر فرض ہو۔ لہٰذا نامحرم مرد کا اس پر بغیر قصدِ لذت کے اور غیر مشکوک نگاہ ڈالنا جائز ہے۔

یہ تو رہا ایک پہلو سے' دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس جواز کی بنیاد ایسے معاشرے میں انسان سے تنگی اور مشکل کو رفع کرنا ہے جس میں عورتیں سج دھج کے ساتھ بے حجاب باہر نکلتی ہیں اور جن سے چشم پوشی انسان کے لیے ممکن نہیں۔ ایک حدیث میں آیا ہے: **لاحرمة لنساء اهل الذمة ان ينظر الى شعورهن.** (اہلِ ذمہ عورتوں کے بالوں پر نگاہ ڈالنا حرام نہیں)

اس حکم کے ذریعے مردوں کو اس سختی اور دشواری سے بچایا گیا ہے جس میں وہ ان معاشروں میں مبتلا ہوتے ہیں جو مغربی معاشروں کی مانند ہیں۔ یہ حکم اس بنا پر ہے کہ ان عورتوں نے خود اپنے ہاتھوں اپنے حریم کو توڑا ہے۔ اسکے باوجود اس قسم کی خواتین پر نگاہ ڈالنے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ یہ نگاہ بُرے ارادے اور لذت حاصل کرنے کی غرض سے نہ ہو۔

عورت کی تصویر دیکھنا

لیکن دوسرا فتویٰ جو تصویر کے مسئلے سے مربوط ہے' اس میں بعض ایسے فتاویٰ موجود ہیں جن کے مطابق عورت کی تصویر دیکھنا حرام نہیں۔ البتہ اس مسئلے میں بعض علما ان باحجاب

خواتین کی تصاویر کے بارے میں احتیاط کو ملحوظ رکھنے کے قائل ہیں جو یہ نہیں چاہتیں کہ کوئی تصویر میں بھی ان کے سراپے کو دیکھے، جو تصویر مثلاً ان کے محرم نے اتاری ہو۔

علما کے نزدیک اگر نگاہ ڈالنے والا شخص عورت کو جانتا ہو، تو احتیاطِ واجب یہ ہے کہ وہ باپردہ خاتون کی تصویر پر نگاہ نہ ڈالے۔ یہ علما اس عمل کو عورت کی ہتک حرمت قرار دیتے ہیں، کیونکہ جب وہ خود اپنے آپ کو اس حد تک چھپانا چاہتی ہے، تو اسکی تصویر کو دیکھنا اسکی آزادی کی مخالفت اور اسکے حریم کو توڑنا ہے۔

لیکن اس دائرے سے باہر، یعنی اگر عورت اسکے لیے اجنبی ہو، یا بے حجاب اور بن سنور کر باہر نکلنے والی عورتوں میں سے ہو، تو ایسی صورت میں علما کی رائے یہ ہے کہ نگاہ ڈالنے کے حرام ہونے کے دلائل تصویر پر نگاہ ڈالنے کے حرام ہونے کو شامل نہیں کرتے، بلکہ صرف بنفسِ نفیس عورت پر نگاہ ڈالنے کے حرام ہونے تک محدود ہیں۔

علما نے ہر صورت میں یہ پابندی عائد کی ہے کہ نگاہ ڈالنا تب ہی جائز ہے جب وہ غیر مشکوک اور بغیر لذت کے ہو۔

اس گفتگو کی روشنی میں یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جنسی فلموں کو دیکھنے کا مسئلہ ان بیان شدہ فتاویٰ کے ضمن میں نہیں آتا۔ کیونکہ اس کا تعلق لذت اندوزی سے ہے جو بسا اوقات ان افراد کے روحانی تزلزل کا باعث ہو جاتی ہے جو ان فلموں کو دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں۔

طبی وجوہات کی بنا پر نگاہ ڈالنا

☆ طبی ضروریات کے پیشِ نظر، کیا مرد عورت کے جسم پر نگاہ ڈال سکتا ہے؟

O اگر مرد ڈاکٹر علاج کی غرض سے عورت کے بدن کے ایسے حصوں پر نگاہ ڈالے جن کی حالت سے وہ واقف نہ ہو، تو کوئی مانع نہیں۔ بشرطیکہ عملی لحاظ سے کوئی مشکل پیش نہ آئے۔ جس طرح مرد ڈاکٹر کے لیے خاتون مریضہ کا معائنہ کرنا جائز ہے، جبکہ اُس کا علاج

مرد ڈاکٹر کے معائنے پر موقوف ہو' اُسی طرح خاتون ڈاکٹر کے لیے بھی مرد مریض کے عضوِ بدن پر نگاہ ڈالنا جائز ہے۔ اور حدیث میں آیا ہے کہ اگر عورت کے لیے مرد ڈ خاتون ڈاکٹر سے زیادہ سودمند اور کارآمد ہو' تو اسکے لیے جائز ہے کہ علاج کے لیے مرد ڈ سے رجوع کرے' اور ڈاکٹر کے لیے اسکے بدن کے ان حصوں کا مشاہدہ جائز ہے جن پر حالات میں اسکے لیے نگاہ ڈالنا حرام ہے۔

امام محمد باقر علیہ السلام سے منقول ایک حدیث میں آیا ہے کہ راوی نے آپ سوال کیا: اگر کسی مسلمان عورت کے بدن کے ایسے حصے پر کوئی بیماری یا زخم ہو' یا ٹوٹ پھو ہو' جس پر نگاہ ڈالنا نامحرم مرد کے لیے جائز نہیں' تو کیا وہ کسی ایسے مرد ڈاکٹر سے رجوع کر ہے جو خاتون ڈاکٹر سے بہتر علاج کرسکتا ہے؟ اور کیا مرد ڈاکٹر کے لیے اسکے بدن کے ا حصے پر نگاہ ڈالنا جائز ہوگا؟ امامؑ نے جواب دیا: ''اگر علاج کی غرض سے مرد ڈاکٹر سے رجو کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ ہو' تو رجوع کرسکتی ہے۔''

ایک دوسری حدیث میں جو علی بن جعفر نے اپنے بھائی امام موسیٰ کاظم علیہ السلا سے نقل کی ہے' آیا ہے کہ امامؑ سے سوال کیا گیا: کیا عورت کے لیے مرد کی ران یا کولہے زخم کا علاج کرنا جائز ہے؟ امامؑ نے فرمایا: ''اگر شرمگاہ نہ ہو' تو کوئی مضائقہ نہیں۔''

لڑکی کی ولایت کا مسئلہ

☆ لڑکی پر اسکے ولی کے اختیارات کی حدود کیا ہیں؟

○ جس طرح عاقل' بالغ اور باشعور (رشید) جوان لڑکے پر کسی کی ولایت نہیں' ا طرح عاقل' بالغ اور باشعور (رشیدہ) لڑکی پر کسی کو ولایت حاصل نہیں۔ اس لیے کہ ج انسان سنِ بلوغ کو پہنچ جائے اور اس کا شعور بھی پختہ ہو جائے' تو وہ اپنے معاملات کا ذمے دار ہو جاتا ہے: اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَیْ

اَمْوَالَهُمْ. (اور یتیموں کا امتحان لو جب وہ نکاح کے قابل ہو جائیں تو اگر ان میں رشید ہونے کا احساس کرو تو ان کے اموال ان کے حوالے کر دو۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ٦) یہ مسئلہ صرف یتیموں سے مخصوص نہیں بلکہ تمام قاصر (سمجھ بوجھ نہ رکھنے والے) اس میں شامل ہیں۔

لیکن کچھ فقہا بعض احادیث کے پیش نظر کنواری لڑکی کے بارے میں احتیاط کے قائل ہیں اور کہتے ہیں کہ اسے (اپنی شادی کے مسئلے میں) اپنے باپ یا دادا کے مشورے اور اجازت سے عمل کرنا چاہیے۔ البتہ اس احتیاط کے معنی یہ نہیں کہ باپ دادا اس پر ولایتِ عام رکھتے ہیں۔ کیونکہ باپ یا دادا بغیر اسکی رضا مندی کے اسے کسی کی زوجیت میں دینے کا حق نہیں رکھتے، جس طرح نابالغ اور ناسمجھ بچے کی رضا مندی کے بغیر اسکی شادی کا اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن (عاقل، بالغ اور باشعور) لڑکی کی رضا مندی کے بغیر اسکے باپ یا دادا کسی سے اسکی شادی نہیں کر سکتے۔

کنواری لڑکی کے بارے میں احتیاط کی وجہ

یہاں دراصل لڑکی کی ناتجربہ کاری اور دھوکا و فریب کھانے کے امکان کی وجہ سے احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ لہٰذا باپ یا دادا کی اجازت کی شرط، لڑکی کو شریکِ حیات کے انتخاب میں لغزش سے محفوظ رکھنے کے لیے ایک احتیاطی تدبیر سمجھی جاتی ہے اور اسی وجہ سے بیوہ یا مطلقہ عورت کو شادی کے لیے باپ یا دادا کی اجازت کی ضرورت نہیں۔

بہت ممکن ہے بعض لوگوں کے خیال میں یہ مسئلہ (باپ یا دادا کی اجازت) صرف اسی پہلو سے مربوط نہ ہو اور اسکے دوسرے دلائل بھی ہوں، جیسے مشرق کے اسلامی معاشروں میں باپ دادا کے احترام کی رسم کہ جہاں کوئی لڑکی ان کی اجازت کے بغیر شادی نہیں کرتی۔ ان معاشروں میں اس مسئلے کو باپ دادا کے معاشرتی عزت و وقار سے مربوط سمجھا جاتا ہے۔ لہٰذا باپ اپنی لڑکی کے بارے میں فیصلہ کرنے میں صاحبِ اختیار ہوتا ہے۔ کیونکہ اگر لڑکی کو

ناپسندیدہ حالات کا سامنا کرنا پڑے' تو اسکے باپ پر منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں اور اگر لڑکی خوشگوار زندگی گزارے' تو یہ اسکے باپ پر مثبت اثرات ڈالتے ہیں۔

وہ فقہا بھی جو کنواری لڑکی کے لیے باپ یا دادا کی اجازت کو شرط قرار دیتے ہیں باپ دادا (یا پردادا) کے انتقال کر جانے کی صورت میں کنواری لڑکی کے لیے کسی کی اجازت کو ضروری نہیں سمجھتے۔ یہ امر اس بات کی دلیل ہے کہ باپ دادا کی اجازت کے شرط ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ لڑکی اپنے بارے میں فیصلہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ بلکہ یہ شرط لڑکی کے مستقبل کے لیے احتیاط اور باپ دادا کے احترام کی غرض سے ہے۔

فقہا کے درمیان ایک اور رائے بھی ہے' جو شادی کے معاملے میں لڑکی کے لیے باپ یا دادا کی اجازت کو واجب نہیں سمجھتی' بلکہ اسے آزاد اور خودمختار قرار دیتی ہے۔

کیا لڑکی اپنے معاملات میں خودمختار ہے؟

☆ اس بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

○ ہمارے خیال میں اگر لڑکی باشعور (رشیدہ) ہو' تو اپنے ذاتی معاملات اور مال کے بارے میں خودمختار ہے۔

☆ رائج نظریات کے مطابق' باپ یا دادا کی اجازت صرف عورت ہی کے لیے کیوں مخصوص ہے' مرد کے لیے بھی کیوں ضروری نہیں؟

○ کیونکہ مرد کا معاشرتی زندگی سے زیادہ سروکار رہتا ہے' لہٰذا اس سلسلے میں اسے عورت کی نسبت زیادہ مواقع فراہم ہونے کی بنا پر شادی بیاہ کے مسائل کا زیادہ تجربہ اور ازدواجی زندگی کی حقیقتوں کے بارے میں زیادہ سوجھ بوجھ ہوتی ہے۔

یہ تو اس مسئلے کا ایک پہلو تھا' دوسرے پہلو کی تفسیر یہ کی جاتی ہے کہ اگر مرد شادی کے معاملے میں دھوکا کھا بیٹھے' تو اپنی بیوی کو طلاق دے کر اس بندھن کو توڑ سکتا ہے' جبکہ اسلا

نے عورت کو طلاق کا حق نہیں دیا ہے۔ لہٰذا عورت کو اس معاملے میں بہت زیادہ احتیاط کی ضرورت ہے' تاکہ ایسی حالت کا شکار نہ ہو جس سے اس کا چھٹکارا با آسانی ممکن نہیں۔

لڑکی کا سنِ شعور (رُشد)

☆ لڑکی کتنے برس کی عمر میں باشعور (رشیدہ) کہلائے گی؟

O شعور کے لیے کسی خاص اور معین عمر کا تعین نہیں کیا جاسکتا۔ ہم ایسی لڑکیوں کو بھی دیکھتے ہیں جو گیارہ بارہ برس کی عمر میں باشعور ہو جاتی ہیں اور بعض ایسی بھی ہیں جو بیس برس کی ہو جانے کے باوجود باشعور (رشیدہ) نہیں ہوتیں۔

☆ شعور (رشد) کا معاشرتی مفہوم کیا ہے؟

O شعور (رشد) کا معاشرتی مفہوم یہ ہے کہ لڑکا یا لڑکی ایسی ذہنی استعداد کے مالک ہو جائیں جس کے تحت وہ اپنے مالی امور کو بغیر کوئی حماقت کیے سمجھداری کے ساتھ چلا سکیں۔

امر بالمعروف ولایت نہیں ہے

☆ لڑکی کی شادی کے بعد کیا اس پر سے باپ کی ولایت ختم ہو جاتی ہے؟

O بنیادی طور پر باپ اپنی بالغ اور سمجھ بوجھ کی حامل لڑکی پر کوئی ولایت نہیں رکھتا۔ لیکن جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں' شادی کے مسئلے میں (باپ کی ولایت) صرف احتیاط کی غرض سے ہے' وگرنہ دوسرے معاملات میں باپ کو اپنی لڑکی پر کسی قسم کی ولایت حاصل نہیں۔ اگر بالفرض باپ کو اپنی لڑکی کی تعلیم اور مالی تصرف پر اس وقت ولایت حاصل ہوتی ہے جب وہ گمراہ ہو رہی ہو' تو ایسی صورت میں یہ بات باپ بیٹی کے مسئلے سے باہر نکل کر ایک مومن کے دوسرے مومن کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے زیرِ عنوان آ جاتی ہے اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں لڑکی پر باپ کی ولایت نہ ہی شادی سے پہلے ثابت ہے اور نہ ہی شادی کے بعد۔

☆ کیا باپ کو حق نہیں کہ وہ اپنی لڑکی کو مثلاً حجاب پر مجبور کرے؟

○ باپ یا شوہر کے طور پر نہیں' بلکہ ایک مسلمان کے طور پر اسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا چاہیے۔ اور لڑکی بھی جب اپنے باپ کی فرمانبرداری میں حجاب کی پابندی کرے' وہ بھی یہ اطاعت اس لیے نہ کرے کہ یہ اسکے باپ کا حکم ہے' یا باپ کی خواہش کے احترا نے یہ اسکے لیے فرض کر دیا ہے۔ بلکہ وہ باپ کو ایک خیر خواہ ناصح اور رہنما سمجھتے ہوئے اسکی اطاعت کرے۔

یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ جبر اًعمل کبھی کبھی ایسی نفسیاتی گھٹن پیدا کر دیتا جس کے منفی اثرات پہلے سے زیادہ بڑی مشکل کھڑی کر دیتے ہیں۔ البتہ امر بالمعروف او نہی عن المنکر میں شرعی شرائط کو ملحوظ رکھنا واجب ہے۔

عرف اور شرع کا اختلاف

☆ کیا کبھی عرف حکمِ شرعی پر مقدم ہو سکتا ہے؟

○ کسی بھی حال میں عرف (۱) احکامِ شریعت پر مقدم نہیں ہو سکتا۔ عرف کا کردا (عرف سے متعلق مواقع پر) صرف کتاب و سنت کی دینی نصوص کا فہم ہے۔ ہاں' بسا اوقات عرف کے اختلاف کے اثر سے موضوعاتِ شرع تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مثلاً ایک فتوے کے مطابق مردوں کے لیے زنانہ لباس پہننا جائز نہیں اور اسی طرح عورتوں کو بھی مردانہ لباس پہننے کی اجازت نہیں۔ لہٰذا بالفرض اگر کوئی خاص لباس' جیسے پتلون جو ایک مردانہ لباس کثرتِ استعمال کی وجہ سے عورتوں اور مردوں کا مشترکہ لباس ہو جائے اور ایسی حالت میں عرف آگے بڑھ کر اس مخصوص لباس کو مشترک لباس میں تبدیل کر دے' تو درحقیقت اس موضوع کو بدل دیا ہے۔ لہٰذا اسکے بعد اگر کوئی عورت پتلون پہنے' تو اسے مردانہ لباس پہنن

۱۔ عرف: رائے عامہ' عام معاشرتی رجحان۔

والی نہیں کہیں گے' کیونکہ اب پتلون مردوں اور عورتوں کا مشترکہ لباس ہو چکا ہے۔

لہٰذا کبھی کبھی عرف کے دخل اور تصرف کے نتیجے میں موضوع بدل جاتا ہے۔ لیکن عرف اس وقت تک کسی حکمِ شرعی کو نہیں بدل سکتا جب تک موضوع سلامت رہے۔

ازدواجِ موقت (متعہ) کے بارے میں عرف کا موٴقف

☆ ابھی جبکہ ہم عرف کے موضوع پر گفتگو کر رہے ہیں' مناسب سمجھتے ہیں کہ اس حوالے سے ازدواجِ موقت یا متعہ کے مسئلے پر بھی کچھ بات ہو جائے۔ بہت سے معاشروں میں "عرف" ازدواجِ موقت کو عورت کی تحقیر واہانت کا سبب سمجھتا ہے۔ یہاں تک کہ وہاں لوگ اس عمل کو زنا کی مانند قرار دیتے ہیں۔

○ اس موضوع کے بارے میں ہم اصولی طور پر عرف کی رائے کا احترام نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسلام غلط تصورات کو بدلنے کے لیے آیا ہے' لہٰذا اگر عرف اس موضوع کی مخالفت کرے اور اسے معیوب سمجھے' جبکہ اسلام اسے ایک عام اور بے عیب امر قرار دیتا ہو' تو ہم اس مسئلے میں عرف کی طرفداری نہیں کر سکتے۔

البتہ ایسے مسائل کے بارے میں عرف کی منفی رائے' کبھی کبھی انہیں ایک قسم کی ناپسندیدہ چیز بنا دیتی ہے۔ کیونکہ عرف کا ان مسائل کو بُری نظر سے دیکھنا' انہیں مرد و زن کے لیے ذلت و حقارت کا موجب بنا دیتا ہے اور بعض اوقات انسان پسند نہیں کرتا کہ خود کو ایسی صورتحال میں ڈال کر اپنے لیے دردِ سر مول لے۔

ہماری احادیث میں آیا ہے کہ کنواری لڑکی کے ساتھ متعہ مکروہ ہے' ہر چند اُسکے باپ دادا موجود نہ ہوں۔ کیونکہ ممکن ہے معاشرے کی طرف سے اُسے مشکلات پیش آئیں اور یہ اُسکی عزت و آبرو کے لیے ضرر رساں ہو۔

بسا اوقات ہم دیکھتے ہیں کہ عرف ذلت و عار کے موضوع کو بہت وسیع کر دیتا ہے' جیسے

کہ بعض پسماندہ قبائلی معاشروں میں اگر کوئی لڑکی اپنے چچازاد کے علاوہ یا اپنی برادری کے
باہر کسی فرد سے شادی کر لے، تو اس سے باز پُرس کرتے ہیں، اور اسکے اس فعل کو اپنے لیے
ذلت و عار محسوس کرتے ہیں۔ اسی طرح ان معاشروں میں مطلقہ یا بیوہ عورت کے عقدِ ثانی کو
بھی بُری نظر سے دیکھا جاتا ہے۔

بہرصورت اسلام چیزوں کے بارے میں عرف کے نقطۂ نظر کی تصحیح کے لیے آیا ہے۔
لیکن اگر عرف (کا نقطۂ نظر) اس حد تک پہنچ جائے کہ عنوانِ ثانوی کی حیثیت اختیار کرلے
تو ایسی صورت میں حکمِ شرعی اس عنوانِ ثانوی کی پیروی کرتا ہے اور اسکی رو سے کبھی وہی چیز
مکروہ قرار پاتی ہے، کبھی حرام اور کبھی۔۔۔۔۔

متعہ گمراہی کے خلاف ایک ڈھال

☆ متعہ کے بارے میں ایک اور سوال بھی پیش آتا ہے، اور وہ یہ کہ آیا اسلام متعہ کو ایک
معمول کا حق قرار دیتا ہے کہ انسان جب چاہے اس حق سے استفادہ کرے، یا یہ قانون خاص
حالات کے لیے ہے، یا یہ کہ اسے ایک خاص مشکل سے نکلنے کے لیے راہِ حل کے طور پر وضع
کیا گیا ہے؟

O اگر ہم اس قرآنی نص کا مطالعہ کریں جسے متعہ کے قائل حضرات بطورِ سند پیش کرتے
ہیں، تو ہم اسے بغیر کسی خاص قید و شرط کے ایک مطلق نص پاتے ہیں: فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهِ
مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً. (پس جو بھی ان عورتوں سے تمتع کرے ان کی اجرت
انہیں بطورِ فریضہ دے دے۔ سورۂ نساء ۴۔ آیت ۲۴) اور جب متعہ کے موضوع کا جائزہ لیتے
ہیں تو پتا چلتا ہے کہ متعہ ضروری حالتوں کے لیے بھی ہے اور احتیاجات اور تمایلات کی تسکین
کے لیے بھی۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ طولِ تاریخ میں تمام ادیان اور تہذیبوں میں دائمی نکاح
انسان کی (جنسی) مشکل کو مکمل طور پر حل نہیں کرسکا اور نہ ہی اسے (جنسی) گمراہی سے محفوظ

رکھ سکا۔ جیسا کہ قومِ لوط کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ تاریخ کے ہر دور میں زنا جیسے غیر شرعی جنسی تعلقات دائمی نکاح کے ساتھ ساتھ موجود رہے ہیں۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دائمی نکاح مردوں کے لیے کافی نہیں ہوتا جو عورت کی نسبت زیادہ جنسی خواہش رکھتے ہیں اور تعدد کے طالب بھی ہوتے ہیں۔ لہٰذا اسلام نے مرد کو ایک وقت میں چار بیویاں رکھنے کی اجازت دی ہے' اسکے علاوہ گمراہی سے بچنے کی غرض سے اسکے لیے (حسبِ خواہش) متعہ کو جائز قرار دیا ہے۔ لہٰذا متعہ کسی خاص حالت کے لیے محدود نہیں ہے۔

تعددِ ازدواج

☆ کیا تعددِ ازدواج (کئی بیویوں کی اجازت) ایک معمول کی بات ہے' یا کسی خاص مشکل کے حل کے لیے وضع کیا گیا قانون ہے؟ بالفاظِ دیگر آیا انسان ابتدا ہی سے چار شادیاں کرسکتا ہے' یا یہ کہ اسے عائلی مشکلات میں سے کسی مشکل کے حل کے لیے کئی شادیوں کا اختیار دیا گیا ہے؟

○ ظاہراً کئی شادیوں کا مسئلہ ضرورت یا عدم ضرورت میں مقید نہیں ہے۔ بلکہ انتہائی چیز جو انسان کے لیے ضروری ہے وہ یہ ہے کہ ایک سے زیادہ بیویاں ہونے کی صورت میں انسان انہیں نفقہ دینے کی قدرت رکھتا ہو۔

☆ بعض لوگ تعددِ ازدواج پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ (مثلاً یورپ میں) یہ مسئلہ خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ اور تباہی کا موجب ہوتا ہے۔ اس بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

○ ہمارے خیال میں امریکہ' یورپ اور دنیا کے دوسرے مقامات پر ایک سے زیادہ بیویوں پر مشتمل خاندانوں کی ٹوٹ پھوٹ اور انتشار (جو وہاں ایک عام سی بات دکھائی دینے لگی ہے) کی وجہ تعددِ ازدواج سے زیادہ مرد و زن کے ناجائز تعلقات ہیں۔

قدرتی طور پر تعددِ ازدواج میں بھی اسی طرح کی کچھ منفی باتیں پائی جاتی ہیں جس طرح ایک زوجہ ہونے میں۔ بنیادی طور پر کوئی بھی قانون منفی چیزوں سے پاک نہیں۔ لیکن اصول یہ ہے کہ اگر کسی امر میں منفی چیزیں کم ہوں اور مثبت زیادہ، تو وہ امر حلال ہو جاتا ہے اور اگر مثبت چیزیں کم ہوں اور منفی زیادہ تو وہ حرام قرار پاتا ہے۔

ہماری رائے میں تعددِ ازدواج منفی اثرات کے مقابلے میں بکثرت مثبت اثرات کا حامل ہے۔

جلدی شادی مستحب ہے

☆ جلد یا دیر سے شادی کے بارے میں متعدد آراء پائی جاتی ہیں۔ بعض لوگ جلد شادی کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ بعض کی نظر میں تاخیر سے شادی کرنا مناسب ہے۔ اس مسئلے کے بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

O اسلام جلد شادی کو مستحب قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اسلام کی نظر میں یہ بات بہت ہی پسندیدہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو گناہ سے بچائے اور اپنی پاک دامنی کی حفاظت کرے۔

بے شک جلد (برموقع) شادی کے ذریعے انسان کی جنسی جبلّت کی تسکین ہوتی ہے اور اگر یہ تسکین نہ ہو، تو بعض اوقات انسان بہت تیز رفتاری کے ساتھ گمراہی کا شکار ہوتا ہے۔

ہمیں اس بارے میں اسلام میں کوئی وضاحت نہیں ملتی۔ البتہ اسلام شادی کو ایک ایسا خاص تعلق سمجھتا ہے جو دوسرے پہلوؤں کا حامل ہونے کے ساتھ ساتھ صنفِ مخالف کی جانب انسان کے جھکاؤ اور اسکی جنسی جبلّت کی تسکین کرتا ہے۔ اگر جلد شادی کے نتیجے میں زوجین کے لیے کچھ مشکلات جنم لیں، تو ان مشکلات کا حل اُن کے اعزہ و اقربا، دوست احباب کے توسط سے ممکن ہے، جبکہ تاخیر سے شادی بھی معاشرے کے لیے بہت سی مشکلات پیدا کرتی ہے۔

تمباکونوشی کی حرمت

☆ تمباکونوشی کے بارے میں جنابِ عالی کی رائے کیا ہے؟

○ جن چیزوں کے بارے میں ہمارے پاس واضح نص موجود نہ ہو' اصولاً وہ چیزیں مباح ہوتی ہیں۔ لیکن ہماری رائے اس قول کے قریب قریب ہے جو ایک مناسب دلیل کی بنا پر تمباکونوشی کو حرام قرار دیتا ہے اور اس سلسلے میں اس آیۂ کریمہ سے استفادہ کرتا ہے جس میں ارشادِ الٰہی ہے: يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا. (یہ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں' تو کہہ دیجیے کہ ان دونوں میں بڑا نقصان ہے اور بہت فائدے بھی ہیں' لیکن ان کا نقصان فائدے سے کہیں زیادہ ہے۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۲۱۹)

پس اگر "اِثْمٌ" کی تفسیر کرتے ہوئے اسے "نقصان" یا نقصان کا موجب بننے والی چیز قرار دیں' تو کیونکہ آیت میں حرام ہونے کا سبب بھی واضح کیا گیا ہے' جو کسی چیز کے فائدہ مند ہونے سے زیادہ اُس کا نقصاندہ ہونا ہے' تو اس بنیاد پر ہمیں یہ قاعدہ حاصل ہوتا ہے کہ ہر وہ چیز حرام ہے جس کا نقصان اُسکے فائدے سے زیادہ ہو۔

تمام اطبا (doctors) کہتے ہیں کہ تمباکونوشی کا نقصان بہت زیادہ ہے' جبکہ اس کا فائدہ بہت کم ہے۔ لہٰذا تمباکونوشی کو قریب قریب حرام قرار دیا جاسکتا ہے اور اگر اسے قطعاً حرام قرار نہ بھی دے سکیں تب بھی یہ مسئلہ احتیاط کا تقاضا کرتا ہے۔

یہاں ایک نکتہ قابلِ توجہ ہے' اور وہ یہ کہ اگر انسان کو اس بات کا بہت زیادہ امکان نظر آئے کہ تمباکونوشی جلد یا بدیر (چاہے بیس سال بعد ہی سہی) اسے کسی مہلک بیماری میں مبتلا کردے گی' یہاں تک کہ ڈاکٹروں پر بھی واضح طور پر ثابت ہوجائے کہ تمباکونوشی انسان کی ہلاکت کا موجب ہے' تو ایسی صورت میں انسان کے لیے اس کا استعمال حرام ہے۔

ہم تمام ایسے لوگوں سے، جو خود کو کسی چیز کا عادی بنانا چاہتے ہیں، کہتے ہیں کہ اس چیز کے نفع اور نقصان پہنچانے کی خاصیت کا موازنہ ضرور کریں۔ اگر اس عادت میں کوئی فائدہ نہ پائیں، بلکہ اسکے نقصانات علم میں آئیں، تو دانشمندی کا تقاضا ہے کہ خود کو اس عادت سے دور رکھیں۔ اور اگر اسکے عادی ہو چکے ہوں، تو اسے ترک کر دیں۔ کیونکہ کوئی صاحبِ عقل و دانش انسان اپنے آپ کو نقصان میں نہیں ڈالتا اور خود کو نقصاندہ عادت میں مبتلا رہنے کی اجازت نہیں دیتا۔

جب ہم تمباکو نوشی کے مسئلے کا مطالعہ کرتے ہیں، تو ہمیں سوائے عادت کے اس کا کوئی اور محرک و سبب نظر نہیں آتا۔ لہٰذا انسان پر لازم ہے کہ اس عادت سے اجتناب کرے اور اگر اس ناپسندیدہ عادت میں مبتلا ہو جائے، تو اپنے نفس پر غلبہ حاصل کر کے اسے ترک کر دے۔

آپ خود ہی بتایئے کہ لوگ ایسے انسان کو کیا نام دیں گے جو انگیٹھی کے سامنے بیٹھ کر اسکے دھوئیں میں گہرے گہرے سانس لے؟ لوگ اسے اس بے وقوفانہ عمل پر دیوانہ قرار دیں گے۔ جبکہ اس شخص اور اس انسان کے درمیان کوئی فرق نہیں جو سگریٹ کا دھواں اپنے پھیپھڑوں میں انڈیلتا ہے۔

☆ منشیات کے بارے میں اسلام کا حکم کیا ہے؟

○ منشیات کا استعمال حرام ہے۔ کیونکہ عقل اور صحت پر ان کے اثرات شراب کے اثرات سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔

شراب کے حرام ہونے کا سبب اس کا نشہ آور ہونا اور مستی کا شکار کر دینا ہے، جس کی وجہ سے انسان ایک خاص مدت کے لیے اپنی عقل و سمجھ سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ لیکن منشیات کا عادی انسان عقل کھو بیٹھنے کے ساتھ ساتھ تباہ کن جسمانی، روحانی، نفسیاتی اور ذہنی نقصانات کا سامنا بھی کرتا ہے۔

☆ منشیات کی بعض اقسام جیسے عربستانی چائے اور تریاک کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

O ہمیں معلوم نہیں کہ یہ چیزیں مست کرنے کی کتنی صلاحیت رکھتی ہیں، لیکن اگر ان کے اثرات دوسری معروف منشیات جیسے ہوں، تو یہ بھی حرام ہوں گی۔

☆ ''غیر مائع مسکر'' سے فقہا کی کیا مراد ہے؟

O فقہا حشیش جیسے مواد کو مسکر (یعنی مستی پیدا کرنے والا) سمجھتے ہیں۔

☆ ایسے مواد کی کاشت کے بارے میں کیا حکم ہے؟

O اگر ان چیزوں کا استعمال حرام ہے، تو ان کی خرید و فروخت، تجارت اور فروخت کی غرض سے ان کی کاشت بھی جائز نہیں۔

فلم اور ٹیلی ویژن

☆ فلم اور ٹیلی ویژن کس حد تک حلال ہیں؟

O فلم اور ٹیلی ویژن تصاویر نشر کرنے والے دو ذرائع ہیں۔ ان کے حلال یا حرام ہونے کا حکم ان تصویروں سے وابستہ ہے جو ان سے نشر ہوتی ہیں۔ اگر یہ تصاویر نفسانی خواہشات اُبھاریں، اخلاق خراب کریں اور جرائم کا سبب بنیں، تو فلم اور ٹیلی ویژن دیکھنا حرام ہے، بصورتِ دیگر حلال ہے۔

داڑھی صاف کرنا

☆ کیا داڑھی صاف کرنا واضح طور پر حرام ہے؟

O ہمارے نزدیک تو اس کا حرام نہ ہونا ثابت ہے۔ کیونکہ داڑھی مونڈنا (بعض علما کے نزدیک) اس حدیث کی بنا پر حرام ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ: حفوا الشوارب واعفوعن اللحی ولا تشبهوا باليهود. (مونچھوں کو تراشو اور داڑھی کو (لمبا) چھوڑ دو

اور یہود کی مشابہت اختیار نہ کرو) لہٰذا اگر اس حکم کی بنیاد یہودیوں سے عدم مشابہت اصول ہو تو یہ حکم اس زمانے سے مخصوص سمجھا جائے گا جب مسلمان اقلیت میں ہوں ا دوسروں کی اکثریت ہو اور اس صورتحال کا تقاضا ہو کہ مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیا فرق برقرار رکھا جائے۔

اس بارے میں حضرت علیؑ کی ایک روایت موجود ہے کہ جب آپ سے پیغمبر اسلا کی اس حدیث: غیروا الشیب ولا تشبھوا بالیھود. (اپنے بالوں کو خضاب کروا یہودیوں کی مانند نہ ہو جاؤ) کے بارے میں سوال کیا گیا تو آپ نے اسکی وضاحت م فرمایا: رسولِ اکرمؐ نے یہ حکم اس زمانے میں دیا تھا جب مسلمانوں کی تعداد قلیل تھی۔ لیکن آ مسلمانوں کی تعداد بڑھ چکی ہے اور دین کی بنیادیں مضبوط ہو چکی ہیں۔ لہٰذا اب اس سلس میں لوگوں کو اختیار ہے۔(۱)

اس بارے میں موجود احادیث سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اسلا دعوت کے ابتدائی ایام کے تقاضوں کے پیش نظر داڑھی مونڈنا حرام قرار دیا گیا تھا، لیک اسکے بعد داڑھی مونڈنا بدنامی کا سبب بن گیا اور جب کسی کو سزا دینا یا رسوا کرنا مقصود ہوتا اسکی داڑھی مونڈ دیتے تھے، جس طرح آج کے دور میں (کبھی کبھی) سزا کے طور پر لوگوں گنجا کر دیا جاتا ہے۔

بعض فقہا داڑھی مونڈنے کے حرام ہونے کے بارے میں (اہلِ شرع کی) سیر

۱۔ داڑھی ایمان کی علامات میں سے ہے۔ لہٰذا ایک با ایمان انسان کے لیے اس کا مونڈنا مناسب نہیں سوائے اس صورت میں جبکہ ایسے حالات پیش آجائیں جو اسے داڑھی مونڈنے پر مجبور کر دیں، جیسے تنگی مشقت میں پڑ جانا، ضرر اور نقصان کا خوف ہونا اور کٹھن و دشوار معاشرتی حالات۔ (المسائل الفقہیہ ج ۱۔ ص ۲۰۴۔ از آیت اللہ فضل اللہ)

سے استدلال کرتے ہیں۔ لیکن یہ سیرت داڑھی مونڈنے کے حرام ہونے پر کسی طرح بھی دلالت نہیں کرتی، کیونکہ ممکن ہے اس سیرت کی بنیاد فقہا کے فتوے ہوں، یا مسلم معاشروں کا عام معمول ہو، جس میں داڑھی مونڈنے کا رواج نہیں۔

☆ کیا فقہا میں سے کوئی داڑھی مونڈنے کے جواز کا قائل ہے؟

O آیت اللہ خوئی احتیاط کے قائل تھے، آپ نے اسکے حرام ہونے کا فتویٰ نہیں دیا۔

جنسِ مخالف سے مصافحہ

☆ جنسِ مخالف سے مصافحے کا کیا حکم ہے؟

O بنیادی لحاظ سے مرد کے لیے نامحرم عورت سے مصافحہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ پیغمبر اسلامؐ سے بیعت کے واقعات میں آیا ہے کہ جب خواتین آنحضورؐ کی بیعت کی غرض سے آتیں، تو آپ فرماتے: میں عورتوں سے مصافحہ نہیں کرتا۔ اس موقع پر پانی سے بھرا ایک طشت رکھ دیا جاتا، جس کے ایک طرف عورتیں اپنے ہاتھ ڈالتیں اور دوسری طرف پیغمبرؐ اپنا ہاتھ ڈبوتے۔ اور یوں بیعت کا عمل انجام پاتا۔

اہلِ بیتؑ کی ایک حدیث میں ہے:

"لایصافح الرجل المراۃ التی لیست لہ بمحرم الامن وراء الثیاب."

"مرد نامحرم عورت سے مصافحہ نہ کرے، مگر یہ کہ کپڑے کے اوپر سے۔"

البتہ اگر نامحرم عورت سے ہاتھ نہ ملانے کے نتیجے میں اسے لازماً انتہائی تباہ کن اور ناقابلِ برداشت نقصان اٹھانا پڑے گا، تو ایسی صورت میں نامحرم سے مصافحہ کرنا جائز ہو جائے گا۔

☆ کبھی کبھی فریق ثانی ہاتھ نہ ملانے کو اپنی بے عزتی سمجھتا ہے۔ ایسی صورت میں کیا

حکم ہے؟

○ اس صورت میں انسان کو چاہیے کہ پہلے ہی سے واضح الفاظ میں اُسے مسئلہ بتادے۔ اہم بات یہ ہے کہ انسان انتہائی سخت اور دشوار حالات کا شکار نہ ہو، جن کا برداشت کرنا عام حالات میں اسکے لیے ممکن نہیں ہوتا۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ. (دین میں کوئی زحمت قرار نہیں دی ہے۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۷۸)

سوال یہ پیش آتا ہے کہ مشکل اور دشوار حالات کن حالات کو کہیں گے؟ تو یہ مختلف افراد اور مختلف حالات کے لحاظ سے متفاوت ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی انسان کو ایسے مخصوص حالات پیش آتے ہیں کہ اگر نامحرم سے ہاتھ نہ ملائے تو اسے جیل جانا پڑے گا۔ یا اس پر کسی خاص گروہ سے وابستگی کا الزام لگ جائے گا۔ جیسا کہ ہم ایسی حکومتوں میں مشاہدہ کرتے ہیں جو ان طریقوں سے اسلامی تحریکوں کے ارکان کو پہچانتی ہیں۔

اہلِ کتاب کی طہارت

☆ اہلِ کتاب کی طہارت کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ ہماری رائے ہے کہ تمام انسان پاک ہیں، چاہے وہ مسلمان ہوں چاہے کافر۔ کیونکہ کوئی بھی انسان ذاتاً نجس نہیں ہے۔ ممکن ہے کسی کا عقیدہ نجس ہو، اسکے افکار و احساسات نجس ہوں۔ لیکن شریعت کے گہرے مطالعے اور تحقیق کی بنیاد پر ہم کہتے ہیں کہ کسی بھی انسان کی ذاتی نجاست کے بارے میں کوئی دلیل نہیں پائی جاتی۔ لہٰذا مومن بھی اور کافر بھی نجاسات سے آلودہ ہونے کی وجہ سے نجس ہوتے ہیں۔

شہید آیت اللہ سید محمد باقر الصدرؒ کی رائے بھی یہی تھی کہ تمام انسان پاک ہیں۔ البتہ غیر اہلِ کتاب کافر کے بارے میں پائے جانے والے شبہ اجماع کی وجہ سے اسکے بارے میں آپ احتیاط کے قائل تھے۔

☆ اس نجاست سے کیا مراد ہے؟ جس کی جانب قرآنِ مجید نے اشارہ کیا ہے؟

○ قرآنِ کریم میں نجاست سے مراد شرک کی نجاست ہے' شرک کی ناپاکی (فکری گندگی) ہے۔ ہمارے اس دعوے کی دلیل وہ استدلال ہے جو خود آیت میں کیا گیا ہے۔ ارشادِالٰہی ہے: اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ. (درحقیقت مشرکین نجس ہیں' لہٰذا خبردار انہیں مسجد الحرام میں داخل نہ ہونے دینا۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۲۸)

اگر یہاں نجاست سے مراد یہ ہوتی کہ مشرکین ذاتاً نجس ہیں' تو ہم جانتے ہیں کہ اگر گیلی نہ ہو تو کوئی نجاست منتقل نہیں ہوتی۔ لہٰذا ان کی نجاست اس صورت میں منتقل ہوتی جب وہ گیلے خانۂ خدا میں داخل ہوتے۔ وہ فقہا بھی جو کہتے ہیں کہ کفار ناپاک ہیں' وہ کفار کی نجاست کے ثبوت میں اس آیت سے استدلال نہیں کرتے' کیونکہ اس آیت میں نجاست سے مراد معنوی نجاست ہے۔

☆ ٹھیک ہے' لیکن اہلِ کتاب کے ذبح کیے ہوئے حیوان کا گوشت کھانے کا کیا حکم ہے؟

○ اس اعتبار سے حلال نہیں کہ گوشت کا حلال ہونا ذبح کے موقع پر خدا کا نام لینے سے مشروط ہے۔ یہی نہیں بلکہ مشہور ہے کہ ذبح کرنے والا لازماً مسلمان ہونا چاہیے۔ لیکن ہم اہلِ کتاب کے ذبیحے کو حلال کے قریب قریب سمجھتے ہیں' جیسا کہ "مسالک" میں شہید ثانیؒ نے بھی اسی رائے کا اظہار کیا ہے۔ لہٰذا ہمارے نزدیک مذکورہ مفروضے میں حرمت کا حکم احتیاط پر مبنی ہے' جیسا کہ شہید صدر کا مؤقف بھی یہی ہے۔

موسیقی اور اس کا حلال یا حرام ہونا

☆ موسیقی اور اسی طرح غنا کے بارے میں متضاد آراء پائی جاتی ہیں' کیا کوئی فقہی رائے ایسی ہے جو اس نزاع کا خاتمہ کر دے؟

○ جب ہم ان فقہی نصوص کا مطالعہ کرتے ہیں جن کی بنیاد پر غنا کو حرام قرار دیا گیا ہے' تو

دیکھتے ہیں کہ وہاں اس آیۂ کریمہ سے بھی استدلال کیا گیا ہے جس میں ارشادِ الٰہی ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْتَرِيْ لَهْوَ الْحَدِيْثِ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ. (لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو مہمل باتوں کو خریدتا ہے' تاکہ ان کے ذریعے بغیر سمجھے بوجھے لوگوں کو راہِ خدا سے گمراہ کردے۔ سورۂ لقمان ۳۱۔ آیت ۶) یا اس آیت کو بطورِ سند پیش کیا گیا ہے: وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ. (اور لغو اور مہمل باتوں سے اجتناب کرتے رہو۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۰)

ان آیات میں لَهْوَ الْحَدِيْث اور قَوْلَ الزُّوْرِ کو غنا کے ایک مصداق کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ بعض احادیث میں بھی غنا کو باطل کے دائرے میں قرار دیا گیا ہے اور ایک دوسری حدیث میں ذکر ہوا ہے کہ ایک شخص جو ہمسائے کی کنیزوں کے گانے سنتا تھا' اسے استغفار کا حکم دیا گیا۔

مذکورہ مباحث سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ غنا اور موسیقی کے شرعی طور پر حرام ہونے کی بنیاد درجِ ذیل عناوین ہیں۔

یہ کہ غنا ایسا ہو جس کا لحن اور مضمون خدا کی یاد سے غافل کردے اور اس میں ہیجان خیز عناصر پائے جائیں۔

ہم اس مقام پر اس بحث کے فقہی دلائل اور مبانی کا ذکر کرنا نہیں چاہتے' کیونکہ اسکے لیے ایک طویل بحث درکار ہے' لیکن ہم اس بات پر عقیدہ رکھتے ہیں کہ ایسی موسیقی جو نفسانی خواہشات کی تحریک کا سبب نہ بنے' اور انسان کو ایسا بےخود نہ کردے کہ وہ اپنی فطری حالت سے باہر نکل جائے' نیز شہوت انگیز مضامین پر مشتمل نہ ہو' تو اس بنیاد پر ممکن ہے کہ ایسی موسیقی کو حلال قرار دیا جاسکے۔

وہ موسیقی جو کلاسیکی موسیقی کہلاتی ہے اگر اس میں یہی شرائط موجود ہوں' تو وہ بھی حلال ہے۔ اسی طرح مثبت جذبات ابھارنے والی یا رزمیہ موسیقی یا کلی طور پر ہر وہ موسیقی جو روح کو بلندی اور بالیدگی بخشے اور اعصاب کو سکون پہنچائے' اسکے حلال ہونے کا حکم

لگایا جائے گا' بشرطیکہ وہ مذکورہ بالا شرائط پر پوری اترتی ہوں۔

وہ فقہا جنہوں نے غنا کے حرام ہونے کی شرائط میں اسکی مجالسِ فسق و فجور سے مناسبت کو شامل کیا ہے' ان کی مراد شاید یہی شرائط ہوں۔

مضمون یا لحن

☆ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ غنا (گانا) اس صورت میں حرام ہے جب وہ موسیقی کے ساتھ ہو' اس بارے میں جنابِ عالی کا کیا خیال ہے؟

O غنا کی حرمت (فقہا کی مشہور رائے کے مطابق) اسکی موسیقی کی خاصیت کی وجہ سے ہے اور اگر غنا کا مضمون بھی حرام پر مشتمل ہو' تو یہ ایک علیحدہ حرام ہے۔

بعض فقہا (ملا محسن فیض کاشانی) اس بات کے قائل ہیں کہ غنا (گانے) کا حرام ہونا اسکے مضمون سے وابستہ ہے' اسکے لحن سے تعلق نہیں رکھتا۔ لیکن اکثر فقہا اس رائے سے متفق نہیں' کیونکہ غنا کے موضوع کا تفصیلی مطالعہ کرنے پر نظر آتا ہے کہ غنا کی تاثیر لحن کا نتیجہ ہے اور اگر مضمون اثر انداز ہوتا بھی ہے' تب بھی بنیادی تاثیر سریلی آواز ہی کی ہوتی ہے۔

ہم اس مسئلے میں احتیاط کے قائل ہیں' جو ممکن ہے فقیہِ مذکور (ملا محسن فیض کاشانی) کی رائے سے مطابقت رکھتا ہو۔ اس نقطۂ نظر کے مطابق اگر نعتِ رسولؐ یا عرفانی اشعار موسیقی کے ساتھ ہوں' یا قرآنِ کریم کو ایسی خوش آوازی سے پڑھا جائے جو نفس پر وجد طاری کردے تو ہماری نظر میں یہ چیزیں لہو اور باطل نہیں۔ کیونکہ یہاں لحن اور مضمون ہم آہنگ ہو کر معنی کو عام شکل سے زیادہ مؤثر کن انداز میں آدمی کی روح کی گہرائیوں میں اتار دیتے ہیں۔

حلال کاموں میں آلاتِ لہو کا استعمال

☆ آلاتِ لہو کے استعمال کے حرام ہونے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

O کچھ احادیث میں آلاتِ لہو کے استعمال کے حرام ہونے کا ذکر ہوا ہے۔ لیکن ان

احادیث میں لہو سے مراد "لہوِ حرام" ہے۔ بعض فقہا کی نظر میں ایسے آلاتِ لہو جو حلال زیادہ حرام کاموں میں استعمال ہوتے ہوں ان کا حلال کاموں میں استعمال بھی حرام۔ لیکن ہماری رائے یہ ہے کہ حلال کاموں میں آلاتِ لہو کے استعمال میں کوئی مضائقہ چاہے ان آلات کا حرام استعمال زیادہ ہوتا ہو چاہے حلال اور حرام دونوں میں مسا استعمال ہوتے ہوں۔

المیہ موسیقی کے آلات

☆ المیہ موسیقی کے آلات "جیسے بانسری" کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

○ اس میں معیار اور پیمانہ غم یا خوشی ایجاد کرنا نہیں۔ کیونکہ ممکن ہے کسی وقت حزنیہ آواز یا موسیقی بھی انسان کو بے خود کر دے۔ یعنی حزن میں بھی اس پر لہو کی حالت طاری ہو جائے۔ لہٰذا فقہا کی مشہور رائے کی رو سے اس مسئلے میں ایک طرح کی احتیاط ملحوظ رکھنا چاہیے۔

عرفانی اشعار گانا

☆ اکثر عرفانی اشعار عشقیہ مضامین کے حامل ہوتے ہیں اس قسم کے اشعار کو ترنم سے پڑھنے کا کیا حکم ہے؟

○ اگر کوئی شعر اپنے گہرے معنی کے لحاظ سے عرفانی ہو لیکن اس کا ظاہر اور مضمون عشقیہ ہو اور لوگ بھی اسے یہی سمجھیں تو وہ حلال کے دائرے میں نہیں آئے گا۔ کیونکہ مدِ نظر وہ اثرات ہیں جو انسانی نفس پر مرتب ہوتے ہیں۔

کلاسیکی موسیقی

☆ ایک مرتبہ پھر ہم کلاسیکی موسیقی کی طرف آتے ہیں اور اس بارے میں آپ کی رائے جاننا چاہتے ہیں؟

○ موسیقی کے بارے میں ہم زیادہ معلومات نہیں رکھتے، جس کے ذریعے موسیقی کی مختلف اقسام کو علیحدہ علیحدہ کر سکیں، لیکن مشہور یہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی لہو وطرب (بے خودی) کی فضا ایجاد کرنے سے زیادہ انسان کو غور وفکر پر ابھارتی ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسکے جواز کا حکم دیا جا سکتا ہے۔

☆ اگر کسی لحن کے حلال یا حرام ہونے کے بارے میں شک ہو تو راہِ حل کیا ہے؟

○ شک کی صورت میں درجِ ذیل قاعدے کی رو سے اسکے حلال ہونے کا حکم لگایا جائے گا:

"کل شیء لک حلال حتی تعرف انه حرام."

"تمہارے لیے ہر چیز اُس وقت تک حلال ہے جب تک اُسکے حرام ہونے کا علم نہ ہو۔"

☆ واضح طور پر بتائیے کہ الحان اهل الفسوق سے کیا مراد ہے؟

○ اس سے مراد وہ نغمہ اور گیت ہیں جو انسان کو رقص پر ابھاریں، اسے مست و مگن کر دیں اور شہوت انگیز ہوں۔

اپنے شوہر کے لیے گیت گانا

☆ کیا عورت کو اپنے شوہر کے لیے گانا گانے کی اجازت ہے؟

○ حرام غنا (گیت اور گانا) ہر صورت میں حرام ہے اور عورت کو بھی اس انداز میں اپنے شوہر کے لیے گانے کی اجازت نہیں۔ مزید یہ کہ اگر کوئی غنا یا گانا حرام اور قَوْلَ الزُّوْر اور لَهْوَ الْحَدِيْث کا مصداق ہو، تو انسان کے لیے خود اپنے لیے گانا بھی جائز نہیں۔

شادی کی تقریبات میں گیت گانا

☆ شادی کی تقریبات میں گانا گانے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟

○ ایسی احادیث موجود ہیں جو ظاہراً شادی کی تقریبات میں گانا گانے کو مستثنا قرار دیتی

ہیں۔ البتہ ان میں آلاتِ موسیقی کے بارے میں ذکر نہیں ہوا ہے۔

وہ احادیث جو شادی کی تقریبات میں گانے کے حلال ہونے پر دلالت کرتی ہیں، ان میں پہلے ذکر شدہ قیود کا تذکرہ نہیں کیا گیا ہے، لیکن یہ بات ظاہر ہے کہ کلام کو حرام نہیں ہونا چاہیے، البتہ ممکن ہے کہ لہو ہو یا یہ کہ گانے کا لحن طرب آور ہو۔

مردوں کی محفل میں عورت کا شعر پڑھنا

☆ کیا عورت کے لیے نامحرم مردوں کے سامنے اسلامی اشعار پڑھنا جائز ہے؟

○ آیتِ قرآن ہے: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ. (لہٰذا کسی سے ناز و ادا سے بات نہ کرنا کہ جس کے دل میں بیماری ہو اسے لالچ پیدا ہو جائے۔ سورۂ احزاب ۳۳۔ آیت ۳۲)

یعنی عورت کا غیر مردوں کے سامنے آواز کو نرم و نازک بنانا اور اُن کے ساتھ نرم اور لطیف لہجے میں بات چیت کرنا شرعاً حرام ہے۔ کیونکہ یہ عمل منفی نتائج پر منتہی ہوتا ہے، جس کی طرف خود آیت میں اشارہ موجود ہے۔

جذبات بھڑکنے کا مسئلہ

☆ جنابِ عالی، کیا آپ کی یہ رائے مطلق اور تمام ہی مواقع کے لیے ہے؟

○ یہ مسئلہ ہیجان انگیزی کے پہلو سے مربوط ہے۔ لہٰذا اگر کوئی عورت اس انداز سے شعر پڑھے جو ہیجان انگیزی اور شہوت کے جوش میں آنے کا باعث نہ بنے، تو حرام نہیں ہے۔ مضائقہ اُس وقت ہے جب عورت کی آواز شہوت انگیزی کا سبب بنے۔ کچھ عورتوں کا شعر پڑھنا ہیجان کا موجب نہیں ہوتا، جبکہ بعض عورتوں کی آواز قدرتی طور پر مترنم ہوتی ہے اور ہیجان انگیز بن جاتی ہے۔ یہی مفہوم وہ آیت بیان کرتی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ: فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ. (کسی سے ناز و ادا سے بات نہ کرنا)

☆ بعض لوگ کہتے ہیں کہ: ان صوت المراة عورة. (یعنی عورت کی آواز بھی عورت ہے، یعنی اسے پوشیدہ ہونا چاہیے) اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

O ہماری رائے یہ نہیں ہے، کیونکہ عورتیں رسولِ کریمؐ اور ائمۂ ہدیٰؑ سے گفتگو کیا کرتی تھیں۔ اسی طرح یہ بھی رواج ہے کہ وہ علما کی خدمت میں آتی ہیں اور ان سے مسائل دریافت کرتی ہیں، بغیر اسکے کہ عورتوں کی صدا کے خلاف کسی دینی پہلو سے احتیاط کو ملحوظ رکھا گیا ہو۔

☆ مذکورہ بالا رائے رکھنے والے حضرات کا کہنا ہے کہ عورتوں کا مردوں سے گفتگو کرنا صرف ضروریات کی حد تک محدود ہونا چاہیے۔ اس بارے میں جنابِ عالی کیا فرماتے ہیں؟

O سیرت کی بنیاد پر ہمارا عقیدہ ہے کہ خواتین عام حالات میں بھی، جہاں ضرورت کا تقاضا نہیں بھی ہوتا تھا مردوں سے گفتگو کرتی تھیں۔ نبی کریمؐ کے زمانے کے بارے میں نقل ہوا ہے کہ خواتین اجتماعی سرگرمیوں میں مردوں کے ساتھ ساتھ حصہ لیتی تھیں۔ حتیٰ بیعت کی غرض سے آنحضرتؐ کی خدمت میں حاضر ہوتی تھیں، مدینہ سے ہجرت کرنے والوں میں خواتین بھی شامل تھیں اور خداوندِ عالم نے مسلمانوں کو ان خواتین کے ایمان کی آزمائش پر مامور کیا تھا۔ ان مقامات میں سے کسی بھی مقام پر ہمیں ضرورت کے مفروضے کی کوئی بنیاد نظر نہیں آتی۔

پیغمبر اسلامؐ عورتوں کو میدانِ جنگ میں ہمراہ لے جاتے تھے، وہ زخمیوں کا علاج معالجہ کرتیں، پیاسوں کو پانی پلاتیں اور اسی قسم کے دوسرے کام انجام دیتی تھیں، جن کے دوران مردوں کے ساتھ ان کا میل جول اور گفت وشنید لازمی تھی۔

شطرنج اور اُس کا شرعی حکم

☆ اُن احادیث کے بارے میں کچھ فرمایئے جن میں شطرنج کے بارے میں بات کی گئی ہے؟

○ جب ہم شیعہ اور سنی کتب میں شطرنج سے متعلق احادیث کا مطالعہ کرتے ہیں، تو دیکھتے ہیں کہ کچھ احادیث شطرنج کے حرام ہونے کی جانب اشارہ کرتی ہیں، اسے فسق شمار کرتی ہیں اور اسکے قریب جانے سے منع کرتی ہیں، لیکن اس موضوع پر دوسری احادیث بھی پاتے ہیں، جیسے کہ ایک شخص شطرنج کے بارے میں سوال کرتا ہے، تو اسے جواب دیا جاتا ہے کہ اگر خدا اسے حق اور باطل میں فرق کا ذریعہ قرار دے تو شطرنج کس طرف ہوگی؟ وہ کہتا ہے: باطل کی طرف، تو اس سے کہتے ہیں: پس تمہیں باطل سے کیا لگاؤ؟ ایک اور شخص شطرنج کے بارے میں دریافت کرتا ہے تو اسے جواب ملتا ہے کہ: اس میں کوئی اچھائی نہیں۔ ایک دوسری حدیث میں شطرنج کی مذمت ان الفاظ سے کی گئی ہے: ان الخائض فی الشطرنج کالخائض فی لحم الخنزیر. قال: ماذا یفعل؟ قال: یغسل یدہ. (ایسا شخص جو شطرنج کی بازی میں مشغول ہو، اس شخص کی مانند ہے جو سور کا گوشت کھا رہا ہو۔ مخاطب نے سوال کیا: اب وہ کیا کرے؟ کہا: اپنے ہاتھ دھوئے) یہ حدیث اس عمل سے نفرت کا کنایہ ہے۔

مذکورہ بالا احادیث شطرنج کے حرام ہونے سے زیادہ اسکی کراہت اور ناپسندیدگی کی جانب اشارہ کرتی ہیں، لیکن ہم آیۂ قرآن: فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ. (لہٰذا تم بتوں کی ناپاکی سے پرہیز کرو۔ سورۂ حج ۲۲۔ آیت ۳۰) کی تفسیر میں آنے والی بعض احادیث میں دیکھتے ہیں کہ وہاں اس سے مراد شطرنج ہے، جس سے پرہیز اور دوری کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ یہاں اس کا مطلق حرام ہونا مقصود نہیں ہے، بلکہ قدرے یقینی یہ ہے کہ اس حرام ہونے میں شطرنج کی وہ صورت شامل ہے جو جوئے کے ساتھ کھیلی جائے۔ کیونکہ شطرنج پر "میسر" کا اطلاق اسی جانب اشارہ ہے۔ اس لیے کہ "میسر" جوئے اور قمار کے مفہوم کا حامل ہے۔

شطرنج کے حلال ہونے کا قول

☆ کیا شطرنج کے حلال ہونے کے قول سے اتفاق کیا جا سکتا ہے؟

○ امام خمینیؒ نے شطرنج کے حلال ہونے کی رائے اس بنیاد پر دی ہے کہ آپ کے خیال میں اسکے حرام دیے جانے کی وجہ اسے جوا کھیلنے کا ایک آلہ سمجھنا تھا۔ اب جبکہ شطرنج جوا کھیلنے کا ایک آلہ نہیں سمجھی جاتی، اس لیے حلال ہے۔ اس نظریے کی تائید بعض احادیث سے بھی ہوتی ہے، جن میں فرمایا گیا ہے کہ: ان الشطرنج من المیسر. (شطرنج ایک قسم کا جوا ہے)

اس قسم کی احادیث سے ہرگز مراد یہ نہیں ہے کہ شطرنج میں جوئے کی خصوصیات نہ بھی پائی جائیں تب بھی وہ جوئے کے معنی کی حامل ہوگی (یا تب بھی اسے جوا کہا جائے گا) جبکہ ہمارے علم میں یہ بات بھی ہے کہ جوئے میں لازماً عوض اور منافع پایا جاتا ہے۔

لہٰذا اگر ہم احادیث سے یہ نتیجہ اخذ کرسکیں کہ شطرنج جوئے کا آلہ ہونے کی وجہ سے حرام ہے، تو ہم شطرنج کے حلال ہونے کے بارے میں امام خمینیؒ کے قول سے اتفاق کر سکتے ہیں۔ لیکن اگر ایسا نتیجہ اخذ نہ کرسکیں، تو اسکے حلال یا حرام ہونے کے حکم کے بارے میں ہمیں احتیاط کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔ کیونکہ یہ مسئلہ مزید تحقیق کا متقاضی ہے۔ البتہ شطرنج کے حلال ہونے کے قول کا درست ہونا بعید نہیں۔

☆ ڈومینو اور تاش کا کیا حکم ہے؟

○ ہماری اجتہادی رائے یہ ہے کہ جوا کھیلنے والے آلات، یا ان سے ملتی جلتی چیزوں سے بغیر شرط باندھے کھیلنا حلال ہے۔ ہم علما کے درمیان معروف اس رائے سے متفق نہیں ہیں جس کے تحت وہ جوئے کے لیے استعمال ہونے والے آلات سے، بغیر بازی لگائے کھیلنے کو بھی حرام قرار دیتے ہیں اور ان سے کھیلنے کی مطلق حرمت کا حکم دیتے ہیں۔

ہماری رائے یہ ہے کہ جوئے کے آلات یا ان جیسے جدید آلات سے (بغیر بازی

لگائے) کھیلنا حلال ہے۔اس بنیاد پر تاش اوراس جیسی چیزوں سے کھیلنا حرام نہیں۔ہم اپنی اس رائے میں ایران کے ایک بزرگ عالم آیت اللہ سید احمد خوانساری کے ہم نوا ہیں۔

☆ ایسے مقامات جہاں جوا کھیلا جاتا ہے اوراسی طرح کے دوسرے مقامات میں آمدو رفت رکھنے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ بعض اوقات ایسے مراکز میں آمدورفت ثانوی عنوان اختیار کر لیتی ہے۔یعنی ممکن ہے اس آمدورفت کے نتیجے میں انسان جوئے کی طرف راغب ہوجائے' یا دوسرے حرام کاموں میں مبتلا ہوجائے' یا مومن کی ہتکِ حرمت کا موجب ہو اور اسکی شہرت کو نقصان پہنچائے۔ایسی صورت میں ان مراکز میں آمدورفت حرام ہے۔

ہاں' اگر کسی ضرورت کے تحت' مثلاً کسی سے گفتگو کی غرض سے کوئی ایسے مراکز میں جانا چاہے' جبکہ یہ عمل اسکی اہانت' ہتکِ حرمت اور شہرت کو داغدار کرنے کا موجب نہیں بنے گا' تو اسکے وہاں جانے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

دست شناسی اور قسمت کا حال

☆ ہمارے یہاں نشر ہونے والے نوجوانوں کے درمیان مقبول جرائد میں' ستاروں (برج)' ہاتھ کی لکیروں اور دوسرے وسائل کے ذریعے مستقبل کی پیش گوئیوں پر مشتمل صفحات کارواج ہے۔اس بارے میں دو سوال سامنے آتے ہیں۔ایک یہ کہ اسلام اس بارے میں کیا کہتا ہے؟ دوسرے یہ کہ پیش گوئی یا غیب گوئی کا سحر (جادو) کے ساتھ کیا تعلق ہے؟

○ اس خیال کی کوئی قابلِ اعتبار بنیاد نہیں ہے کہ یہ وسائل غیب یا مستقبل کے بارے میں جاننے کا ذریعہ ہیں۔کیونکہ ان وسائل میں سے کسی کا بھی انسانی یا کائناتی حوادث سے کوئی تعلق نہیں۔بلکہ برج اور ستاروں پر یقین کی بنیاد بعض سابقہ غیر اسلامی عقائد میں ملتی ہے' جن کے ماننے والے انسان کے مقدر اور قدرتی حوادث میں ستاروں کے اثرات کے

قائل تھے۔ یہ عقیدہ انہیں علمِ فلکیات کے حصول کی ترغیب دیتا تھا اور وہ اسکے ذریعے مستقبل کا علم حاصل کرتے تھے اور حساب کتاب کے ذریعے بتاتے تھے کہ کون شخص کس ستارے کا حامل ہے اور کس ستارے کے کیا اثرات ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔

اخبارات اور جرائد میں شائع ہونے والی پیش گوئیاں

یہ چیزیں ہمارے معاشرے میں بھی عام ہو رہی ہیں اور اکثر رسائل و اخبارات اپنے قارئین کو مشغول رکھنے کی خاطر صفحات کے صفحات اس قسم کے مسائل کے لیے مخصوص کرتے ہیں کہ مثلاً فلاں ستارے کا حامل شخص فلاں مزاج اور حالات کا مالک ہوتا ہے اور اسکے حالات رفتہ رفتہ ایسے بدل جائیں گے۔

نہ صرف یہ کہ ہمیں ان چیزوں کی کوئی اسلامی بنیاد نہیں ملتی، بلکہ ایسی احادیث موجود ہیں جو علمِ غیب جاننے کے لیے علمِ نجوم کے حصول کی ممانعت کرتی ہیں۔ ائمہ معصومینؑ میں سے کسی نے علمِ نجوم سے استفادہ کرنے والے ایک شخص سے سوال کیا: کیا تم مقدر کی پیش گوئی کرتے ہو؟ اس نے کہا: جی ہاں! فرمایا: اپنی کتابوں کو آگ میں جھونک دو۔

جہاں تک رہی فنجان کے ذریعے فال نکالنے یا روحوں کو بلانے کی بات، تو ان کے بارے میں عرض ہے کہ ایسے کام کرنے والوں کے پاس ان کی حقیقت اور سچائی کی کوئی دلیل نہیں۔ ہم ان چیزوں کی مطلق نفی نہیں کر رہے، کیونکہ ہم نے ان کے بارے میں کافی تحقیق اور مطالعہ نہیں کیا ہے۔ لیکن لوگوں سے ان چیزوں کے بارے میں جو کچھ سنا ہے وہ ان کی کسی قسم کی سچائی اور حقیقت کا عکاس نظر نہیں آتا۔

اگر ہم ان کاموں کو انجام دینے والوں کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لیں، تو انہیں ان لوگوں کے اوہام اور تخیلات میں شمار کریں گے۔ اگر ان وسائل کے ذریعے کی جانے والی پیش گوئیاں بعض مواقع پر درست ثابت ہوتی بھی ہیں، تو یہ ان وسائل کی خاصیت اور طبیعت

کی وجہ سے نہیں ہے' بلکہ ایسا اتفاقی طور پر ہوتا ہے' بالکل اسی طرح جیسے کچھ لوگ سال کے آغاز میں مستقبل میں پیش آنے والے حوادث و واقعات کی پیش گوئی کرتے ہیں' جن میں سے کچھ باتیں سچی نکلتی ہیں اور کچھ جھوٹی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ لوگ ان پیش گوئیوں کو تو فراموش کردیتے ہیں جو پوری نہیں ہوتیں' جبکہ پوری ہونے والی پیش گوئیوں کو یاد رکھتے ہیں (اور انہیں ان کی سچائی کی دلیل قرار دیتے ہیں)۔ شاید درجِ ذیل حدیث اسی بارے میں ہے' جس میں معصوم کا ارشاد ہے:

"کذب المنجمون ولو صدقوا."

"منجم جھوٹ بولتے ہیں چاہے سچ کہتے ہوں۔"

مراد یہ ہے کہ ان کی کہی ہوئی سچی باتیں اس قاعدے کی درستی اور صحت کی علامت نہیں جس سے انہوں نے استفادہ کیا ہے' بلکہ محض اتفاقی طور پر ان کی کچھ پیش گوئیاں درست نکلتی ہیں۔

☆ لیکن ان ذرائع سے کشف کردہ بعض معاملات بالکل اسی طرح واقع ہوتے ہیں' جیسے وہ کہتے ہیں؟

○ ہمارے خیال میں یہ امور انسان کو کسی ایسے کلی وسیلے کے وجود کا قائل نہیں کرتے جس کے ذریعے مستقبل سے آگاہ ہوا جاسکے۔

بعض لوگ مخصوص فہم و فراست کے مالک ہوتے ہیں اور مقابل انسان کی شخصیت کی بعض چیزوں کو دریافت کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ مسلسل مشق اور ان وسائل سے پیہم سروکار کے نتیجے میں کافی تجربہ حاصل کرلیتے ہیں' جس کی بنا پر وہ مختلف طبقات سے تعلق رکھنے والے انسانوں کی خصوصیات سے واقفیت پیدا کرلیتے ہیں۔ مثلاً یہ جان لیتے ہیں کہ کنوارے یا شادی شدہ مرد یا کنواری یا شادی شدہ عورت کی کیا آرزوئیں' تمنائیں اور مقاصد ہوتے ہیں۔ اس بنیاد پر وہ ایسی باتیں بیان کرتے ہیں جنہیں سن کر گمان ہونے لگتا

ہے کہ ان کی باتوں کی بنیاد صحیح اصول و قواعد ہیں اور کوئی سچا علم ان کا سرچشمہ ہے۔

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں' ہم ان مسائل کی مطلق نفی نہیں کرتے' کیونکہ ان کی نفی کے لیے دلیل کی ضرورت ہے۔ لیکن ہم جس نتیجے تک پہنچے ہیں اور اپنے تجربات کے ذریعے جو کچھ دریافت کر سکے ہیں' اس میں کوئی ایسی چیز نہیں ملتی جو اس ہنر کے حامل افراد کے دعوے کی تائید کر سکے۔

جادو ایک وہمی اور خیالی حالت ہے

☆ کیا آپ کے خیال میں ان وسائل اور جادو کے درمیان کوئی تعلق ہے؟

○ ہم جادو کی حقیقت پر اعتقاد نہیں رکھتے' کیونکہ جب خداوندِ عالم قرآنِ مجید میں جادو کا تذکرہ کرتا ہے تو اسے منفی اور نادرست قرار دیتا ہے: قَالَ مُوسٰی مَا جِئْتُمْ بِهِ السِّحْرُ اِنَّ اللهَ سَيُبْطِلُهٗ. (موسیٰ نے کہا جو کچھ تم لے آئے ہو یہ جادو ہے اور اللہ اس کو بیکار کر دے گا۔ سورۂ یونس ۱۰۔ آیت ۸۱)

قرآنِ کریم کے بقول جادو ایک خیالی حالت ہے' اس کا حقیقت اور واقعیت سے کوئی تعلق نہیں۔ ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں کے قصے میں آیا ہے کہ: فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَ زَوْجِهٖ. (لیکن وہ لوگ ان سے وہ باتیں سیکھتے تھے جن سے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دیں۔ سورۂ بقرہ ۲۔ آیت ۱۰۲) ضروری نہیں کہ یہ باتیں جادو ہوں' اگر ایسا ہو' تو کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہاروت اور ماروت اب بھی باقی ہیں اور ایک ایسی جماعت کو ''جادو'' سکھانے میں مصروف ہیں جو اکثر حالات میں اپنے جہل اور پسماندگی کی وجہ سے پہچانی جاتی ہے؟

تفریح کے وسائل اور ان کے نعم البدل

☆ دشمنانِ اسلام اپنے مذموم مقاصد کے حصول کے لیے انسانوں کے پسندیدہ اور

مرغوب ذرائع سے استفادہ کرتے ہیں۔ مثلاً موسیقی، شراب، مردوزن کی مخلوط محافل اور اس سے مرتب ہونے والی خرابیاں وغیرہ، جبکہ ہم دینی دعوت کے دوران ان چیزوں کا نعم البدل پیش کیے بغیر فقط ان کی قطعی اور یکسر مخالفت پر اکتفا کرتے ہیں اور اگر کبھی کوئی نعم البدل لاتے بھی ہیں تو معاشرہ اسے قبول کرنے سے کتراتا ہے۔

ہمارا سوال یہ ہے کہ آپ کے خیال میں کیا اس صورتحال کا جاری رہنا، آگے چل کر اخلاقی تنزل پر منتہی نہیں ہوگا؟

O ہمارا عقیدہ ہے کہ اسلام نوجوانوں کے اوقات فراغت اور نفسیاتی خلا کو پر کرنے کے لیے خشک اور بے روح وسائل کے استعمال پر اصرار نہیں کرتا۔ بلکہ انہیں پسندیدہ مشاغل اپنانے کی جانب رغبت دلاتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس میدان میں بہت زیادہ وسیع امکانات پائے جاتے ہیں، جیسے مختلف اقسام کی ورزشیں، تیراکی اور ہلکی پھلکی مثبت جذبات ابھارنے والی یا رزمیہ موسیقی جس کے فسق و فجور کی محافل سے عدم تناسب کی وجہ سے فقہا اس پر اعتراض نہیں کرتے۔ اسکے معنی یہ ہیں کہ ہم ہر قسم کی موسیقی کو مسترد نہیں کرتے۔

جہاں تک رہی شراب کی بات تو پھلوں سے حاصل کردہ اور دوسرے ذرائع سے تیار کردہ مشروبات کے سوا نوجوانوں کے لیے شراب کا کوئی نعم البدل فراہم کرنا ممکن نہیں۔ خود شراب بھی اپنے اندر پائی جانے والی بعض خصوصیات کی وجہ سے نوجوانوں کی مرغوب نہیں، بلکہ اسکی جانب جھکاؤ کا سبب جوان کے گردوپیش کا ماحول ہے۔ لہٰذا اسے شراب سے دور رکھنے کے لیے اسکے ماحول کو سالم بنانا چاہیے۔

تفریح کے مثبت ذرائع کی تلاش

☆ تفریح کے مذکورہ وسائل کے جانشین اور قائم مقام ذرائع کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ ہم پر لازم ہے کہ تفریح کے منفی ذرائع کے نعم البدل ہو سکنے والے مثبت تفریحی ذرائع تلاش کریں، تاکہ جوان کے پاس اوقاتِ فراغت باقی نہ رہیں، جنہیں پُر کرنے کے لیے ممکن ہے وہ ان منفی طریقوں کا رُخ کرے۔

مثال کے طور پر جب ہم موسیقی کے بارے میں گفتگو کریں اور جوان سے کہیں کہ یہ حرام ہوتی ہے، تو ہمیں اسے اس فتوے کے بارے میں بھی بتانا چاہیے جس کی رو سے سکون آور، معنویت انگیز، احساس کو پاکیزگی بخشنے والی، اعصاب کو سکون پہنچانے والی، مثبت جذبات ابھارنے والی اور رزمیہ موسیقی حلال ہے۔

جب ہم یہ بات جانتے ہیں کہ بعض ایسے اقوال بھی ہیں جو موسیقی کی بعض اقسام کو حلال قرار دیتے ہیں، تو ہمیں چاہیے کہ بیہودہ، گمراہ کن اور فسق و فجور کی محافل سے مناسبت رکھنے والی موسیقی کے حرام ہونے کا فتویٰ بیان کرنے کے ساتھ ساتھ جائز موسیقی کی جانب بھی نوجوانوں کی رہنمائی کریں۔

اسی طرح جب ہم جوانوں کو تہذیبِ حاضر کے مسلط کردہ رنگ ڈھنگ سے دور رکھنا چاہیں، تو انہیں اس سے مختلف سمت اور جہت دینے کے لیے ان کے مشابہ طور طریقوں سے استفادہ کریں۔ یعنی جوان کو اسکے احساسات اور جذبات سے تعلق رکھنے والے مسائل میں زمانے کی عام ڈگر سے جدا نہ کریں۔ شاید امام علیؑ کی یہ مستند حدیث اسی جانب اشارہ کرتی ہے:

"لا تخلقوا اولادکم باخلاقکم، فانھم خلقوا لزمان غیر زمانکم."

"اپنے بچوں کی تربیت اپنی طرح مت کرو کیونکہ وہ دوسرے زمانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔"

یہاں حضرت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ اپنے بچوں کی اسلامی اخلاق کے برخلاف نئی تہذیب کے منفی اخلاق پر تربیت کرو۔ بلکہ انسانی حیات سے مربوط تفریح طبع، خوشی و سرور،

اجتماعی فعالیت‘ لباس‘ کھانے پینے کے طور طریقوں اور روابطِ عمومی سے متعلق عادات و رسوم مراد ہیں۔

ارتکابِ حرام کی حوصلہ افزائی کا امکان

☆ یہاں ایک دوسرا اعتراض سامنے آسکتا ہے اور وہ یہ کہ نعم البدل اور قائم مقام کے طور پر پیش کیے جانے والے یہ طریقے ممکن ہے ارتکابِ حرام کے سلسلے میں جوانوں کی حوصلہ افزائی کا سبب بنیں؟

O اگر آپ جوان کے سامنے حلال اور حرام کی حدود واضح کر دیں‘ اسے یہ بات جتا دیں کہ وہ حلال کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی اپنے روزمرہ تقاضوں کا جواب دے سکتا ہے اور ایک آرام دہ اور کشادہ زندگی گزارنے کے لیے اس کا لازماً حرام راہیں اختیار کرنا ہی ضروری نہیں‘ تو ایسی صورت میں آپ اسے ایک قابلِ اطمینان اور درست راستے پر گامزن کر سکتے ہیں۔

بعض لوگ کسی حلال امر کو حرام کے ارتکاب کے لیے جواز کی سند بنا لیتے ہیں‘ یہ طرزِ عمل ایک قسم کا انحراف ہے‘ جس کا علاج کیا جانا ضروری ہے۔ لیکن اسکے معنی یہ نہیں ہیں کہ ہم اس خوف سے حلال چیزوں کو حرام قرار دینے لگیں کہ کچھ لوگ ان کے وسیلے سے حرام کا ارتکاب کر لیتے ہیں۔ کیونکہ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے لوگ تو دین کو بھی تجارت کا ذریعہ بنا لیتے ہیں اور اعلیٰ اقدار کو بھی اپنے چھوٹے چھوٹے مفادات کے حصول کا راستہ بنائے ہوئے ہیں۔ یہ امر راہِ حیات میں ایک انحراف کی علامت ہے۔

یہاں ہماری گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ایسی مثبت اور پسندیدہ چیزیں سامنے لانی چاہئیں جو منفی اور ناپسندیدہ چیزوں کی جگہ لے سکیں۔ تاکہ ایک ایسا انسان جسے ان ناشائستہ کاموں سے روکا جائے‘ وہ خلا سے دوچار نہ ہو۔

اسی طرح ہم یہ بھی نہیں کہتے کہ ہر حالت اور ہر صورت میں نعم البدل اور قائم مقام چیزیں فراہم کی جائیں' چاہے قوانینِ الٰہی کے برخلاف فتویٰ دینا پڑے۔ لیکن ہم یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ایسے نعم البدل اور قائم مقام کی ایجاد کے امکانات کے بارے میں مسلسل غور وفکر کرتے رہنا چاہیے جو اصولِ شریعت سے ہم آہنگ ہوں۔ کیونکہ مسلم معاشروں کی ایک مشکل ان معاشروں میں منصوبہ بندی کا فقدان ہے۔ یہاں مشکلات کے بارے میں صرف اسی وقت سوچا جاتا ہے جب وہ سر پر آپڑتی ہیں۔ پھر کبھی کبھی مشکل کو بھی صحیح طور پر نہیں سمجھ پاتے اور یوں راہِ حل نکالنے کی بجائے حواس باختہ ہوجاتے ہیں۔ اسکی وجہ یہ ہوتی ہے کہ انہوں نے اس سلسلے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی ہوتی اور اس بارے میں سوچ بچار کیا ہی نہیں ہوتا۔

عصرِ حاضر میں جوانوں کے لیے تعمیری اور صحت مند تفریح کے بہت سے وسائل ایجاد کیے جاسکتے ہیں۔ اگر بعض علما یا کچھ مشہور علما (بغیر بازی لگائے ہوئے بھی) جوئے کے آلات سے کھیلنے یا شطرنج کو حرام سمجھتے ہیں' تو ایسی جدید فقہی آراء بھی موجود ہیں جو ان سے (بغیر بازی لگائے) کھیلنے کو جائز قرار دیتی ہیں۔ یعنی جوانوں کے اوقاتِ فراغت کو پُر کرنے والی اور مثبت نتائج کی حامل صحت مند تفریح کے وسائل سے استفادے کا راستہ مکمل طور پر بند نہیں ہے۔

اسلام یہ نہیں چاہتا کہ انسان پوری زندگی ٹھہراؤ اور جمود کی حالت میں گزار دے۔ بہت سی احادیث میں آیا ہے کہ: **روحوا القلوب ساعة بعد ساعة.** (تھوڑی تھوڑی دیر بعد اپنے قلوب کو آرام دیا کرو) یا: **ینبغی ان یکون للمومن ثلاث ساعات: ساعة یناجی فیھا ربه 'وساعة یرم فیھامعاشه ' وساعة یخلی فیھا بین نفسه و بین لذتھا فی غیر محرم فانھا عون علی تینک الساعتین.** (مناسب ہے کہ مومن اپنے وقت کو تین حصوں میں تقسیم کرے۔ ایک حصے کو اپنے پروردگار سے مناجات میں بسر

کرے' ایک حصے کو حصولِ معاش کے لیے صرف کرے' اور ایک حصے کو فراغت اور حلال لذتوں کے حصول میں گزارے' کہ یہ (تیسرا) عمل پہلے دو کاموں کی بہتر ادائیگی کے لیے معاون اور مددگار ثابت ہوگا)

لہٰذا صحت مند تفریح اور ایسے اسباب سے استفادہ جو انسان کو لذت' آسائش اور سکون بخشتے ہیں' جن کے ذریعے اس میں نئے سرے سے تازگی اور نشاط پیدا ہوتی ہے اور جو عبادت اور مسلسل کام کی وجہ سے اس پر طاری ہونے والی پژمردگی اور تھکاوٹ دور کرتے ہیں' ایک مطلوب اور پسندیدہ چیز ہے۔

عرف سازی

لیکن عرفِ اجتماعی کے بارے میں ہماری ذمے داری یہ ہے کہ رائج عرف کو سامنے رکھ کر تفریح کے ذرائع کے بارے میں ایک نیا عرف وجود میں لائیں۔ اس موقع پر ہمیں صحت مند تفریح کے ان وسائل اور ذرائع سے استفادہ کرنا چاہیے جو عرف کی نظر میں پسندیدہ ہیں اور ان مختلف ذرائع پر مجتمع ہو جانا چاہیے۔

لہٰذا ہمارے خیال میں اجتماعی' تربیتی' تعلیمی اور تبلیغی میدانوں میں سرگرمِ عمل تمام اسلامی کارکنوں کے لیے ممکن ہے کہ وہ تفریحی ذرائع اور وسائل کے بارے میں وسیع پیمانے پر تحقیق کریں۔ تاکہ ان میں سے اسلامی شریعت اور تربیت کے اصولوں سے سازگار ذرائع اور وسائل کو اختیار کریں اور نئے وسائل تخلیق کریں۔ ہمیں یقین ہے کہ ایسے وسائل کم نہیں ہیں لیکن اسلامی کارکنوں نے اس سمت میں کام ہی نہیں کیا ہے۔ کیونکہ نسلِ جواں کے اس بند دائرے میں پھنسے رہنے کے منفی نتائج کی جانب ان کی توجہ ہی نہیں۔ اور غالباً بہت سے اسلامی کارکنوں کی تربیت خود محدود اور گھٹن زدہ ماحول میں ہوئی ہے۔ لہٰذا وہ ایسے ماحول کے عادی ہیں اور اجتماعی عرف سے بھی دو ہاتھ آگے بڑھ کے اس گھٹن کو باقی رکھنے پر اصرار

کرتے ہیں، وہی اجتماعی عرف جس سے یہ خود بھی خوف کھاتے ہیں۔

☆ دینی افراد کا یہ گروہ، کیا ان امور کو نامناسب سمجھتا ہے، یا ان چیزوں کو مومن کے وقار اور شان کے منافی خیال کرتا ہے؟

○ جیسا کہ ہم جانتے ہیں، ہمارے متاخر مراجعینِ عظام ان متدین افراد سے کہیں زیادہ کھلے ذہن کے مالک اور روشن فکر ہیں۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ آیت اللہ سید ابوالقاسم خوئیؒ مردوں کے مردوں کے درمیان اور خواتین کے خواتین کے درمیان رقص کو مباح سمجھتے ہیں، بشرطیکہ شہوت انگیز نہ ہو، اور آپ ہی کے فتاویٰ اور علمی آراء میں ملتا ہے کہ لہو (تفریح) کے حرام ہونے پر کوئی دلیل نہیں۔ لہٰذا اگر انسان ان تفریحی ذرائع سے استفادہ کرے جن کے حرام ہونے پر کوئی متعین دلیل نہ ہو، تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

البتہ وہ لہوِ غنائی (موسیقی) حرام ہے جو اہلِ فسق و فجور کی محفلوں سے مناسبت رکھتی ہو۔ لیکن اپنے عام مفہوم میں تفریح (لہو) حلال کا حکم رکھتی ہے۔ یہی حال تالیوں کا بھی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ بہت سے متدین افراد آخر کیوں ان لوگوں سے ناراضگی کا اظہار کرتے ہیں اور ان کے ساتھ ایسا طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جیسے وہ حرام کے مرتکب ہوئے ہیں جو کسی شعر، تقریر یا کسی اور بات کی داد دیتے ہوئے، یا حوصلہ افزائی کرتے ہوئے تالیاں بجاتے ہیں۔ ہم کسی بات پر خوشی اور تحسین کے اظہار کے لیے جس طرح درود پڑھتے ہیں اسی طرح تالیاں بھی بجا سکتے ہیں۔

اہم بات یہ ہے کہ ایک ایسی چیز کی وجہ سے لوگوں میں اضطراب پیدا نہ ہو جو شرعاً حلال ہے اور معاشرے کی نگاہ میں بھی مقبول ہے۔ اور جب ایسی چیز کے بکثرت مثبت اثرات بھی ہوں، تو اسے مسترد کیوں کیا جائے؟ ویسے ہم ایسے مواقع پر درود اور تالیوں دونوں کو جمع کر سکتے ہیں۔

اس نکتے پر توجہ ضروری ہے کہ اگر ہم جوانوں کی رہنمائی اور انہیں صحیح ڈگر پر لانے کی

غرض سے ان کی روح، جذبات اور تمناؤں کو ملحوظِ خاطر رکھیں اور انہیں صحت مند تفریح کے مواقع فراہم کریں، تو ہمارا عقیدہ ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ جوان دینی اور ایمانی فضا سے دور نہیں بھاگتے، بلکہ وہ اس سے استفادے کے ذریعے خود کو روحانی اور فکری لحاظ سے مالا مال سمجھنے کے علاوہ کھیل کود اور تفریح کے پہلو سے بھی خود کو بے نیاز اور مستغنی سمجھیں گے۔

حسد اور نظرِ بد

☆ معاشرے میں عام طور پر معروف مسئلے ''حسد'' اور ''نظرِ بد'' اور اس بارے میں پائی جانے والی دعاؤں اور تعویذوں کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

○ ہمارے خیال میں اس بارے میں معاشرے میں جو عمومی سوچ پائی جاتی ہے (جس کے تحت افرادِ معاشرہ لوگوں کے ساتھ رونما ہونے والے حوادث و واقعات میں حسد کے گہرے اثرات کے قائل ہیں) اسکے لیے کوئی قطعی اور واضح دلیل نہیں ملتی۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ بہت سے افراد جن سے لوگ حسد کرتے ہیں، اکثر مواقع پر ان کی حسد ان پر قطعی اثر انداز نہیں ہوتی۔

بہر صورت حسد کے موضوع پر شر (یعنی بُرائی چاہنا اور کینہ وعداوت رکھنا) کا مسئلہ قابلِ مطالعہ ہے، جس سے حاسد حسد کا نشانہ بننے والے شخص کو دوچار کر سکتا ہے۔ کیونکہ اسکے خلاف حاسد کے دل میں پڑی ہوئی گرہ بسا اوقات حاسد کو اسکے قتل، جسمانی نقصان پہنچانے، یا قید میں ڈال دینے پر ابھارتی ہے۔ اسکی مثال حضرت یوسفؑ اور ان کے بھائیوں کی داستان میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

اس بارے میں وارد ہونے والی دعاؤں میں بھی شاید یہی تلقین پوشیدہ ہو کہ حسد کا نشانہ بننے والا شخص ماحول کے مسلط کردہ خوف واضطراب سے چھٹکارے اور دوسروں کے حسد میں مبتلا ہونے کا سبب بننے والی چیزوں کی حفاظت کے سلسلے میں خدا سے پناہ طلب

کرے۔ کیونکہ یہ ان مسائل میں سے ہے جن سے وہ خود اپنے عام غور وفکر کے ذریعے نجات حاصل نہیں کرسکتا۔ لہٰذا اسے خدا سے رجوع کرنا چاہیے۔ تاکہ خدا پر اعتماد کے احساس اوراس سے رجوع کے ذریعے اس کا خوف زائل ہو جائے۔

بہر حال ہم اس قسم کے امور کو یکسر مسترد کرنے کے قابل نہیں' کیونکہ ان کی نفی کے لیے مسئلے کے تمام پہلوؤں پر احاطہ نہیں رکھتے۔ لیکن بہر صورت ہمارے پاس کوئی ایسی اطمینان بخش دلیل نہیں جو عوام میں رائج ان خیالات کی صحت پر حجت ہو' بلکہ ہم حقیقت اور واقعیت کو ان عوامی خیالات کے برخلاف پاتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

ضمیمۂ احادیث (۵)

حجاب و پوشش کے بارے میں

☆ قال امام علی(علیه السلام): ''کنت قاعدا فی البقیع مع رسول الله(ص) فی یوم دجن و مطر. اذا مرت امراة علی حمار فهوت ید الحمار فی وهدة فسقطت المراة ' فاعرض النبیؐ بوجهه . فقالوا: یا رسول الله ! انها متسرولة. فقال: اللهم اغفر للمتسرولات ثلاثا. یاایها الناس: ا تخذوا السراویل فانها من استر ثیابکم' وحصنوا بها نساء کم اذا خرجن.''

امام علیؑ نے فرمایا: ایک روز ہم رسول اللہؐ کے ساتھ بقیع میں بیٹھے ہوئے تھے۔ اس دن بارش ہو رہی تھی۔ اسی دوران گدھے پر سوار ایک عورت کا وہاں سے گزر ہوا۔ یکا یک گدھے کا پاؤں ایک گڑھے میں جا پڑا اور عورت زمین پر گر پڑی۔ یہ منظر دیکھ کر رسول اللہؐ نے اپنا چہرہ دوسری طرف پھیر لیا۔ ہم نے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! اس عورت نے تو شلوار پہن رکھی ہے۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا: ''خداوندا شلوار پہننے والیوں پر رحم فرما۔ آنحضورؐ نے

یہ تین مرتبہ کہا، پھر فرمایا: شلوار کا لباس اختیار کرو، کیونکہ ستر پوشی کی خاطر یہ سب سے بہتر لباس ہے، اور جب تمہاری عورتیں باہر نکلیں، تو انہیں شلوار پہننے کا پابند کرو۔"

☆ وقال(ع): لابنه الحسن (ع): "واكفف عليهن من ابصارهن بحجابك اياهن، فان شدة الحجاب خير لك ولهن من الارتياب وليس خروجهن باشد من دخول من لايوثق به عليهن، واذا استطعت ان لايعرفن غيرك من الرجال فافعل."

آپؑ ہی نے اپنے فرزند امام حسنؑ سے فرمایا: "اپنی خواتین کی حفاظت کرو اور انہیں پردے میں رکھ کر انہیں نامحرموں کو دیکھنے سے بچاؤ۔ کیونکہ یہ عمل تمہارے اور ان کے دونوں کے لیے شک و شبہ پیدا ہونے سے بہتر ہے۔ ان کا گھر سے نکلنا اتنا ہی پُر خطر ہے جتنا کسی ناقابلِ اعتماد شخص کا ان کے گھر میں داخل ہونا۔ لہٰذا اگر ممکن ہے تو ایسا کرو کہ وہ تمہارے علاوہ کسی اور مرد سے واقف ہی نہ ہوں۔"

نگاہ کے بارے میں

☆ قال رسول الله(ص): " اياكم وفضول النظر فانه يبذر الهوى ويولد الغفلة."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "بے جا نظر ڈالنے سے سختی کے ساتھ پرہیز کرو۔ کیونکہ یہ خواہشاتِ نفسانی کا بیج بوتی ہے اور غفلت پیدا کرتی ہے۔"

☆ وقال(ص): "من ملا عينه من حرام ملا الله عينه يوم القيامة من النار الاان يتوب ويرجع."

آپؐ ہی نے فرمایا: "ایسا شخص جو اپنی آنکھوں کو حرام سے پُر کرے، خداوندِ عالم روزِ قیامت اسکی آنکھوں کو آگ سے بھر دے گا، مگر یہ کہ وہ توبہ کرے اور رجوع کرلے۔"

☆ وقال(ص): "ما من مسلم ينظر امراةاول رمقة ثم بغض بصره الااحدث

اللہ تعالیٰ له عبادة یجد حلاوتها فی قلبه."

آپؐ ہی نے فرمایا: "جو مسلمان کسی عورت پر نگاہ پڑنے کے بعد اپنی آنکھوں کو جھکا لے' خداوندِ عالم اسکے لیے ایک ایسی عبادت قرار دے گا جس کی مٹھاس وہ اپنے قلب میں محسوس کرے گا۔"

☆ **وقال(ص): "لكل عضو حظ من الزنا ' فالعين زناه النظر."**

آپؐ ہی نے فرمایا: "بدن کا ہر عضو ایک قسم کا زنا کرسکتا ہے اور آنکھ کا زنا (ہوس آلود) نگاہ ہے۔"

☆ **وقال عیسیٰ (علیه السلام): "ایاکم والنظر الی المحذورات' فانها بذر الشهوات ونبات الفسق."**

حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا: "نامحرموں پر نگاہ ڈالنے سے پرہیز کرو' کیونکہ یہ شہوت کا بیج اور فسق وفجور کا پودا ہے۔"

☆ **وقال الامام علی (ع): "العین رائدالفتن."**

امام علیؑ نے فرمایا: "آنکھ فتنے کا آغاز کرنے والی ہے۔"

☆ **وقال(ع): "العیون مصائدالشیطان."**

آپؑ ہی نے فرمایا: "آنکھیں شیطان کا جال ہیں۔"

☆ **وقال(ع): "لیس فی البدن شیء اقل شکرا من العین فلا تعطوها سولها فتشغلکم عن ذکر اللہ عزوجل."**

آپؑ ہی نے فرمایا: "آنکھ کی شکر گزاری ہر دوسرے عضو سے کم ہے۔ پس اسے اسکی پسندیدہ چیزوں سے دور رکھو' تاکہ تمہیں خدا کی یاد کی مشغولیت سے باز نہ رکھ سکے۔"

☆ **وقال(ع): "اذاابصرت العین الشهوة عمی القلب عن العاقبة."**

آپؑ ہی نے فرمایا: "اگر آنکھوں کو شہوت آلود نگاہ سے باز نہ رکھا' تو قلب عاقبت سے

غافل ہو جائے گا۔"

☆ وقال(ع): "من اطلق طرفه كثر اسفه."

آپؑ ہی نے فرمایا: "نگاہ غم واندوہ کا سبب ہے۔"

☆ وقال(ع): "من غض طرفه اراح قلبه."

آپؑ ہی نے فرمایا: "جو کوئی اپنی آنکھوں کو جھکا لیتا ہے وہ اپنے قلب کو آسودہ رکھتا ہے۔"

☆ ومن وصايا الصادق (ع) لعبد الله بن جندب: "يا ابن جندب ان عيسىٰ بن مريم قال لاصحابه: اياكم والنظرة فانها تزرع فى القلب الشدة وكفى بها لصاحبها فتنة، طوبى لمن جعل بصره فى قلبه ولم يجعل بصره فى عينه."

عبداللہ بن جندب کو وصیت کرتے ہوئے امام صادقؑ نے فرمایا: "اے جندب کے بیٹے! عیسیٰ ابن مریمؑ نے اپنے اصحاب سے فرمایا: نگاہِ حرام سے پرہیز کرو کہ یہ سنگدلی کا موجب ہوتی ہے اورانسان کے فتنہ وفساد میں گرفتار ہو جانے کے لیے یہی کافی ہے۔ خوشا نصیب اسکے جو بصیرتِ قلب کا مالک ہو اور جن چیزوں کو اسکی آنکھیں دیکھتی ہیں ان پر اعتماد نہ کرتا ہو۔"

زیب وزینت کے بارے میں

☆ قال رسول الله(ص): "ان الله يحب اذا خرج عبده المومن الى اخيه ان يتهيا له وان يتجمل."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "خداوندِ عالم پسند کرتا ہے کہ بندۂ مومن اپنے برادرِ مومن سے ملاقات کو نکلتے وقت اپنے آپ کو تیار اور آراستہ کرے۔"

☆ وقال(ص): "احسن زينة الرجل السكينة مع ايمان."

آپؐ ہی نے فرمایا: "مرد کی بہترین زینت ایمان اور اطمینان وسکون ہے۔"

☆ وقال الامام علی(ع): "اياک ان تتزين للناس وتبارز الله بالمعاصى."

امام علیؑ نے فرمایا: ''ایسا نہ ہو کہ اپنے آپ کو لوگوں کے لیے تو آراستہ کرو اور خدا کے سامنے گناہوں (کی آلودگی) کے ساتھ ظاہر ہو۔''

☆ وقال (ع): "الزينة بحسن الصواب لا بحسن الثياب."

آپؑ ہی نے فرمایا: ''انسانوں کی زینت درست کاری اور نیک اندیشی ہے' نہ کہ خوبصورت لباس۔''

☆ وقال (ع): "زينة الاسلام اعمال الاحسان."

آپؑ ہی نے فرمایا: ''مسلمان کا زیور نیک اعمال ہیں۔''

☆ وقال (ع): "ان احسن الزى ما خلطك بالناس وجملك بينهم وكف السنتهم عنك."

آپؑ ہی نے فرمایا: ''بہترین لباس وہ ہے جو تمہیں دوسروں ہی کی مانند ظاہر کرے اور (اسی کے ساتھ) ان میں آراستہ نظر آؤ' اور ان کی زبانوں کو تمہاری بدگوئی سے بازرکھے۔''

☆ وقال (ع): "ما تزين متزين بمثل طاعة الله."

آپؑ ہی نے فرمایا: ''اطاعتِ الٰہی کی مانند کوئی زیور نہیں۔''

☆ وقال الامام الصادق (ع): "لاينبغى للمراة ان تعطل نفسها ولو ان تعلق فى عنقها قلادة."

امام صادقؑ نے فرمایا: ''بہتر ہے کہ عورت زنانہ زیورات کو (بالکل ہی) ترک نہ کردے' چاہے اسکے گلے میں ایک ہار ہی پڑا ہوا ہو۔''

گانے بجانے کے بارے میں

☆ قال رسول الله (ص): "اياكم واستماع المعازف والغناء فانهما ينبتان النفاق فى القلب كما ينبت الماء البقل."

رسول اللہؐ نے فرمایا: ''ایسا نہ ہو کہ تم تار و تنبور سننے لگو کہ یہ اسی طرح دل میں نفاق کی پیدائش کا موجب ہوتا ہے جس طرح پانی نباتات کی روئیدگی کا باعث ہوتا ہے۔''

☆ **وقال(ص): "صوتان ملعونان فی الدنیاو الآخرة: مزمار عند نعمة ' ورنة عند مصیبة."**

آپؐ ہی نے فرمایا: ''دنیا اور آخرت میں دو آوازیں ملعون ہیں: (ایک) خوشی کے موقع پر بین بجانا اور (دوسری) مصیبت کے موقع پر چیخ پکار بلند کرنا۔''

☆ **وقال الامام الصادق(ع): "الغناء یورث النفاق."**

امام جعفر صادقؑ نے فرمایا: ''غنا اپنے پیچھے نفاق اور دوروئی چھوڑتا ہے۔''

☆ **وقال رجل للصادق (ع): ان لی جیرانا ولهم جوار یتغنین ویضربن بالعود' فربما دخلت المخرج فاطیل الجلوس استماعا منی لهن؟ فقال له الصادق (ع): لا تفعل. فقال: ما هو شیء آتیه برجلی' انماهو سماع اسمعه باذنی ؟ فقال(ع): یا لله انت! ماسمعت الله عزوجل یقول: "اِنَّ السَّمْعَ وَ الْبَصَرَ وَ الْفُؤَادَ کُلُّ اُولٰٓئِکَ کَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلًا" ؟ فقال له الرجل: کانی لم اسمع بهذه الآیة من کتاب الله عزوجل من عربی ولا عجمی ! لاجرم انی قد ترکتها و انا استغفر الله تعالی.**

ایک شخص نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا: میرے ہمسائے میں کچھ کنیزیں ہیں جو سارنگی بجاتی ہیں اور گانے گاتی ہیں۔ جب بھی میرا اپنے بیت الخلا میں جانا ہوتا ہے' تو میں یہ ساز و آواز سننے کے لیے وہاں ذرا زیادہ دیر تک بیٹھ جاتا ہوں۔ امامؑ نے فرمایا: ایسا نہ کیا کرو۔ اس نے کہا: ایسا میں چاہتے ہوئے تو نہیں کرتا' بلکہ آوازیں خود بخود میرے کانوں میں پڑتی ہیں۔ امامؑ نے فرمایا: کیسی عجیب بات کرتے ہو! کیا تم نے خداوندِ عالم کا یہ فرمان نہیں سنا جس میں اس نے فرمایا ہے: ''سماعت' بصارت اور قوتِ قلب سب کے بارے میں سوال کیا

جائے گا۔" (سورۂ بنی اسرائیل ۱۷۔آیت ۳۶) وہ شخص کہتا ہے: میں نے اس وقت تک کسی عربی یا عجمی سے یہ آیت نہیں سنی تھی۔لہٰذا ناگزیر میں نے وہ عمل ترک کر دیا اور خدا سے مغفرت طلب کی۔

جادو کے بارے میں

☆ عن الامام علی (ع): "المنجم کا لکاھن، والکاھن کالساحر، والساحر کالکافر، والکافر فی النار."

امام علیؑ سے منقول ہے: "منجم، کاہن، جادوگر اور کافر میں باہم کوئی فرق نہیں اور ان سب کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

☆ وعنہ: انه قال (ع): "العین حق، والرقی حق، والسحر حق، والفال حق، والطیرة لیست بحق، والعدوی لیست بحق."

آپؑ ہی سے منقول ہے کہ فرمایا: "چشمِ بد، دم کرنا، جادو اور فال نکالنا حقیقت ہے، لیکن بدشگونی حقیقت نہیں رکھتی۔"

☆ وعن الامام الصادق (ع): "من تعلم شیئا من السحر قلیلا او کثیرا فقد کفر وکان آخر عھدہ بربه، وحدہ ان یقتل الا ان یتوب."

امام جعفر صادقؑ سے منقول ہے: "جو کوئی جادو کو (کم یا زیادہ) سیکھے، درحقیقت وہ کفر کا مرتکب ہوا ہے، اور اس کا انجام خدا کے ذمے ہے۔اسکی سزا قتل ہے، مگر یہ کہ وہ توبہ کر لے۔"

مستی اور نشے کے بارے میں

☆ قال رسول اللہ (ص): "احذروا کل مسکر، فان کل مسکر حرام."

رسول اللہؐ نے فرمایا: "مست کر دینے والی ہر چیز سے پرہیز کرو، کیونکہ ہر مست کر دینے والی چیز حرام ہے۔"

☆ وقال الامام علی (ع): "ینبغی للعاقل ان یحترس سکر المال، و سکر العلم، وسکر القدرة، وسکر المرح، وسکر الشباب. فان لکل واحد من ذلک ریحا خبیثة تسلب العقل وتستخف الوقار."

امام علیؑ نے فرمایا: "مناسب ہے کہ عقلمند انسان مال، علم، طاقت، خوشی اور جوانی کے نشے سے دور رہے۔ ان میں سے ہر ایک سے ایسی گندی بو اُٹھتی ہے جو عقل کو زائل کر دیتی ہے اور انسان کے وقار کو گھٹا دیتی ہے۔"

☆ وقال الامام الباقر (ع): "ماأسکر کثیره فقلیله حرام."

امام محمد باقرؑ نے فرمایا: "ہر ایسی چیز جس کی زیادہ مقدار کا پینا مستی لاتا ہو اس کا کم (ایک گھونٹ) بھی پینا حرام ہے۔"

☆ وقال رسول اللہ (ص): یا ابن مسعود! احذر سکر الخطیئة فان للخطیئة سکرا کسکر الشراب، بل ھی اشد سکرا منه، یقول اللہ تعالیٰ: "صُمٌّ بُکْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَرْجِعُوْن."

رسول اللہؐ نے فرمایا: اے ابن مسعود! گناہ کی مستی سے خوف کھاؤ، اور جان لو کہ گناہ بھی شراب کی مانند مستی اور بے خودی کا باعث ہوتا ہے، بلکہ اس سے بھی زیادہ شدید ہے۔ خداوندِ عالم فرماتا ہے: "یہ سب بہرے، گونگے اور اندھے ہو گئے ہیں اور اب پلٹ کر آنے والے نہیں ہیں۔" (سورۂ بقرہ۲۔ آیت ۱۸)

☆☆☆☆☆

٦

علامہ فضل اللہ کے تجربات

ایامِ شباب

☆ جنابِ عالی' آپ نے ایک بھرپور زندگی بسر کی ہے' آپ کی نظر میں تربیت کے مؤثر ترین وسائل کیا ہیں' بالفاظ دیگر خود آپ نے ایامِ جوانی میں اپنی تربیت کے لیے کیا اسلوب اختیار کیا تھا؟

○ میں ایک مکمل مسلمان بننے کا خواہشمند تھا' ایک ایسا مسلمان جس کی رگ رگ میں اسلام سمایا ہوا ہو' جو خدا کی معرفت کا حامل ہو' جس کا دل عشقِ الٰہی سے سرشار ہو' خوفِ خدا جس پر سایہ کیے ہوئے ہو اور جو ان تمام عناصر کے ہمراہ رضائے الٰہی کے حصول کی راہ پر گامزن ہو۔ یوں مجھے داخلی اور خارجی ہر پہلو سے ایک سچا مسلمان بننا ہے۔

میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ ایک مسلمان کو اپنے زمانے کے حالات سے باخبر ہونا چاہیے۔ تاکہ ان کا حصہ بنے' اُن میں اپنا کردار ادا کرے اور جدید دور کے مسائل اور لوگوں کے اندازِ فکر سے آشنائی حاصل کرے۔ تاکہ وہ عصری زبان' لب و لہجے' اندازِ فکر اور وسائل سے استفادہ کرتے ہوئے اسلامی تعلیمات کا ابلاغ کر سکے۔

لہٰذا میں نے ہر اس چیز کا مطالعہ کیا اور کرتا ہوں جو عصرِ جدید کے بارے میں میرے

فہم و بصیرت میں اضافہ کر سکے۔ اسی وجہ سے میں بہت جلد عصری مسائل کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہوں۔ یہاں تک کہ مجھے اپنے بارے میں یہ خوف لاحق رہتا ہے کہ کہیں قدیم اصطلاحات اور الفاظ کو بالکل ہی فراموش نہ کر بیٹھوں اور اگر نزدیکی رابطے اور مسلسل مشق سے ان قدیم الفاظ اور اصطلاحات کو ذہن میں محفوظ نہ رکھتا' تو ایسا ہی ہوتا۔

اسی طرح میں یہ عقیدہ بھی رکھتا ہوں کہ ایک مردِ مسلم کو فعال اور متحرک ہونا چاہیے اور عالمگیر سطح پر اسلام کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ اسے فکری' سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں اسلامی حقائق اور تعلیمات سے باخبر ہونا چاہیے اور اسلامی تحریکوں کی سرگرمیوں سے آشنا ہونا چاہیے۔ خود میں اسلامی تحریکوں پر مسلسل نظر رکھتا ہوں۔ ان تحریکوں میں سے بعض میں پائی جانے والی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے ان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ان سے پرامید ہوں۔ کیونکہ میرا عقیدہ ہے کہ انقلابی اسلام کے سوا کسی اور راستے سے اسلام کو عالمگیر پیمانے پر نہیں پھیلایا جا سکتا۔

اسلامی انسان

میں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے کہ ایک مردِ مسلمان بنوں' پتا نہیں کس حد تک اس کوشش میں کامیاب رہا ہوں؟ میں سمجھتا ہوں کہ ایک مردِ مسلم کو اپنے معاشرے میں اسلامی اخلاق کے مطابق زندگی بسر کرنی چاہیے' اپنے ذاتی عادات و اطوار کے مطابق نہیں۔ کیونکہ ایک مردِ مسلم' خواہ وہ دین کا داعی ہو' یا عالم' یا مفکر' یا کوئی فعال کارکن' بہرحال وہ معاشرے کے سامنے اسلام کی تصویر کشی کر رہا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اپنے آپ کو کبھی اس بات کی اجازت نہیں دی کہ اپنی ذاتی کیفیات کو تیوریوں پر بل چڑھا کے' یا غم و غصے کے اظہار کے ذریعے لوگوں پر مسلط کروں' بلکہ اپنے اوپر واجب سمجھا ہے کہ جب ایسی صورتحال پیش آئے اور میرے ذاتی رجحان کے برخلاف کسی کا کوئی عمل' یا کوئی کلمہ مجھے ناگوار گزرے'

تو اس سے پیدا ہونے والے غم و غصے کو پی جاؤں اور دوسروں پر اسے ظاہر نہ ہونے دوں۔ کیونکہ میں سمجھتا ہوں کہ داعیانِ دین کو اپنے ذاتی مزاج اور ذوق کو اپنے گھر اور اپنی ذات ہی تک محدود رکھنا چاہیے' اور جب وہ معاشرے میں قدم رکھیں' تو انہیں اسلامی اخلاق' اسلامی مزاج اور ذوق کے مطابق طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے۔

اس چیز کی تعلیم ہمیں رسولِ کریمؐ سے ملی ہے اور انہوں نے اسے قرآنِ کریم سے حاصل کیا ہے' جس کے ذریعے خداوندِ عالم نے اپنے نبی کی انتہائی عمدہ تربیت فرمائی ہے۔ رسول اللہؐ نے ایسے سخت ترین اور دردناک ترین آلام و مصائب جھیلے ہیں جن کی نظیر کسی انسان کی زندگی میں نہیں ملتی' اسکے باوجود آپ لوگوں سے کشادہ روئی اور مسکراتے چہرے کے ساتھ ملتے۔ آنحضرتؐ نے اپنے آپ کو بعض لذتوں اور آسائشوں سے محروم رکھا' تاکہ آپ کے اہلِ خانہ اور اعزہ و اقربا راحت و آرام پائیں۔ خود غرضی اور خود پسندی آپ کے قریب سے بھی نہ گزری تھی۔

لہٰذا میں سمجھتا ہوں کہ اسلام کی سربلندی اور تبلیغ و ترویج کے لیے کام کرنے والے افراد' خواہ وہ عالم ہوں یا طالبِ علم یا مبلغ یا دینی کارکن' ان پر لازم ہے کہ وہ پیغمبر اسلامؐ کے نقشِ قدم پر چلیں اور لوگوں کے ساتھ میل جول کے دوران ایسا طرزِ عمل اپنائیں جس سے دوسروں کے جذبات و احساسات مجروح نہ ہوں۔ ہمیشہ ان کے ساتھ احترام سے پیش آئیں کہ خود آنحضرتؐ ہر ایک کے ساتھ محبت اور پیار سے پیش آتے تھے: لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ عَزِیْزٌ عَلَیْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِیْصٌ عَلَیْکُمْ بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ. (یقیناً تمہارے پاس وہ پیغمبر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اسے تمہاری ہر مصیبت ناگوار گزرتی ہے۔ وہ تمہاری ہدایت کا انتہائی آرزومند ہے اور مومنین کے حال پر شفیق اور مہربان ہے۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۲۸)

آنحضورؐ ان لوگوں کے بارے میں بھی ملول اور رنجیدہ رہا کرتے تھے' جو آپ کی دعوت

کو مسترد کرتے تھے۔ آپ ان لوگوں سے سختی اور درشتی سے پیش نہ آتے تھے' ان سے بدسلوکی اور بداخلاقی کا برتاؤ نہیں کرتے تھے' بلکہ ان کے لیے رنجیدہ ہوتے تھے۔ اسی بنا پر ایک آیت نازل ہوئی' جس میں آپ سے کہا گیا: فَلَا تَذْهَبْ نَفْسُكَ عَلَيْهِمْ حَسَرٰتٍ. (تو آپ افسوس کی بنا پر ان کے پیچھے اپنی جان نہ گنوا دیجیے گا۔ سورۂ فاطر ۳۵۔ آیت ۸)

سب انسانوں سے محبت

میں نے رسولِ مقبولؐ سے انسان دوستی کا سبق بھی حاصل کیا ہے۔ لہٰذا مومنین سے محبت کرتا ہوں' ان کے لیے دستِ تعاون دراز کرتا ہوں۔ غیر مومنین سے بھی پیار و محبت سے پیش آتا ہوں تاکہ بہت سے مسائل ان کے درمیان رکھ سکوں۔ پوری زندگی' کسی انسان کے لیے دل میں کینہ نہیں رکھا۔ ہمیشہ تمام لوگوں سے' خواہ میرے ہم فکر ہوں یا مخالف نقطۂ نظر رکھنے والے' کھلے دل سے میل جول رکھا ہے۔

کوشش کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو اسلامی اخلاق سے زیادہ سے زیادہ آراستہ کروں' جو داعیانِ دین میں وہ خصوصیت پیدا کر دیتا ہے جس کے ذریعے ان کی دعوت لوگوں کی عقول میں داخل ہونے سے پہلے' ان کے قلوب کو مسخر کر لیتی ہے۔

قدرتی طور پر میرے اندر بھی بہت سی خرابیاں موجود ہوں گی' لیکن ہمیشہ یہ سعی کرتا ہوں کہ اپنے آپ کو راہِ راست پر رکھوں۔ لوگوں سے کھلے دل اور کشادہ روئی پر مبنی میل ملاپ کے ذریعے (جس سے مجھے بہت سی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں اور جن کی وجہ سے بکثرت انسانوں' حتیٰ غیر مسلموں کی محبت بھی میں نے پائی ہے) حاصل ہونے والے تجربات کی روشنی میں' میں اپنے تمام بھائیوں سے گزارش کرتا ہوں کہ وہ بھی ان تجربات سے استفادہ کریں۔

میرا عقیدہ ہے کہ ہر انسان کے اندر بکثرت اچھی اور پسندیدہ خصوصیات پائی جاتی

ہیں۔ ہمیں چاہیے کہ ان کے باطن کی گہرائیوں اور ان کے قلوب کو اپنی توجہ کا مرکز بنائیں۔ ان کی شخصیت کے کسی منفی عنصر یا تاریک پہلو کو لے کے نہ بیٹھ جائیں۔ ہم پر لازم ہے کہ انسانوں کی شخصیت میں پائے جانے والے مثبت نکات اور خوبیوں کو مدِنظر رکھیں' ان میں موجود منفی نکات اور خامیوں کو نہیں۔ ایسی صورت میں ہم بخوبی یہ بات محسوس کرنے لگیں گے کہ لوگ خدا اور دین سے دور نہیں بھاگتے۔

خداوندِ عالم بھی ہمیں تلقین کرتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کو حق اور صبر کی نصیحت کریں۔ البتہ ہم میں سے کچھ لوگوں کے لیے حق پر ڈٹے رہنا قابلِ برداشت نہیں' جس طرح ہم مختلف چیلنجوں کے سامنے صبر کا حوصلہ نہیں رکھتے۔

آپ نے اپنے بچوں کی تربیت کس انداز سے کی ہے؟

☆ آپ نے اپنے بچوں اور بچیوں کی تربیت کے لیے کیا انداز اختیار کیا ہے؟

O میں نے کوشش کی ہے کہ اپنے بچوں کا دوست بن کے رہوں' کبھی اپنے کسی بچے یا بچی پر اپنی کوئی بات ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر کبھی ان سے کسی خطا کا ارتکاب دیکھتا ہوں' تو ایسے موقع پر درشتی اور سختی سے پیش نہیں آتا' انہیں مارتا پیٹتا نہیں۔ بلکہ اشاروں' کنایوں خاص تعبیروں اور ایسے الفاظ میں انہیں تنبیہ کرتا ہوں جو ان کے جذبات کو مجروح نہ کریں۔

میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی زندگی جئیں' لیکن زندگی بسر کرنے کے لیے صحیح راستے کے چناؤ میں ان کی مدد کرتا ہوں۔ اسی طرح انہیں ان کے کاموں میں آزاد اور خود مختار رکھتا ہوں' ان کے معاملات میں دخل نہیں دیتا' تاکہ وہ خود اپنی غلطیوں سے سبق حاصل کریں۔ البتہ ان کے کاموں کے مثبت اور منفی نکات کی جانب ان کی توجہ مبذول کرانے سے دریغ نہیں کرتا۔

بھرپور کوشش کرتا ہوں کہ اس انداز سے ان کی تربیت کروں کہ ان میں انسانیت کا جوہر پھلے پھولے' نہ کہ ان پر مسلط رہوں۔

میں اپنے بچوں کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھتا ہوں' ایک دوست کی مانند ان کے ساتھ رہتا ہوں اور اس مخلصانہ رشتے سے استفادہ کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میرے بچے بغیر کسی خوف اور ہچکچاہٹ کے اپنے مسائل مجھ سے بیان کرتے ہیں۔ میں کوشاں رہا ہوں کہ میرے اور ان کے درمیان کوئی پردہ حائل نہ ہو۔ کیونکہ میرے خیال میں باپ کو اپنے بچوں کا قابلِ اعتماد رازدار ہونا چاہیے' تاکہ وہ مجبوراً دوسروں کے سامنے اپنے راز بیان نہ کریں اور ان کے لیے ایسے حالات سازگار کرنے چاہئیں جن میں وہ اپنے باپ کو اپنا دوست اور مخلص سمجھیں۔

آپ کے بچپنے کی طرف پلٹتے ہیں

☆ کیا جنابِ عالی کے ذہن میں اپنے بچپنے کی کچھ یادگار باتیں ہیں جن کا ذکر ہمارے جوانوں کے لیے سودمند ثابت ہو؟

○ جب میں اپنے بچپنے اور ابتدائے شباب کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہوں' تو مجھے وہاں ایک ایسا بچہ نظر آتا ہے جو نجفِ اشرف کے گلی کوچوں' وہاں کی مساجد' حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے حرمِ مطہر اور علما کی محافل میں رفت و آمد رکھتا ہے۔ ایک ایسے گیارہ سالہ بچے کو دیکھتا ہوں' جو اپنے چند دوستوں (بالخصوص شہید سید مہدی الحکیمؒ) کے ہمراہ ''ادب'' نامی ایک مجلّے کے اجرا کا پروگرام بناتا ہے۔ یہ ایک خطی مجلّہ تھا جسے ہم اسکے ممبران کی تعداد کے مساوی تحریر کیا کرتے تھے۔ میں نے لکھنے کا آغاز اسی زمانے سے کیا۔ ہم اس مجلّے کے لیے نجفِ اشرف کی بڑی بڑی شخصیات کی تحریریں بھی لیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میری عمر چودہ برس کی تھی' تو پہلی مرتبہ میری کچھ نظمیں شائع ہوئیں۔ کیونکہ ہمارے بچپنے کے اس دور میں کھیل کود کے مواقع میسر نہ تھے' اس لیے کبھی کبھی اپنے اندر ایک خلا سا محسوس کرتے تھے۔ ہاں' کبھی کبھار اپنے والدِ گرامی اور سربرآوردہ علما کے ساتھ نجفِ اشرف کے ایک علاقے ''جدول'' جاتے تھے۔ صحرا کے

کنارے واقع اس علاقے سے دریائے فرات کی ایک شاخ گزرتی ہے۔ وہاں ہم باغوں میں کھیلتے کودتے تھے۔

نجفِ اشرف کی یادوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ ماہِ مبارک رمضان میں مومنین کے اجتماع میں دعا پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ سخت ترین گرمیوں میں بھی حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے حرم میں جاتا' وہاں بہت سے سن رسیدہ لوگ بھی میرے گرد آ کے بیٹھ جاتے اور میں ان کے سامنے دعاؤں کی قرأت کرتا۔ حتیٰ کہ میرے گھر والوں کو خوف لاحق رہتا تھا کہ کہیں شدید گرمی اور روزہ میرے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو۔

مجھے زندگی کے ابتدائی ایام ہی سے لکھنے پڑھنے کا ماحول میسر رہا۔ گھر میں مجلّہ ''الرسالۃ'' مختلف لوگوں کی سوانح اور اخبارات و جرائد زیرِ مطالعہ رہتے تھے۔ اسی وقت سے نجفِ اشرف کے علمی و دینی مرکز میں کھلنے والے اوّلین ثقافتی مرکز ''منتدی النشر'' میں میری آمد و رفت تھی۔

میری تمام ہی یادوں کا تعلق علمی اور ثقافتی سرگرمیوں سے ہے۔ راتیں مذہبی مجالس میں بسر کرتا اور وہاں دینی طلاب کے مباحثوں میں شرکت کرتا۔ جس کے نتیجے میں ایسے جدید افکار و خیالات سے آشنائی ہوئی جن کے حصول کے لیے بہت زیادہ فکری صلاحیتوں اور زحمتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

☆ کیا آپ نے اکیڈمک تعلیم بھی حاصل کی ہے؟

O میں نے صرف ایک برس اکیڈمک تعلیم حاصل کی ہے۔ تیسری جماعت میں ''منتدی النشر'' میں داخل ہوا اور چوتھی کلاس میں اسے چھوڑ دیا۔ میں نے اس زمانے کے دستور کے مطابق حوزوی تعلیم حاصل کی۔

ہمارے تجربات سے استفادے کی کوشش کیجیے

☆ آخری سوال یہ ہے کہ کیا آپ نسلِ نو سے تعلق رکھنے والے دینی کارکنوں سے کچھ کہنا پسند فرمائیں گے؟

○ میں اسلام کے خدمت گزار اپنے بھائیوں اور بیٹوں کی توجہ اس نکتے کی جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ ہم اُس دور میں کھلے ذہن کے ساتھ اسلامی معارف اور حقائق کا مطالعہ کرتے تھے، جب خود نجفِ اشرف میں بھی لوگوں کی ایک کثیر تعداد اپنے زمانے سے بہت پیچھے تھی۔

ہمارا تعلق ایک ایسی نسل سے ہے جس میں آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدرؒ اور بہت سے دوسرے علما شامل تھے۔ ہم انقلابی اور متحرک اسلام کی روشنی میں جدید طریقوں سے استفادے کے ساتھ ساتھ اسلامی فکر کے جوہر اور اصلیت کو محفوظ رکھتے ہوئے مسلمانوں کے تقاضوں اور ضروریات کے جواب دینے کی کوشش کرتے تھے۔

ہمارا تجربہ، جس کے دوران ہم نے خون کی نہریں بہتی دیکھیں اور طرح طرح کے زخم کھائے، صعوبتوں کا سامنا کیا گہرے زخموں سے بھرپور تجربہ ہونے کے باوجود ایک رہنما اور سود مند تجربہ ہے، جو مسلمانوں کی مشکلات اور مصائب کے حل کی راہیں دریافت کر سکتا ہے۔ ہم اس بات کا دعویٰ نہیں کرتے کہ ہم ہی نے اس تجربے کی بنیاد رکھی ہے لیکن اسکی سرگرمیوں اور فعالیتوں میں ہمارا بڑا حصہ ہے۔ ہمارا یہ تجربہ اس حقیقت کو نمایاں کرتا ہے کہ اگر انسان روشن مستقبل پر نظر رکھے، خدا پر بھروسا اور اسلام پر ایمان رکھتا ہوا اپنی تمام قوتوں کو بروئے کار لائے اور تمام موجود امکانات اور وسائل سے استفادہ کرے، تو خواہ دیر ہی سے سہی لیکن بہرصورت اپنی منزل پالیتا ہے۔

ہم اپنے بعد آنے والی نسلوں سے کہنا چاہیں گے کہ ہمارا دور اگرچہ بہت سی خوبیوں

سے مالا مال تھا' لیکن آپ کی کوشش یہ ہونی چاہیے کہ ہمارے قوی اور ضعیف دونوں نکات کا جائزہ لیجیے۔ ہماری ذات کا مطالعہ نہ کیجیے بلکہ ہمارے تجربات اور سرگرمیوں کا مطالعہ کیجیے' ہماری فکر کی چھان پھٹک کیجیے۔ ممکن ہے اس میں آپ کو ایسے افکار بھی ملیں جن کی نشو ونما ہم نے اپنے دور میں کی' لیکن آپ انہیں اپنے دور میں اہم نہ سمجھیں۔ کیونکہ وہ آپ کو آج معمول کے افکار نظر آ رہے ہوں' اس لیے کہ آپ ایک ایسے اسلامی ماحول میں زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں یہ افکار عام ہو چکے ہیں اور آپ کی مثال ایک ایسے انسان کی سی ہے جو دوسروں کے لگائے ہوئے درختوں کا پھل کھاتا ہے۔

تاہم یہ بات ذہن نشین رکھئے کہ وہی فکر جو آج آپ کو عام اور معمولی نظر آ رہی ہے' اسے ماضی میں معاشرے کی طرف سے بکثرت رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔

اسلام آپ کے پاس ایک امانت ہے

میں تمام احباب سے عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسلام آپ کے پاس ایک امانت ہے۔ اس امانت کی حفاظت آپ پر فرض ہے۔ ہمیں کسی بھی مرحلے پر جمود اور ٹھہراؤ کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ اپنے پچھلے قائدین کی تعظیم واحترام ضرور کریں' لیکن ان ہی میں اٹک کر نہ رہ جائیں۔ کیونکہ کوئی رہبر وقائد کتنا ہی عظیم ہو' لیکن اپنے مرحلے اور اپنے تجربات کا عکاس ہوتا ہے۔ جبکہ زندگی مراحل پر مراحل طے کرتی اور نو بہ نو تجربات کا سامنا کرتی ہے اور ماضی کے تجربات آپ کو نئے تجربات سے بے نیاز نہیں کر دیتے۔

میرے خیال میں موجودہ نسل جس کا مقابلہ عالمی کفر سے ہے' اسے رنج والم' مشکلات ومصائب جھیلنے ہیں۔ ہمیں اس نسل پر فخر ہے اور ہم ان سے چاہتے ہیں کہ کم سے کم غلطیوں کے مرتکب ہوں اور اپنی آگہی اور حرکت کے خلاف دشمن کی سازشوں اور منصوبوں سے ہوشیار رہیں۔ لہٰذا آپ کو چاہیے کہ خدا پر بھروسا کریں' تاکہ کسی کا خوف آپ کو لاحق نہ ہو۔

اور اللہ رب العزت سے انس و محبت رکھیں، تا کہ کسی کی وحشت آپ پر طاری نہ ہو، رسول اللہؐ سے معنوی تعلق برقرار کریں اور اخلاق، قوت اور تمام انسانوں اور پوری کائنات سے تعلق میں انہی کو نمونۂ عمل قرار دیں۔

ہم نسلِ رسالت ہیں، ہمیں اسلام کے لیے ہر مرحلے کے مطابق اپنی قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہیے۔ اسلام کو تمام نسلوں کی طاقتوں اور صلاحیتوں کی ضرورت ہے: وَ قُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَ رَسُوْلُهٗ وَ الْمُؤْمِنُوْنَ. (اور پیغمبر کہہ دیجیے کہ تم لوگ عمل کرتے رہو، کہ تمہارے عمل کو اللہ، رسول اور صاحبانِ ایمان سب دیکھ رہے ہیں۔ سورۂ توبہ ۹۔ آیت ۱۰۵)

☆☆☆☆☆

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ دام ظلہ سے جوانوں کے چند منتخب استفتاءات

حضرت آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ دامت افاضاتہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مہربانی فرما کے مندرجہ ذیل سوالات کے جواب عنایت فرمائیں۔

سوال: کیا تعلیم یا پیشے کے انتخاب میں والدین کی اطاعت واجب ہے؟

جواب: نہیں، واجب نہیں ہے۔ اولاد سے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کا مطالبہ کیا گیا ہے، ان کی اطاعت کا نہیں۔

سوال: کیا شریکِ حیات (شوہر یا بیوی) کے انتخاب میں والدین کی اطاعت واجب ہے؟

جواب: نہیں، واجب نہیں۔ لیکن ان سے مشورہ کرنا مستحب ہے۔ خاص طور پر جبکہ مشورہ نہ کرنے سے انہیں اذیت پہنچے۔

سوال: حد سے زیادہ اور مشقت آور مہر کا کیا حکم ہے؟ ایسا بھاری بھرکم مہر جو شادی کے موقع

پر جوان کے کاندھوں پر بھاری بوجھ بن جائے؟

جواب: اسلام میں مہر کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ بلکہ شوہر اور بیوی کی رضا مندی سے وابستہ ہے۔ زوجین (میاں اور بیوی) جس مبلغ پر بھی راضی ہو جائیں، گھر والوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ دونوں یعنی زوجین کا راضی ہونا ضروری ہے۔ گھر والوں کا راضی ہونا شرط نہیں ہے۔

سوال: بعض سادات اپنی لڑکیوں کی شادی فقط سید لڑکے سے کرتے ہیں۔ اس بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اسلام میں ایسی کوئی چیز نہیں ہے اور اہلِ بیت علیہم السلام کی سیرت سے بھی کوئی ایسی بات ثابت نہیں ہوتی۔ بلکہ ان کی سیرت اسکے برخلاف ہے۔ اسلام میں شادی کے مسئلے میں ذات پات کا کوئی تصور نہیں ہے۔

سوال: کیا شادی کا ارادہ رکھنے والے لڑکے کے لیے اپنی شریک حیات کے حسین و جمیل ہونے کی شرط لگانا بُری بات نہیں ہے؟

جواب: لڑکے کو حق ہے کہ وہ اپنی ہونے والی بیوی کے دیندار ہونے کے ساتھ ساتھ اسکے حسین و جمیل ہونے کی شرط بھی لگا سکتا ہے اور یہ کوئی بُری بات نہیں ہے۔

سوال: بڑی عمر کے مرد کا چھوٹی عمر کی لڑکی سے شادی کرنا کیسا ہے یا دونوں کی عمر میں کتنا فاصلہ ہونا چاہیے؟ اس بارے میں اسلام کیا کہتا ہے؟

جواب: اسلام مرد و زن کے لیے شادی کی کسی خاص معین عمر کا قائل نہیں ہے۔ اس مسئلے میں دونوں کی نفسیاتی اور عملی خصوصیات کا خیال رکھنا چاہیے۔

سوال: شادی بیاہ کے مسئلے میں بعض خاندانی، علاقائی اور قومی رسوم و رواج دخل انداز ہو جاتی ہیں۔ کیا ایسی چیزوں پر توجہ دینی چاہیے، جبکہ یہ رسومات شوہر اور بیوی کے لیے مشکلات پیدا کرتی ہیں؟

جواب: شریعتِ اسلام میں نہ صرف شوہر اور بیوی کی فقط انسانی قدر و قیمت کو معتبر قرار دیا گیا ہے' بلکہ اس قسم کی رسوم سے اجمالی طور پر منع بھی کیا گیا ہے۔ لہٰذا زوجین (میاں بیوی) کو چاہیے کہ ان امور کا گہری نظر سے جائزہ لیں' تاکہ اندرونی اور بیرونی طور پر ایک خوشگوار زندگی قائم کر سکیں۔

سوال: جوان لڑکے اور جوان لڑکی میں شادی کے لیے کن شرائط کا ہونا ضروری ہے؟

جواب: حدیث شریف میں آیا ہے: ''اگر کوئی تمہاری لڑکی کا رشتہ لے کر آئے اور تم اسکے اخلاق اور دینداری کی طرف سے مطمئن ہو' تو اس سے رشتہ کر دو۔ اگر ایسا نہیں کرو گے تو زمین پر بڑا بگاڑ پھیل جائے گا۔'' ایک اور حدیث میں آیا ہے: ''کسی نے نبی کریمؐ سے عرض کیا: میں کس سے شادی کروں؟ آنحضرتؐ نے فرمایا: دیندار شخص سے۔'' یاد رہے کہ یہ خصوصیات ان فکری اور جسمانی خصوصیات کے علاوہ ہیں' جو ہر ایک اپنی شریکِ حیات میں دیکھنا چاہتا ہے۔

سوال: وسائل و امکانات کی محدودیت اور مالی تنگی کو مدِنظر رکھتے ہوئے خاندانی منصوبہ بندی کی کیا حیثیت ہے؟

جواب: شرعی طریقوں کے ذریعے جائز ہے۔ لیکن مومن کو رزق کے مسئلے میں خدا پر اعتماد رکھنا چاہیے اور مطلقاً مادّی حساب کتاب میں غرق ہو کے نہیں رہ جانا چاہیے۔

سوال: کیا بے پردہ لڑکی سے اس امید پر شادی کرنا جائز ہے کہ آئندہ اسکی اصلاح ہو جائے گی؟

جواب: اصولی طور پر جائز ہے' لیکن متعدد مواقع پر تجربے نے یہ بات ثابت کی ہے کہ وہ خواتین جو شادی سے پہلے پردہ نہیں کرتیں' اکثر شادی کے بعد بھی پردے کی پابند نہیں ہوتیں' اس لیے کہ شادی کے بعد شوہر پر اُن کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔ البتہ تمام خواتین ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ لہٰذا کسی خاص لڑکی کے بارے میں مختلف پہلوؤں بالخصوص اسکی وفاداری اور وعدوں پر پابندی وغیرہ کا جائزہ لینے کے بعد فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔

سوال: متعہ کی شرعی شرائط کیا ہیں؛ اس لیے کہ کبھی کبھی اس سے غلط فائدہ بھی اٹھایا جا سکتا ہے؟

جواب: شرعی شرائط کے علاوہ ہر معاشرے میں اسکے مثبت اور منفی اثرات کو ملحوظ رکھ کر فیصلہ کیا جانا چاہیے۔

سوال: مغربی ممالک میں جا کر آباد ہونے کے بارے میں آپ کی رائے کیا ہے؟

جواب: اگر مومن کے ذلیل ہونے، اسکے دین میں کمزوری آ جانے یا اسکے بچوں کے گمراہ ہو جانے کا خطرہ ہو، تو وہاں سکونت اختیار کرنا جائز نہیں۔

سوال: کیا والد یا والدہ کا اپنے بچوں کے بعض رازوں کے کھوج میں ہونا جائز ہے؟ جیسے ان کے خطوط کھولنا، ان کی درازوں کی تلاشی لینا یا اسی طرح کی دوسری چیزیں؟

جواب: جائز نہیں ہے۔

سوال: ''عاقِ والدین'' کے کیا معنی ہیں؟

جواب: اپنی سخت کلامی یا درشت مزاجی سے والدین کو اذیت دینا اور انہیں نقصان پہنچانا مراد ہے۔

سوال: استمنا، مشت زنی (hand practice) کا کیا حکم ہے؟

جواب: اگر منی خارج ہونے کا سبب بنے تو مرد اور عورت دونوں کے لیے حرام ہے، وگرنہ حرام نہیں ہے، لیکن اِس عادت کے بُرے نتائج کی وجہ سے اس سے اجتناب کرنا چاہیے۔

سوال: موسیقی سننے کی شرعی حدود کیا ہیں؟

جواب: رقص و سرور اور فسق و فجور کی محافل سے مناسبت نہ رکھتی ہو۔

سوال: لڑکی یا عورت کے لیے پردے کی کیا حدود ہیں؟ اور لڑکوں اور مردوں کے لیے لباس کی کیا خصوصیات ہونی چاہئیں؟

جواب: عورت کے شرعی پردے کی حدود یہ ہیں کہ بدن کے اس حصے کو چھپائے جس کا ظاہر کرنا حرام ہے، اور ایسا لباس زیبِ تن نہ کرے جس سے اسکی زینت ظاہر ہو۔ مردوں کے

لباس کے لیے شرط یہ ہے کہ شرمگاہ کو چھپائے اور تحریک انگیز نہ ہو۔

سوال: ہر قسم کے آلاتِ قمار سے کھیلنے کا حکم کیا ہے؟

جواب: بغیر مادّی لین دین کے جائز ہے۔

سوال: کتبِ ضلال کسے کہتے ہیں' اور ان کا کیا حکم ہے؟ آیا ایسی کتابیں جن میں آج کل اسلام پر تنقید کی جاتی ہے کتبِ ضلال ہیں؟

جواب: کتبِ ضلال سے مراد گمراہ کن مفاہیم پر مشتمل کتب ہیں۔ ان کا اپنے پاس رکھنا حرام نہیں ہے' مگر یہ کہ ان کے پڑھنے سے گمراہ ہونے کا خطرہ ہو' تو رکھنا بھی حرام ہے۔

سوال: جوان لڑکوں کے سونے یا دوسری دھاتوں کے ہار یا کڑے پہننے کا کیا حکم ہے؟

جواب: مردوں کے لیے سونا پہننا اسی طرح حرام ہے' جس طرح ان کا عورت کی شباہت اختیار کرنا حرام ہے' مگر یہ کہ ہار اور کڑے مرد و زن دونوں کے لیے مشترک پہناوا بن جائیں۔ ہاں اگر کسی اور دھات کے بنے ہوں اور حرام شباہت کا سبب بھی نہ بنیں' تو جائز ہے۔

سوال: کیا ایسی تنگ پتلون پہننا جائز ہے جس سے شرم گاہ ظاہر ہوتی ہو؟

جواب: اگر مراد یہ ہے کہ پتلون تنگ اور چست ہونے کی وجہ سے شرم گاہ کو مجسم ظاہر کرتی ہو' تو جائز نہیں ہے' کیونکہ یہ شہوت کو ابھارنے کا باعث ہے۔

سوال: اسکول میں بچوں کو کن حدود میں مارنا جائز ہے؟

جواب: بچے کے سرپرست کی اجازت سے اس وقت مارنا جائز ہے جب ادب سکھانے کے لیے یہی واحد طریقہ رہ جائے' لیکن اس شرط کے ساتھ کہ نہ خون نکلے اور نہ ہی ہڈی ٹوٹے۔

سوال: والدین اپنی اولاد کو کس حد تک مار سکتے ہیں؟

جواب: اولاد کے بارے میں حکم' شاگردوں کے حکم جیسا ہے۔

سوال: کیا حقوقِ شرعیہ کو طلبا اور نوجوانوں کی مذہبی سرگرمیوں پر خرچ کیا جا سکتا ہے؟

جواب: حاکمِ شرع کی اجازت سے خرچ کیا جا سکتا ہے۔

سوال: کیا اموالِ شرعی میں یونیورسٹی اور دینی مدارس کے طلبا کو برابر قرار دیا جاسکتا ہے۔ یعنی جس طرح دینی مدارس کے طلبا پہ اموالِ شرعی خرچ کیے جاتے ہیں‘ کیا یونیورسٹی کے طلبا پر بھی یہ اموال خرچ کیے جاسکتے ہیں؟

جواب: اگر یونیورسٹی کے طلبا مومن اور دیندار ہوں اور اُن کی تعلیم میں اسلام کی مصلحت ہو‘ تو جائز ہے۔

سوال: کیا زکات اور فطرے کو طلبا کی دینی سرگرمیوں پر خرچ کیا جاسکتا ہے؟

جواب: جائز ہے لیکن احوط یہ ہے کہ فقیر اور نادار طلبا پر خرچ کیا جائے۔

سوال: کیا دینی قصیدوں کے اشعار کو موسیقی کے ساتھ سننا جائز ہے؟

جواب: جائز ہے۔

سوال: دینی جماعتوں میں شمولیت اختیار کرنے کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں؟

جواب: اگر ان کے اہداف و مقاصد اور قیادت صحیح اسلامی فکر سے مطابقت رکھتی ہو‘ تو جائز ہے۔

سوال: بُرے دوست کی (مستقبل ہی میں سہی) اصلاح کی نیت سے اسکے ساتھ میل جول رکھنا کیسا ہے؟

جواب: اگر خود بگڑنے کا خطرہ نہ ہو‘ تو جائز ہے۔

سوال: کیا لڑکیوں کے لیے ایسے ماحول میں کام کرنا جائز ہے جہاں صرف مرد کام کرتے ہوں۔

جواب: اصولی طور پر جائز ہے‘ بشرطیکہ ان کے اخلاق پر منفی اثرات مرتب نہ ہوں اور ان کی شہرت اور نیک نامی کے لیے ضرر رساں نہ ہو۔

سوال: آپ کی نظر میں اہلِ کتاب پاک ہیں‘ اسکی روشنی میں ان کے مرطوب برتنوں کو استعمال کرنا کیسا ہے؟

جواب: جائز ہے۔

سوال: کیا زانیہ سے متعہ جائز ہے؟

جواب: اگر وہ زنا کے لیے مشہور ہو' تو احوط ترک کرنا ہے۔

سوال: مغربی ممالک سے درآمد شدہ چمڑے کی مصنوعات جن میں سے بعض ضروری ہوتی ہیں' جن جانوروں سے یہ حاصل کی جاتی ہیں' کیا ان کے شرعی طریقے سے ذبح نہ ہونے کے علم کے باوجود انہیں استعمال کرنا جائز ہے؟

جواب: ایسے کام میں استعمال کرنا جائز ہے جس میں طہارت شرط نہیں ہوتی۔ ہاں اگر (ان جانوروں کے جن سے یہ حاصل کی گئی ہیں کے) شرعی طور پر ذبح ہونے میں شک ہو' تو ان امور میں بھی استعمال جائز ہے جن میں طہارت شرط ہے۔

سوال: کیا شک کی صورت میں مسلمانوں کے بازار میں فروخت ہونے والے گوشت کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ یہ گوشت شرعی طریقے سے ذبح کیے گئے حیوان کا ہے یا نہیں' صحیح ہے؟

جواب: اگر مسلمانوں کے بازار سے یا مسلمان سے لیا جائے تو ذبح شرعی کا حکم لگایا جائے گا' مگر یہ کہ معلوم ہو کہ پہلے کافر کے ہاتھ میں تھا اور (مسلمان کے لیے) حیوان کے شرعی طور پر ذبح ہونے سے مطلع ہونا ممکن نہ ہو۔

سوال: کیا مشین کے ذریعے ذبح ہونے والے حیوان کا گوشت کھانا جائز ہے جسے بسم اللہ پڑھ کر ذبح کیا گیا ہو؟

جواب: ذبح شرعی کی تمام شرائط حاصل ہونے کی صورت میں جائز ہے۔

سوال: کیا اہلِ سنت امامِ جماعت کی اقتداء میں وحدتِ مسلمین کی خاطر نمازِ جماعت صحیح ہے اور آیا اسکے دوبارہ پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے؟

جواب: نماز کی تمام معتبر شرعی شرائط کے ساتھ جائز ہے اور اس پر ثواب دیا جائے گا۔

سوال: کیا سب وشتم اور ناسزا کہنے سے ہٹ کر خلفائے راشدین اور صحابہ کے مؤقف اور

کردار پر نقد و بحث کی جا سکتی ہے؟

جواب: تنقید اور تبصرے کے قابل ہر موضوع میں تنقیدی بحث کی جا سکتی ہے۔ البتہ انسان کا چاہیے کہ ایسی باتوں سے پرہیز کرے جو مذہبی احساسات کو ٹھیس پہنچاتی ہوں یا وحدت مسلمین کو نقصان پہنچانے والی ہوں۔

سوال: آپ کی نظر میں موجودہ مراجع میں سے کون دوسروں سے اعلم ہے؟

جواب: میرے نزدیک ''اعلمیت'' ثابت نہیں ہے۔

سوال: مغربی ممالک میں ڈاک' ٹیلی فون اور بازار وغیرہ میں چوری کرنا یا غلط فائدہ اٹھانا کیسا ہے؟ اس بہانے سے کہ کافر کا مال مسلمان کے لیے جائز ہے؟

جواب: جائز نہیں' باایمان مسلمان کو ہر حال میں لوگوں (خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم) کے اموال کا امین ہونا چاہیے۔ علاوہ ازایں جس ملک میں ہجرت اختیار کر کے گیا ہے وہاں کے قوانین کا احترام اس پر فرض ہے اور وہاں کے قوانین کی پابندی اور پاسداری کا جو معاہدہ اس نے کیا ہے اس کا ہمیشہ پابند رہے۔ کیونکہ اس کا یہ معاہدہ اس تاکیدی عہد کی مانند ہے جسے اس نے وہاں کی حکومت کے ساتھ کیا ہے اور جس کی بنیاد پر اس نے اقامت کی اجازت حاصل کی ہے۔

سوال: اگر لڑکا یا لڑکی مغربی ممالک میں جا کر بسنا چاہے اور والدین اسے منع کریں' تو کیا والدین کی رائے کی مخالفت کی جا سکتی ہے۔

جواب: اگر والدین اسکی زندگی یا دین کے بارے میں خوفزدہ ہوں' تو ان کی رائے پر عمل کرنا واجب ہے۔

سوال: اگر کسی کے پاس توضیح المسائل نہ ہو اور عالم سے بھی سوال نہ کر سکتا ہو اور کوئی ایسا آدمی بھی میسر نہ ہو جس سے مسئلے کا شرعی حکم معلوم کر سکے اور مسئلہ بھی ایسا ہو جس میں تاخیر نہ کی جا سکتی ہو' تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے؟

جواب: ایسے خاص مواقع پر احتیاط کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔

سوال: داڑھی مونڈنے کا کیا حکم ہے؟

جواب: داڑھی مومنین کے شعائر میں سے ہے۔ لہٰذا مومن کے لیے مناسب نہیں ہے کہ اسے منڈوائے، مگر یہ کہ کسی قسم کا حرج یا ضرر پیش آئے اور ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ ہماری نظر میں داڑھی مونڈنے کا حرام ہونا ثابت نہیں ہے۔

سوال: کیا بانسری سننا جائز ہے؟

جواب: اگر غم انگیز موسیقی بجائی جائے تو حرام نہیں ہے۔

سوال: کیا غم انگیز گانوں یا ایسے گانوں کا سننا جائز ہے جو شہوت کو نہ ابھارتے ہوں؟

جواب: اگر گانے کے اشعار باطل اور ایسے کلمات پر مشتمل نہ ہوں جن سے اللہ تعالیٰ ناراض ہوتا ہے تو سننا جائز ہے۔

۲۹ جمادی الاوّل ۱۴۱۵ھ

محمد حسین فضل اللہ

آیت اللہ فضل اللہ سے استفتاء کے لیے درجِ ذیل ایڈریس پر رابطہ کیا جا سکتا ہے۔

Http://www.bayynat.org.lb

Email:bayynat@bayynat.org.lb.

☆☆☆☆☆

حضرت آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ دام ظلہ
حیات اور خدمات کی ایک جھلک

فقیہ، مجتہد، ادیب، شاعر اور مجاہد آیت اللہ العظمیٰ سید محمد حسین فضل اللہ ۹ شعبان المعظم ۱۳۵۴ھ مطابق ۱۹۳۶ء کو شہرِ علم و عرفاں نجفِ اشرف کے ایک لبنانی گھرانے میں پیدا ہوئے۔

نجفِ اشرف میں اپنی طویل اقامت کے دوران آپ نے اپنے والدِ گرامی آیت اللہ العظمیٰ سید عبدالروٴف فضل اللہؒ سمیت آیت اللہ محمود شاہرودیؒ، آیت اللہ شیخ حسین حلیؒ، ملا صدر البازوریؒ، آیت اللہ العظمیٰ سید محسن الحکیمؒ اور آیت اللہ العظمیٰ سید ابوالقاسم خوئیؒ سے کسبِ فیض کیا۔

آپ نے نجفِ اشرف میں فکری تربیت اور ترقی یافتہ اندازِ تبلیغ کے سلسلے میں پائے جانے والے خلا اور کمی کو محسوس کرتے ہوئے تعلیمی و تربیتی سرگرمیوں کو اپنی توجہ کا مرکز قرار دیا۔ اس سلسلے میں آپ نے ۱۳۸۰ھ میں آیت اللہ العظمیٰ شہید سید محمد باقر الصدرؒ اور آیت اللہ شیخ محمد

مہدی شمس الدینؒ کی ہمراہی میں "جماعة العلما" کی طرف سے ایک مجلّے "الاضواء" کا آغاز کیا۔ اس مجلّے کی اشاعت کے پہلے سال اس کا اداریہ "رسالتنا" کے عنوان سے شہید سید محمد باقر الصدر تحریر فرمایا کرتے تھے' پھر دوسرے سال سے مسلسل چھ سال تک "کلمتنا" کے عنوان سے اداریہ آیت اللہ فضل اللہ تحریر کرتے رہے۔ آپ کے تحریر کیے ہوئے یہ تمام اداریے بعد میں ایک مستقل کتاب "قضايانا على ضوء الاسلام" کے نام سے شائع ہوئے۔

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ اور آیت اللہ شہید سید محمد باقر الصدرؒ کی رفاقت' ہمراہی اور ہمکاری علمی اور تعلیمی و تربیتی میدانوں کے ساتھ ساتھ سیاسی معاملات اور انقلابی تنظیموں کی تشکیل جیسے امور میں بھی جاری رہی۔ خاص طور پر "حرکتِ اسلامی عراق" کی تشکیل میں آپ نے فعال کردار ادا کیا' جس نے بعد میں "حزب الدعوة الاسلامية" کا نام اختیار کیا۔ اس وقت تک عراق کے انقلابی شیعہ با قاعدہ منظّم نہ ہوئے تھے اور ان کی کوئی جانی پہچانی سیاسی تنظیم نہیں تھی۔

۱۹۶۶ء میں آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ شیعیانِ لبنان کی ایک کثیر تعداد کے اصرار اور اپنے والدِ گرامی کے حکم پر (جو خود شیعیانِ لبنان کے مرجع تھے) مستقل قیام کی نیت سے لبنان تشریف لے گئے۔ اُس وقت سے اب تک آپ لبنان میں قرآنی تعلیمات کی بنیادوں پر کئی جواں نسلوں کی تربیت کر چکے ہیں۔ سیاسی' دینی اور تعلیمی و تربیتی میدانوں میں آپ کی سرگرمیوں کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کا احاطہ اور مکمل بیان ایک مستقل کتاب ہی میں ممکن ہے۔ یہاں ہم اسی قدر کہنے پر اکتفا کریں گے کہ آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ ہمارے زمانے کے ایک انتہائی مستعد اور فعال ترین عالم ہیں' جو چار عشروں سے زیادہ مدت سے معاصر نسلوں کی ہدایت و رہنمائی کا فریضہ ادا کر رہے ہیں اور اس راستے پر بغیر کسی سستی کے مسلسل گامزن ہیں۔

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ دنیائے علم و دانش کی منتخبِ روزگار شخصیات میں ایک

خاص اور نمایاں مقام رکھنے کے باوجود عام لوگوں کی اصلاح وتہذیب اور اُن کی ہدایت و رہنمائی کی طرف سے کبھی غافل نہیں رہے اور آپ نے لوگوں میں مذہب و دیانت اور اسلامی اخلاق کی ترویج کے عمل سے کبھی بے اعتنائی نہیں برتی۔

یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ اسلام کو ایک فکر کی صورت میں انسانوں کی عقل و ذہن میں داخل کرنا چاہیے اور اسکے ساتھ ساتھ اسے احساس' جذبات اور عشق کی صورت میں انسانی قلب میں جاگزیں کرنا چاہیے اور اسلام کو انسانی فکر وشعور اور جذبات و احساسات کا حصہ بنا کر ہی لوگوں کی شخصیت اور کردار وعمل میں رچایا بسایا جاسکتا ہے۔

مذکورہ نکتے کو سامنے رکھتے ہوئے تربیت وتہذیب اور اصلاح ونصیحت کے لیے آیت اللہ فضل اللہ نے جو متنوع دستورالعمل (programme) اپنایا وہ اس قابل ہے کہ اس کا بغور جائزہ لیا جائے اور کلمۂ اسلام کی سربلندی' اسلامی تہذیب کے نفاذ اور بشر ساختہ تہذیبوں پر اسکے غلبے کے لیے کوشاں افراد اور ادارے اس پروگرام سے استفادہ کریں۔اس پروگرام کے اہم اجزا درجِ ذیل ہیں۔

☆ تفسیر قرآن کے ہفتہ وار جلسوں کا انعقاد' ان جلسوں کے بعد سوال و جواب کی باقاعدہ نشست کا اہتمام ہوتا ہے' جس کے دوران جلسے کے شرکا آیت اللہ فضل اللہ کی خدمت میں اپنے سوالات اور اعتراضات پیش کر کے ان کے جواب حاصل کرتے ہیں۔

☆ ہر شبِ جمعہ خطاب اور دعائے کمیل کی تلاوت' جس میں خواتین وحضرات کی ایک کثیر تعداد شریک ہوتی ہے۔

☆ نمازِ جمعہ کی اقتدا جس میں تیس ہزار سے زائد افراد شرکت کرتے ہیں۔

☆ خواتین کے لیے گاہ بگاہ مخصوص فکری اور علمی مجالسِ مذاکرہ کا انعقاد' جن کے دوران بعض صاحبِ نظر لبنانی خواتین خواتین کی معاشرتی' گھریلو اور دوسری مشکلات اور اسلام

میں خواتین کے حقوق کے حوالے سے اپنے اعتراضات اور سوالات اٹھاتی ہیں اور آیت اللہ فضل اللہ ان سوالات اور اعتراضات کے قرآن وسنت کی روشنی میں جواب دیتے ہیں اوران کی مشکلات کے حل کی جانب اُن کی رہنمائی کرتے ہیں۔

☆ آپ کا اہم ترین اقدام نونہالوں کی تعلیم وتربیت کے لیے اسکولوں کا قیام ہے، جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

○ آپ کے زیرِسرپرستی نو (پرائمری، سیکنڈری اور ٹیکنیکل) تعلیمی ادارے کام کررہے ہیں، جن میں تقریباً ۱۴ ہزار طلبا زیورِعلم سے آراستہ ہورہے ہیں۔

○ ان تعلیمی اداروں میں سے کچھ صرف لڑکیوں کے لیے مخصوص ہیں، جن میں سے ایک آموزش گاہِ حضرت خدیجۃ الکبریٰ علیہا السلام ہے، جس میں تقریباً دو ہزار طالبات زیرِتعلیم ہیں۔ ان طالبات کی ایک بڑی تعداد شہدا کی بچیوں اور یتیم لڑکیوں پر مشتمل ہے، جن کی اقامت کا انتظام اس مدرسے کی جدید ترین سہولتوں سے آراستہ عمارت ہی میں کیا گیا ہے۔

○ یتیم بچوں کی تعلیم وتربیت اور نگہداشت کے لیے چھ مراکز قائم ہیں، جن میں تین ہزار سے زائد یتیم بچے اور بچیاں مقیم ہیں۔ ان مراکز میں دوسرے مدارس کی مانند پرائمری سے قبل کی تعلیم بچوں اور بچیوں کو ایک ساتھ دی جاتی ہے اور اسکے بعد پرائمری سے لڑکوں اور لڑکیوں کی کلاسیں علیحدہ علیحدہ کردی جاتی ہیں۔

☆ بیروت میں ایک عظیم الشان اسلامی مرکز کا قیام، جو مسجدِ امامین الحسنینؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ کے نام سے منسوب ایک بڑے آڈیٹوریم اور تحقیقاتی مرکز پر مشتمل ہے۔

☆ لبنان میں مختلف علاقوں میں ثقافتی مراکز کا قیام۔ مثلاً بقاع میں ثقافتی مرکز امام حسن عسکریؑ اور مسجدِ اہلِ بیتؑ، جبلِ عامل میں ثقافتی مرکز امام علیؑ، جلالا میں ثقافتی مرکز امام حسینؑ طرابلس میں ثقافتی مرکز اہلِ بیتؑ اور ہرمل میں مسجدِ امام جعفر صادقؑ۔

آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ احیائے اسلام کے لیے سرگرمِ عمل اسلامی تحریکوں

کے فکری قائدین میں سے ہیں اور مشرقِ وسطیٰ میں ایران کے اسلامی انقلاب کے زبردست حامی اور مدافع کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ صہیونی ایجنٹ اب تک تین مرتبہ آپ پر قاتلانہ حملے کر چکے ہیں، دو مرتبہ یہ حملے مکمل طور پر ناکام رہے، جبکہ ایک حملے میں گولی آپ کے پاؤں پر لگی جس کا اثر اب بھی ظاہر ہے اور اس طرح آپ بھی عالمی اسلامی انقلاب کے جانبازوں کی صف میں شامل ہیں۔

آیت اللہ فضل اللہ کی تالیفات کی ایک کثیر تعداد منظر عام پر آ چکی ہے، جن میں سے چند معروف اور اہم یہ ہیں:

قرآنِ کریم سے متعلق

۱. اسلوب الدعوة فی القرآن
۲. الحوار فی القرآن
۳. من وحی القرآن (۲۵ جلدیں)
۴. من عرفان القرآن
۵. حرکة النبوة فی مواجهة الانحراف
۶. دراسات و بحوث قرآنیة

فقہ سے متعلق

۱. المسائل الفقهیة (دو جلدیں)
۲. الفتاویٰ الواضحة
۳. فقة الحیاة
۴. کتاب الجهاد
۵. کتاب النکاح
۶. القرعة والاستخارة
۷. الیمین والعهد والنذر
۸. الاجارة
۹. رسالة فی الرضاع
۱۰. فقه الشریعة
۱۱. الصید و الذباحة
۱۲. دلیل المناسک
۱۳. مناسک الحج
۱۴. الشرکة

فکرِ اسلامی سے متعلق

١ . خطوات علی طریق الاسلام
٢ . قضایا نا علی ضوء الاسلام
٣. الاسلام و منطق القوة
۴. الحركة الاسلامية هموم وقضايا
۵. من اجل الاسلام
٦ . مفاهيم اسلامية عامة (١٠ اجزاء)
٧. فی آفاق الحوارالاسلامی المسیحی
٨. دنيا الشباب
٩ . دنيا المراة
١٠ . تاملات اسلامية حول المراة
١١ . قراء ة جديدة لفقه المراة الحقوقی (دوجلدیں)
١٢ . الوحدة الاسلامية بين الواقع والمثال
١٣ . قضایااسلامية معاصرة
١۴ . اسئلة وردود من القلب
١۵ . المرجعية وحركة الواقع
١٦ . الاسلام والسميحية
١٧ . الاسلام وفلسطين
١٨ . الاسلاميون وتحليات المعاصرة
١٩ . الاسلام والمشروع الحضاری
٢٠. تحدی الممنوع
٢١ . خطاب الاسلاميين والمستقبل
٢٢. مع الحكمة فی خط الاسلام
٢٣. الندوة (١٢جلدیں)
٢۴ .الجمعة منبرو محراب
٢۵ . صلاة الجمعة الكلمة والموقف
٢٦ . من وحی عاشوراء
٢٧. حديث عاشوراء
٢٨ . احاديث عاشوراء

۲۹. علی طریق کربلاء

۳۰. تاملات فی آفاق الامام موسیٰ الکاظمؑ

۳۱. فی رحاب اهل البیتؑ (۲جلدیں)

۳۲. آفاق اسلامیة

۳۳. فی رحاب الدعاء

۳۴. للانسان والحیاة

۳۵. حوارات فی الفکروالاجتماع والسیاسة

۳۶. روی و مواقف (۳ اجزاء)

۳۷. المعالم الجدیدة للمرجعیة الشیعیة

۳۸. تاملات فی الفکر السیاسی الاسلامی

۳۹. صراع الارادات

۴۰. الهجرة والاغتراب

۴۱. ارادة القوة

۴۲. بینات

۴۳. شرح خطبه الزهراء(س)

۴۴. الفقیه والامة (تاملات فی الفکر السیاسی والمنهج الاجتهادی و الحرکی عند الامام الخمینیؒ)

۴۵. فی آفاق الروح (شرح صحیفه سجادیه. (۲جلدیں)

شعری مجموعے

۱. یا ظلال الاسلام (رباعیات)

۲. قصائد من اجل الاسلام والحیاة

۳. فی ظلال الشباب

۴. اناشید للسائرین فی طریق الله

۵. علی شاطیء الوجدان

ان کے علاوہ مختلف بین الاقوامی سیمینارز میں آپ کے علمی مقالات اور فکری نشستوں میں آپ کے بیش قیمت اظہارِ خیال بھی گراں قدر علمی سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

☆☆☆☆☆

یادداشت

ہماری مطبوعات

ہمارے ائمہؑ اور سیاسی جد و جہد	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
چھ تقریریں ولایت کے موضوع پر	آیت اللہ سید علی خامنہ ای
دنیائے جوان	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فکر و نظر	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
فقہ زندگی	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
مہدئ منتظر قیامِ عدل اور غلبۂ اسلام کی امید	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
حضرت علیؑ کی وصیت	آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
امام حسینؑ نے کیوں قیام فرمایا؟	علامہ ابراہیم امینی، محمد باقر شریعتی سبزواری
حسین ابن علیؑ کا خطاب	محمد صادق نجمی
حسین ابن علیؑ مدینہ تا کربلا	محمد صادق نجمی
کلامِ امام حسینؑ کی چند کرنیں	حجت الاسلام محسن غرویان
نہج البلاغہ اور حیاتِ اجتماعی	شیخ حسن موسیٰ صفار
نوجوانوں کے لئے جاننے کی باتیں	رضا فرہادیان
ماہِ رمضان تزکیۂ نفس اور اصلاحِ کردار کا مہینہ	مجلسِ مصنفین
اسلامی تحریک قرآن و سنت کی روشنی میں	شیخ محمد حسن صلاح الدین
بہترین عشق	جواد محدثی
عباد الرحمٰن کے اوصاف	محمد محمدی اشتہاردی
عبادت و نماز	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
توبہ کیا ہے کیسے قبول ہوتی ہے	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
اسلام اور عصرِ حاضر کی ضروریات	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جہاد	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
معنوی آزادی	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
سیرتِ نبویؐ ایک مطالعہ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
جاذبہ و دافعۂ علیؑ	استاد شہید مرتضیٰ مطہری
ائمۂ اہلِ بیتؑ فکری و سیاسی زندگی	رسول جعفریان
خاتمیت	استاد شہید مرتضیٰ مطہری (زیر طبع)

دار الثقلین

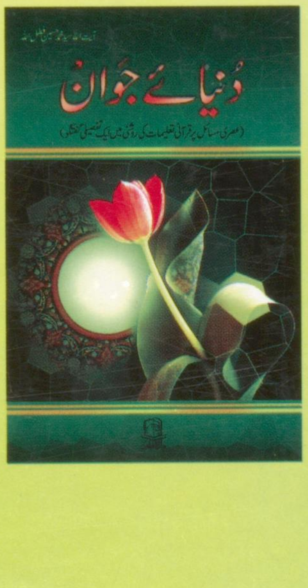
آیت اللہ سید محمد حسین فضل اللہ
دُنیائے جوان
(عصری مسائل پر قرآنی تعلیمات کی روشنی میں ایک تفصیلی گفتگو)